مشرف عالم ذوقی

ایک انجانے خوف کی ریہرسل

(افسانے)

یہ کتاب
اردو اکادمی، دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔
اس کے مشمولات سے اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

ایک انجانے خوف کی ریہرسل

(افسانے)

مشرف عالم ذوقی

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی ۹۵

نام کتاب : ایک انجانے خوف کی ریہرسل

مصنف و ناشر : مشرف عالم ذوقی

پتہ : D-304 تاج انکلیو، گیتا کالونی، دہلی - 110031

مطبع : روشن پرنٹرس، دہلی

تعداد : 400

سرورق : اظہار احمد ندیم

کمپوزنگ : محمد اسلم عبدالغفار

ARSHIA PUBLICATIONS

A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment,

Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)

Mob: (0) 9899706640, 9971775969

Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

انتساب

ثمینہ راجہ کے لیے

شاعری جھوٹ سہی، عشق فسانہ ہی سہی
زندہ رہنے کے لیے کوئی بہانہ ہی سہی

ایک انجانے خوف کی ریہرسل

سرخ حاشیے

سیاہ حاشیے

سرخ لفظ

اس پُر ہیبت حقیقت کے مقابل، جسے تمام انسانی زمانوں میں ایک یوٹوپیا کی حیثیت حاصل رہی ہوگی، ہم، کہانیوں کے موجد، جن کے نزدیک ہر بات قابلِ یقین ہے، اس بات پر یقین کرنے کے بھی پوری طرح حق دار ہیں کہ ایک بالکل دوسری قسم کے یوٹوپیا کی تخلیق میں خود کو منہمک کر دینے کا وقت ابھی ہاتھ سے نہیں گیا۔ زندگی کا ایک نیا اور ہمہ گیر یوٹوپیا، جہاں کسی کو دوسروں کی موت کے حالات کا تعین کرنے کا اختیار نہیں ہوگا، جہاں محبت سچی، اور خوشی ممکن ہوگی اور جہاں سو سال کی تنہائی کی سزا بھگتنے والی قوموں کو، آخر کار اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، اس زمین پر ایک اور موقع دیا جائے گا۔

—— **گابرئیل گارسیا مارکیز**

واپس لوٹتے ہوئے

کاش عشق زبان رکھتا/ تا کہ عاشقوں کے پردے اٹھ جاتے/ جب زبان
عشق کے راز اور انداز کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے، آسمان پکارتا ہے،
اے عشق کو چھپانے والے/ کیوں چھپاتا ہے؟ اون اور روئی میں آگ ہے/
جب تو اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اور زیادہ ظاہر ہو جاتا ہے۔

-(مثنوی مولانا روم، دفتر سوم، صفحہ 448)

تب کمپیوٹر نہیں تھا

'تم اُسے بھول گئے نا؟'
'نہیں کہہ سکتا......'
'لیکن میں یقین سے کہہ سکتی ہوں، ان پانچ مہینوں میں وہ تمہارے اندر کہیں نہیں ہے......'

رات کی تاریکی میں ترانہ کی آواز برف کی مانند سرد لگ رہی تھی......
'تمہیں ایسا یقین کیوں ہے؟'
وہ آہستہ سے ہنسی— 'کیونکہ وہ صرف ایک تصوراتی دنیا ہے— ایک پرستان— پرستان تو بچوں کا ہوتا ہے۔ مگر جب تم جیسے مرد جاتے ہو تو اپنے اندر کے تمام تر چور کے ساتھ— اندر کی تمام ناکام اور دبی خواہشات کے ساتھ۔ جسے ایک بیوی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتے

تم...... وہ تھوڑی سی سنجیدہ ہوگئی تھی۔ لیکن صرف پانچ مہینے میں اُسے بھول جانا۔ سانیال، کم سے کم تم تو دوسرے مردوں کی طرح مت بن جاؤ— '

تاریکی مجھ پر حاوی ہو چکی ہے۔ ایک ایسی تاریکی جو چپ چاپ خاموشی سے بالکنی میں آنے کے باوجود، میرے پورے وجود پر حاوی ہے۔ سب کچھ اچانک ہوا تھا نا...... سب کچھ— جیسے اچانک پوری دنیا بدل گئی۔ اچانک جیسے لہروں کی طرح بدلتے وقت کے ہاتھ میں جادو کا ڈنڈا آگیا۔ وقت نے اُس جادو کے ڈنڈے کو نچایا۔

'سنو عمر۔ اتنا تیز مت بہو۔ وہیں ٹھہر جاؤ...... نہیں پیچھے جاؤ......؟

زندگی کے جھرنے جیسے، بہتی عمر کی ناؤ کھیتا، چالیس کی پائیدان پر کھڑا شخص پھر سے جوان تھا— وقت نے جادو کا ڈنڈا پھر سے لہرایا۔ سامنے ایک بے حد حسین اپسرا کھڑی تھی......

لیکن شاید وقت یا جادو کے ڈنڈے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم وہاں، اس دنیا میں جاتے ہی رومانی ہو جاتے تھے— اُس دنیا میں جہاں بجلی کا ایک معمولی سوئچ آن کرتے ہی، کمپیوٹر اسکرین پر انٹرنیٹ کے دروازے کھل جاتے تھے......

یہاں جادو نہیں تھا—

جادو کا ڈبہ نہیں تھا—

عمر کا گھوڑا بھی نہیں — پراسرار، پریوں کے دیس میں لہراتی ہوئی ایک ندی ہوتی تھی— حسن کا بازار ہوتا تھا اور اچانک کسی کرشمہ، جادو کی طرح کسی بھی ملک، کسی بھی مذہب، کسی بھی کمیونٹی کی کوئی لڑکی اچانک آپ کے سامنے آکر پوچھ دیتی تھی— ڈو یو لائک رومانٹک چیٹ......؟

اور ایک بے حد حسین اور پراسرار پرستان کا تصور اپنی تمام تر اداؤں اور جلوہ سامانی کے ساتھ 'کیم' یعنی 'نیٹ کیمرے' پر روشن ہو جاتا— کانوں میں مائیکروفون کے تار ہوتے— پانی کی لہروں پر جادوئی آواز کے ساتھ، عمر کا بہتا دریا کہیں بہت پیچھے آگ کے انگاروں کے درمیان گم ہو جاتا......

●

تب یہ دنیا شاید اس قدر نہیں پھیلی تھی......

تب یہ دنیا شاید اس قدر نہیں سکڑی تھی......

آسمان پر چاند روشن تھا۔ تارے ٹمٹمارہے تھے...... نیلے آسمان پر دو ایک بادلوں کے ٹکڑے نظر آئے۔ مگر رم جھم چمکتے تاروں کے قافلوں نے جھومتے ہوئے بادلوں کی اس چادر کو اوڑھ لیا— پھر اس چادر کو وہیں چھوڑ، جھومتے کارواں کے ساتھ یہ تارے آگے بڑھ گئے......

تب کمپیوٹر نہیں تھا۔

انٹرنیٹ نہیں تھا۔ ایس ایم ایس نہیں تھیں...... عمر کی اپنی حدیں مقرر تھیں — اور ان حدوں سے تجاوز کرنا بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ تب جادو کا گھوڑا نہیں تھا۔ مگر تب بھی تھی محبت — شاید موجودہ وقت سے زیادہ آزاد اور پلوٹونک— جسم کی جگہ سیدھے روح میں اُتر جانے والی محبت — تب چاندنی راتیں تھیں۔ سولہ برس پیچھے لوٹوں تو ہندوستان کے اچھے خاصے چھوٹے شہر کسی گاؤں یا قصبے جیسے لگتے ہیں۔ فون نہیں، ٹیلیفون نہیں۔ موبائیل تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چھوٹے شہروں میں اپنی تمام تر دقتوں اور پریشانیوں کے باوجود بھی زندگی حسین اور پیاری لگتی تھی۔ تب محبت کی اپنی الگ شکل تھی۔ اپنی ترنگ اور اپنی لہر تھی— بارش اور خوشبو جیسے تصورات میں محبت کی گنگناتی موجوں کی طرح— اور آسمان پر دور چمکتے کسی ننھے چمکتے تارے کی طرح— مگر اس تارے کو دیکھ یا چھو لینا سب کے بس کی بات نہیں تھی—

لیکن شاید عمر کی نازک پائیدان پر ادب سے دوستی ہوتے ہی میرے لیے محبت کے معنیٰ بھی بدل گئے تھے۔ ایک سنسناتی ہوا— جو آپ کے تمام جسم کو اپنی روانی میں بہالے جائے۔ بہتے یا اڑتے ہوئے آپ یہ بالکل بھی نہیں سوچیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے— بلکہ آپ اس لمحہ کی آنچ میں اپنے تمام وجود کو ڈال دیں اور ایک ایک لمحہ کی زندگی اور فنتاسی کو محسوس کریں—

اور اچانک ترانہ کی شکل میں چھوٹے شہر میں جیسے خود کو خوش قسمت سمجھنے کا موقع مل گیا تھا— ہرنی سی ترانہ۔ اپنے وجود کی خوشبو کے ساتھ جیسے بس اسی کے لیے بنائی یا لکھی گئی ہو— چھوٹی چھوٹی دو چند ملاقاتوں کے بعد ہی ہوا میں اڑنے کا احساس— تب چھوٹے شہر کے لوگ شاید اتنے مہذب نہیں ہوئے تھے۔

یا اتنے زیادہ کمرشیل......

باتیں اڑنے لگی تھی۔ پھیلنے لگی تھیں۔ کالج سے گھر تک قصے کہانیوں کا بازار گرم ہونے لگا تھا۔ سانیال۔ ترانہ—

ترانہ— سانیال......

لیکن شاید ہم دونوں میں ہی بغاوت بھری تھی۔ یا ہم دونوں کے گھر والے اس بغاوت سے واقف تھے۔ اس دن ترانہ ملی تو جیسے آہستہ آہستہ اپنی روانی میں بڑھتا پیار ایک نئی خوبصورت سی کہانی لکھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی تنگ ندی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے۔ دور ایک ریہڑی والا پیاز اور آلو فروخت کر رہا تھا۔ دو چھوٹے گندے بچے ہماری طرف دیکھتے ہوئے ہنس رہے تھے......

ترانہ نے میرے ہاتھوں کو چھوا— 'تم گھر کیوں نہیں آئے۔ کیوں ڈرتے ہو......؟'

'نہیں۔ ڈرتا نہیں......'

'جھوٹ مت بولو۔ ڈر گئے ہو تم۔ کیونکہ شاید ہمارے قصے پھیلنے لگے ہیں۔ معلوم...... اس نے میرے ہاتھوں پر اپنی گرفت سخت کر لی— میں ساری ساری راتیں جاگتی ہوں۔ گھر کھڑکی، دروازے سب غائب ہو جاتے ہیں— جیسے کوئی ہوا محل ہو— میرا پورا چہرہ صرف ایک مسکراہٹ میں بدل جاتا ہے— اور تم ایک خوبصورت رات کے تصور میں ڈھل جاتے ہو...... میں تمہارا ہاتھ تھامتی ہوں۔ بوسہ لیتی ہوں، اڑتی ہوں۔ اور...... ہوش کہاں رہتا ہے مجھے۔ گھر کے آنگن میں برسوں پرانا ایک کنواں ہے— اس کنویں پر خاموش سی آکر بیٹھ جاتی ہوں۔ سب سوئے رہتے ہیں۔ اور میں آسمان کے چاند کو دیکھتی رہتی ہوں۔ چاند چھپ جاتا ہے...... اور تم...... آجاتے ہو...... یہ کیا ہے۔ سانیال...... کیا ہے...... یہ؟

'سوچنے دو......'

بتاؤ نا کیا ہے یہ......

ریہڑی والا پیاز لو، آلو لو کی صدائیں لگا رہا ہے۔ دونوں گندے بچے ابھی بھی ہماری طرف دیکھ رہے ہیں...... ترانہ کے ہاتھ میرے ہاتھوں پر سخت ہو گئے ہیں— بتاؤ نا، کیا ہے یہ......'

'بتاؤں......؟'

'ہاں...... بولو نا......'

'تمہارے اندر 'ڈوپامائن' اور 'نورے پنیکرین' کیمیکل کی سطح بڑھ گئی ہے—'

'وہاٹ'...... ترانہ چونکتی ہے— یہ کیا ہے...... ڈوپامائن؟'

'کیمیکل ہے...... جو دماغ میں خاموشی سے ایک نہیں ختم ہونے والی خوشی کی ترنگیں رکھ دیتا ہے۔'

’ترانہ مسکرائی— یعنی پیار۔ اور وہ۔ نورے......؟‘

’نورے پنیکرین......‘

’ہاں وہی......تم بھی نا سانیال، یہ کیا ہے؟‘

’یہ بھی ایک کیمیکل ہے جو دل میں ہلچل اور جوش پیدا کرتا ہے......‘

ترانہ چونکی— ’تو تمہارا پیار بس اتنا ہے۔ ڈوپامائن اور نورے پینکرین کی سطح تک— اتنا ہی ہے پیار......ادب سے کیمسٹری کی دنیا کی طرف چلے جانا— اور کل جو میرے ساتھ ہوا۔ پتہ ہے— آدھی رات— گھر کا دروازہ کھول کر خاموشی سے گلی میں تمہاری تلاش میں نکل پڑی۔ پھر اچانک احساس ہوا۔ ارے، یہ میں کیا کر رہی ہوں۔ جاگی تو یکایک ڈر کا احساس ہوا۔ ساری گلی سنسان تھی۔ لوگ اس وقت مجھے دیکھتے تو پتہ نہیں کیا کہتے مجھے۔‘

’کچھ نہیں۔ یہ سیروٹونن کی مسلسل گرتی ہوئی سطح کی وجہ سے ہوا......‘

’مطلب......؟‘

’محبت میں پاگل پن کی حد تک۔ خود کو فنا کر دینے کا احساس......‘

’ماروں گی تم کو......‘ ترانہ زور سے کھلکھلائی تو ہمیں دیکھنے والے وہ دونوں بچے بھی کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

بالکنی سے رات روشن تھی۔ تارے آنکھ مچولی کا کھیل‘ کھیل رہے تھے— سولہ برس پہلے کا احساس ایک دم بارش کی طرح برس جانا چاہتا تھا۔ تب دل و دماغ پر بس ایک ہی نام کا بسیرا تھا......ترانہ۔ اور اس نام کے ساتھ ہی جیسے خوشبوؤں کے در کھل جاتے۔ ہوا سرسراتی ہوئی جیسے سارے بدن میں ایک طوفان اٹھا دیتی— اور تنہائی کے کسی پراسرار لمحے ترانہ کا ایک جملہ میرے ہوش و حواس پر حاوی ہو جاتا۔

’میں بس اتنا جانتی ہوں، جسے پیار کروں، وہ مجھے ملنا چاہئے۔‘

اس دن دوپہر کے تین بج رہے ہوں گے۔ گھر کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی معلوم ہوا۔ ترانہ اسپتال میں ہے...... بھابھی نے بتاتے ہوئے ایک لمحہ کو میرا چہرہ دیکھا۔ چوکی پر خاموشی سے بیٹھے پاپا نے بھی میری طرف نظریں کر لیں۔ میں نے کتاب وہیں میز پر رکھ دی......

’میں جا رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے رات میں بھی نہ آؤں......‘

اتنا کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ میرے لیے کہنا مشکل تھا کہ ترانہ کے اندر

ڈوپامائن' اور 'نورے پنیکرین' کی سطح کتنی بڑھ گئی تھی یا پھر 'سیروٹونن' کی سطح کتنی گھٹ گئی تھی — جو اچانک پاگل پن کی حدوں کو چھوتے ہوئے وہ اسپتال میں بھرتی ہوگئی تھی — لیکن شاید سب کچھ معمول کے مطابق نہیں تھا۔ کیونکہ گذشتہ ہفتہ ہی اس نے میرے وجود کے ریشے ریشے میں گھلتے ہوئے اپنی جنگ کا اعلان کردیا تھا......

'میری سانسیں سیوئیوں کی طرح ٹوٹتی بکھرتی جارہی ہیں۔ کیونکہ یہ ہر وقت بس تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں — تم کیوں چلے جاتے ہو سانیال — کیوں نہیں ایسے رہتے، جیسے میرے کمرے میں میرا ٹھہرا ہوا وقت رہتا ہے۔ اس لمحہ جب تمہیں سوچتے ہوئے تمہارے وجود میں گھل جانے کی خواہش ہوتی ہے......'

اس کی ہتھیلیوں میں انگارے جمع تھے...... 'کبھی اچانک ایک دھندسی کمرے میں بھر جاتی ہے۔ پھر دنیا بھر کی باتیں میرے کمرے میں گونجنے لگتی ہیں۔ تم یکایک دھند میں کھو جاتے ہو تو لگتا ہے، یہ سانسوں کی سیوئیاں بھی ٹوٹ سی گئی ہوں...... کہیں مت جاؤ پلیز۔ میرے ساتھ رہو۔ اس سے پہلے۔ سانیال، یہ سانسوں کی سیوئیاں بکھر جائیں......'

قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے...... وہ جنرل وارڈ میں تھی۔ جہاں دو چار مریض اور بھی تھے۔ چھوٹے شہروں کی اپنی تاریخ اور تہذیب ہوتی ہے۔ اسے گھیرے ہوئے اس کے محلے کی کئی عورتیں جمع تھیں۔ مجھے دیکھ کر جو اجنبی سی خوشی اس کے چہرے پر لہلہائی، وہ الفاظ میں بیان نہیں کی جاسکتی۔ دوسرے ہی لمحہ جنرل وارڈ میں بہت سے لوگوں کی موجودگی کے باوجود وہ میری بانہوں میں تھی...... کمزور بیماری...... وہ مجھے بتا رہی تھی...... وہ بول نہیں پارہی ہے...... آواز چھن گئی ہے۔ میں نے اسے زور سے سینے سے بھینچ لیا — ترانہ رو رہی تھی...... 'میں اسے سینے سے بھینچے ہوئے محبت میں ڈوبی انگلیوں کو اس کی آنکھوں کے پاس لہراتا کہہ رہا تھا'

''میں ہوں نا...... تمہارا سانیال۔ تمہاری آواز۔ تم کہتی تھی نا، ساری دنیا میں کوئی بھی تم سے اچھا نہیں بولتا۔ کسی کی بھی آواز تم سے زیادہ خوبصورت اور سحر انگیز نہیں ہوسکتی۔ ابھی اس لمحہ صرف تمہیں سننا ہے مجھ کو۔ کیونکہ میں اپنی ترانہ کے لیے روح، جسم اور نغمہ سب بن گیا ہوں...... تمہاری آواز...... اس آواز کا سنگیت تمہارے ہونٹوں پر رکھوں گا ترانہ اور تمہارے ہونٹ دنیا کی سب سے حسین لڑکی کے ہونٹ بن جائیں گے...... اور جب تم میرے سُر میں سُر ملا کر جواب دو گی تو یہ کائنات کی سب سے سُریلی آواز ہوگی...... مگر ترانہ...... آج میں تمہاری آواز ہوں۔ اپنی آواز

کو بھول کر میری آواز کا لمس محسوس کرو......''

ترانہ سمٹ گئی...... میری پشت پر اس کی ہتھیلیاں سخت ہو گئیں۔ میری شرٹ گیلی ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ اٹھایا تو وہ مسکرا رہی تھی۔ ایسی مسکراہٹ— جسے شاید دنیا کی چند عظیم شاہکار مصوری کے نمونے میں ہی تلاش کیا جا سکے۔

اس رات میں جنرل وارڈ میں اس کے پاس والی چوکی پر ہی سویا۔ یہ سب جانتے ہوئے کہ چھوٹے شہر کی سنسنی دیتی ہوائیں ہم دونوں کی کہانی کی خوشبو کو لیتی ہوئی اڑ گئی ہیں۔

اب یہ کہانیاں اڑیں گی۔ پھیلیں گی...... مگر شاید آگے کی صورت حال پر غور و فکر کرتے ہوئے میں مطمئن تھا۔ یا پھر یوں کہنا چاہئے کہ اب مجھے کسی کی بھی پروا نہیں تھی—

●

تب نیٹ نہیں تھا، موبائیل بھی نہیں تھے...... چھوٹی چھوٹی آسانیاں بھی ہم سے بہت دور تھیں۔ لیکن محبت کا کرشمہ اور جادو اپنی پوری شدت کے ساتھ تب بھی موجود تھا، اور شاید آج سے بھی زیادہ تھا— باہر بالکنی میں دودھیا چاندنی کی روشنی میں ستاروں کا رقص جاری ہے۔ سولہ برس پہلے کے احساس زندہ ہو گئے ہیں...... میرے پورے وجود پر حاوی—

●

لیکن جیسے کل تک ایک کہانی شروع ہوتی تھی— دادی اماں، نانی اماں کے منہ سے نکلی کہانیاں— چاندنی راتوں میں— آسمانی چادر کے نیچے بچھی ہوئی پلنگوں پر— بچوں کی حیران آنکھوں کی اپنی ایک طلسمی دنیا بن جاتی...... ایک تھا راجہ...... ایک تھی رانی...... ایک تھا راکشس...... ایک تھا جادوگر...... سولہ برس بعد جدید ترین دنیا کی یہ کہانی شاید ایسے شروع ہوگی —ایک تھا کمپیوٹر۔ نیٹ پر ایک اپسرا لہرائی۔ مگر کوئی جادو نہیں۔ اپسرا نے پانی میں تیرتے ہوئے پوچھا...... ڈو یو لائک رومانٹک چیٹ؟ کی بورڈ پر تیرتے ہاتھوں نے چپکے سے ٹائپ کیا— اوہ بس......

اور اس اکیسویں صدی کی آغوش میں محبت کی ایک نئی کہانی کی شروعات ہو گئی تھی—

تم سے کیا رشتہ ہے اس کا؟

ترانہ زندگی میں آ گئی۔ ہم مہانگر کی بھیڑ کا حصہ بن گئے۔ پھر ایک چھوٹا سا بیٹا بھی

ہو گیا۔ مہانگر کی بھیڑ کا حصہ بنتے ہوئے بھی اندر کا ادیب مرا یا سویا نہیں، کیونکہ ترانہ نے اس ادیب کو کسی بھی لمحے سونے نہیں دیا۔ اس کی محبت لمحاتی یا چھلاوہ نہیں تھی۔ وہ شادی کے بعد بھی سانیال کو ایک محبوب کے طور پر ہی دیکھتی رہی۔ ادب سے سیریل کی دنیا تک جیسے ترانہ نے اپنا سب کچھ مجھ پر نچھاور کر دیا تھا۔ سولہ برسوں میں اگر کچھ تبدیلی آئی تھی تو صرف ایک جسمانی تبدیلی کہ اپنے ہی جسم سے اپنے پیار کا ایک حصہ نکالتے یا بڑا ہوتے دیکھنے کا احساس اُسے ایک پختہ عورت میں تبدیل کر گیا تھا۔ مگر اپنی تمام تر محسوسات کی سطح پر وہ صرف ترانہ رہی۔ وہی سولہ برس پہلے کی ترانہ...... مگر ایک دن—

گھر میں کمپیوٹر آ گیا۔ نیٹ لگ گیا...... اور ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔ کیا بہت پیار کرنے کے باوجود آپ میں کہیں کوئی ایک دبی ہوئی خواہش باقی رہ جاتی ہے— بہت پیار کرنے والے بیٹے اور بہت زیادہ چاہنے والی بیوی کے باوجود کیا نیٹ پر اپنی محبتوں کی دنیا آباد کرنے والا شخص کہیں تقسیم نہیں ہوتا ہے؟ نیٹ کی دنیا نوجوانوں، ادھیڑ اور بچوں کے لیے معصوم اور متجسس ذہن میں، سیکس دیکھنے والی ایک دنیا تھی— آرکٹ سے لے کر فیس بک، لو ہیپنس (Love Happens) ...... ڈریم کمس ٹو ڈاٹ کام تک...... فرضی ناموں کا سہارا لینے والی لڑکیوں اور لڑکوں کا ایک بڑا ریکیٹ پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔ بچوں سے بوڑھوں تک کے لیے تجسس کا ایک دلفریب سامان— کہیں کوئی جرم کا احساس بھی تھا میرے اندر— ترانہ کے رہتے ہوئے یہ دنیائیں کیوں آباد ہو جاتی ہیں؟ یعنی ہم کسی اجنبی لڑکی سے دوستی کرنا ہی کیوں چاہتے ہیں۔ وہ بھی صرف ایک نہیں...... ہزاروں ملک، کمیونٹی، مذہب...... نیٹ کی ایک پھیلی ہوئی دنیا— اس جادو نگریا میں سیراب ہونے کا احساس کیا حقیقت میں ایک جرم ہے؟ کبھی لگتا، سب کرتے ہیں...... پھر لگتا گھر، اپنوں کی بے پناہ محبت کے باوجود نئی تکنالوجی نے یکا یک، نہ ختم ہونے والے پیار کا ایک سرچشمہ اندر تک گھول دیا ہے— آپ محض گھر کے پیار سے سیراب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بہت سا پیار چاہئے آپ کو...... کیونکہ خون کے اندر تک شامل ہوس کی آگ کل کی تہذیب تک تو خاموش رہی، لیکن آہستہ آہستہ نئی تکنالوجی کے آتے ہی دھماکہ خیز اور پر تشدد ہو گئی...... لیکن شاید اس دنیا میں بھی بد صورت چہروں کے علاوہ کچھ عام اور بیحد اچھے چہرے بھی ہیں۔ برائیوں کے علاوہ بہت کچھ اچھائیاں بھی ہیں— سیکس کے علاوہ ایک دوسرے کو جاننے کی چاہت بھی ہے۔ اور اچانک ایک دن......

نیٹ اُپن کرتے ہی یاہو اسکرین پر ایک میسیج ملا تھا—

معزز قارئین! اور یہیں سے اس کہانی کی شروعات ہوگئی۔ میسیج میں لکھا تھا— میرا نام مہک ہے۔ مہک احمد۔ لاہور کی ہوں۔ عمر 23 سال، پانچ سال کی تھی، ماں گذر گئی۔ چھوٹی عمر سے ہی دو چیزوں کی عادت پڑگئی۔ ادب پڑھنے کی اور ٹیلی پیتھی— تمہاری ایک کہانی پڑھی۔ لگا یہ کہانی تو میری ہی ہے۔ پھر مہینہ لگ گیا۔ تمہارا میل آئی ڈی تلاش کرنے میں— زیادہ وقت نہیں ہے میرے پاس کچھ بھی کہنے کے لیے۔ شاید یہ پورا نظام اب اڑنے، تیز اڑنے کو مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ پیار کرنے لگی ہوں تم سے— بغیر جانے، بغیر سمجھے۔ کیونکہ تمہاری کہانی کا لمس اندر تک محسوس کیا ہے میں نے۔ تمہاری عمر اگر 80 سال کی ہوئی تب بھی پیار کرتی تم سے۔ میرا میل مل جائے تو فوراً جواب دینا، اور ہاں— یاہو میسینجر میں تمہیں ایڈ کر رہی ہوں۔ ہو سکے تو شام میں آنا۔ ۶ بجے۔ پاکستان اور ہندستان کے وقت میں آدھے گھنٹے کا فرق ہے۔ آؤ گے نا؟ تمہاری مہک۔

پتہ نہیں، اس میسیج کو کتنی بار پڑھا۔ پڑھتا گیا، ادب اور سیریل کی اس دنیا میں اس سے پہلے کتنی ہی چٹھیاں آئی تھیں میرے پاس۔ کتنی ہی لڑکیاں ٹکرائی تھیں۔ مگر یہ ای میل جیسے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ جیسے ہوا میں اڑ رہا تھا۔ جیسے اندر، خون کا دوران بڑھ گیا تھا...... تمہاری عمر اگر ۸۰ سال بھی ہوتی' نظریں بار بار اس کے لکھے جملوں پر دوڑ رہی تھی۔ میری عمر ۲۳ سال ہے...... اندر کوئی تشنہ خواہشات والا شخص تھا کیا؟ یا چالیس کی دہلیز پر کھڑا ایک ادھیڑ جسے اس بات سے سکون ملا ہو کہ کوئی ۲۲۔۲۳ سال کی لڑکی بھی اس سے پیار کر سکتی ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کون سا لمحہ تھا...... 'یورس سانیال' لکھنے تک میں اپنا ای میل اسے سینٹ کر چکا تھا۔

اور اسی شام وہ پہلی بار یاہو میسینجر پر آئی اور جیسے حقیقت میں پرستان جیسی کسی نئی دنیا کے دروازے میرے لیے کھلتے چلے گئے— پھر تھوڑے سے دن گزر گئے۔

●

جب آپ پیار کرتے ہیں تو پھر آپ کو بتانا نہیں پڑتا۔ مشک کی طرح اس کی خوشبو آپ کے پورے وجود سے پتہ چل جاتی ہے۔ کئی بار ترانہ کے سامنے آتے ہوئے، یا اسے بازوؤں میں لیتے ہوئے چور سا بھی احساس ہوا۔ مگر یہ بات ایک مرد کے طور پر پوری ایمانداری اور سچائی کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ترانہ کے ساتھ محبت کے کسی بھی لمحے میں مہک کہیں بھی موجود نہیں تھی۔ تو کیا وہ ایک لمحاتی کشش سے زیادہ نہیں تھی اور ترانہ مکمل طور پر میرے وجود پر حاوی— یا یہ ترانہ کا پیار تھا

کہ مہک میری زندگی میں داخل تو ہونا چاہتی تھی— مگر ہو نہیں پا رہی تھی یا یہ کہ ایک خاندان اور اس کی اخلاقیات سے بندھے ہونا بھی میری مجبوری تھی؟ یا پھر یہ کہ نیٹ کی اس چکاچوند دنیا میں ہم مکمل وجود کے ساتھ کہاں ملتے ہیں۔ شاید یہ بات مجھے کسی حد تک مطمئن کر رہی تھی— مگر سرحد پار ہی سہی، مہک کا جسم موجود تھا اور میں نیٹ کے کیمرے میں اس کے ہونے کی موجودگی کو پڑھ چکا تھا— کیا یہ محبت تھی۔ کیا ترانہ کی محبت میں کہیں کوئی کمی آئی تھی، جس نے اچانک مجھے مہک کی طرف موڑ دیا تھا۔ یا پھر ایک چالیس پار کے مرد کی مردانگی کو ملنے والی تھوڑی سی راحت تھی— ایک کم عمر کی لڑکی کا ساتھ پا کر— خاص کر ایک ایسی لڑکی کا، جو نہ صرف اس سے پیار کرنے لگی تھی، بلکہ اسے حقیقتاً پانا بھی چاہتی تھی......

شاید ترانہ سے بہت دن تک یہ سب کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کیونکہ جنگل میں آئی آندھی کی طرح ایک دن وہ اس سچ کو جان گئی...... وہ چپ تھی......

'کیا تم بھی اسے پیار کرتے ہو؟' ترانہ کے لفظ برف کی مانند سرد تھے۔

'نہیں جانتا......'

'شاید کرتے ہو......' اس نے لمبی سانس کھینچی...... مگر دوسرے ہی لمحہ اس کی آنکھوں میں برسوں کا پیار تھا— وہی دیوانگی اور جنون— ایک بار پھر اس نے مجھے میرے گلٹ کی کینچلی' میں جانے سے روک دیا تھا۔

جاتے ہوئے وہ صرف اتنا کہہ پائی— 'کوئی لڑکا اگر میری زندگی میں آ جاتا تو تمہیں کیسا لگتا—؟'

'سانیال'— اپنی ہی اگنی پریکشا سے گزرتے ہوئے میں خود سے بولا...... 'سانیال۔ کیا کرو گے— آگے کیا کرو گے سانیال...... وقت تمہیں بہا لے جانا چاہتا ہے اور یہ، تمہارے اندر کوئی مضبوط سا احساس ہے— جو تمہیں روک رہا ہے۔

شام میں نیٹ آن کرتے ہی مہک احمد آن لائن مل گئی۔ اے او اے— آن لائن ہوتے ہی سب سے پہلے اے او اے یعنی السلام علیکم لکھتی تھی۔ پھر الفاظ کا دریا نئے یوٹوپیا کے دروازے کھول دیتا۔ اور اس وقت...... شاید میں کسی پرستان میں تھا۔ مہک کے لفظ خوشبو بن گئے تھے—

چیٹ روم سے

اس نے پوچھا— اس نے بہت کچھ پوچھا۔ اس نے پوچھا کہ پرندے اور خواب میں بہتر کون ہے۔ جواب تھا...... پرندے۔ کیونکہ پرندے سانس بھی لیتے ہیں اور بارش یا ساون کے موسم میں محبت کا ترانہ بھی گاتے ہیں— خواب تو ہرجائی ہوتے ہیں— آتے ہیں اور گم ہو جاتے ہیں۔

اس نے پوچھا— مور، تتلی اور بارش میں تمہیں کیا پسند ہے؟

اس نے پوچھا...... 'آسمان میں چمکنے والا، اس کی اپنی پسند کا ایک تارا، چودھویں کے چاند سے بھی بہتر کیوں نظر آتا ہے؟'

اس نے پوچھا— تم گلاب کیوں نہیں ہو، جسے میں توڑ کر اپنے سینے کے پاس لگا لیتی۔ تم میری دھڑکنیں میری سانس میں خوشبو کی طرح سما جاتے......

'تم تتلی کیوں نہیں ہو؟ جسے گلاب کی کیاریوں کے درمیان، مدہوش سی گھومتی ہوئی میں، پکڑنے کی کوشش میں کسی کانٹے سے اپنے ہاتھ زخمی کر لیتی...... اور رسنے والی خون کی ہر بوند میں پاگل کر دینے والی حسرت کے ساتھ محبت لکھ دیتی۔

اس نے پوچھا...... بارش میں دعا جیسی پھیلی ہتھیلی پر گرنے والی پہلی بوند کیوں نہیں ہو تم؟ جسے چوم کر اپنی پیشانی سے لگا لیتی میں...... اور پھر— نہ جینے کے خواب کے ساتھ— اسی ایک بارش کے قطرے میں تمہارے احساس کو لے کر گم ہو جاتی میں......

اس نے پوچھا...... تم سے پہلے یہ دنیا اتنی خوبصورت کیوں نہیں تھی۔ یا مجھے نہیں لگتی تھی؟

اس نے پوچھا...... ایک لمحے میں ہزاروں لمحے کیوں نہیں ہوتے؟ اور ہزاروں ہزار لمحے، تمہارے ساتھ کے— تمہارے ساتھ ٹھہر جانے والے—

اس نے پوچھا...... تمہارے ساتھ کی موت تو زندگی سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگی نا— ؟ ہے نا...... آؤ...... میرا کانپتا ہوا ہاتھ اپنی ہتھیلیوں میں بھر کر آنکھیں موند لو...... ہمیشہ کے لیے— تمہارے ساتھ کا احساس اور میرا— زندگی کے سب سے خوبصورت نشے میں، جھومتا ہوا بدن— اور چمکتی گاتی آنکھیں...... یہ آنکھیں ایک ویران جزیرے میں کھلیں— جہاں دور تک تمہارے علاوہ کوئی نہ ہو......

اور پھر اس نے پوچھا— سنو! اتنا پہلے کیوں پیدا ہو گئے— ؟ مجھ سے کافی پہلے— ؟ یہ کیسا انتقام ہے تمہارا— ؟ چلو، پیدا ہو گئے...... تو میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟ میرے خواب کیوں نہیں دیکھے؟ میری آہٹ کیوں نہیں محسوس کی؟ اس لیے کہ زمین کے ذرّے ذرّے میں، آگے کے بھی کئی شاندار برسوں تک میں کہیں نہیں تھی؟ مگر— میری خوشبو تو تھی جان...... میرا احساس تو تھا۔ میری دھوپ...... میرا سایہ تو تھا...... بس تم ہی محسوس نہیں کر پائے......'

اس نے پوچھا...... تم نے شادی کیوں کر لی مجھ سے پہلے؟ میرا انتظار کیوں نہیں کیا؟

اس نے پوچھا...... تمہیں کون کون مجھ سے زیادہ جانتا ہے؟ لیکن میں چاہتی ہوں تمہیں کوئی بھی مجھ سے زیادہ نہ جانے— تمہارے اندر، پھول، خوشبو اور خواب سے زیادہ میری مہک ہو— بیوی، چاند اور سورج سے زیادہ میں تمہیں دیکھوں— سرسراتی ہوا سے زیادہ میں تمہیں چھوؤں...... میں تمہارے اندر کسی موسلا دھار بارش سی اُتر کر بس برستی رہوں۔ تاعمر......'

اور اس نے کہا...... ہماری زندگی کی پالکی کسی ویران جزیرے میں پھولوں کی سیج پر رکھی ہو۔ مرا سر تمہارے شانے پر ہو...... اور تمہاری بانہیں نازک شاخوں کی طرح میرے بدن پر پھیل جائیں...... اور پھر اس نے پوچھا— سچ کہنا...... میرے سوا اس وقت کوئی اور تو تمہارے اندر سانس نہیں لے رہا ہے— ہے نا......؟

اس نے ٹھہر کر پوچھا...... تمہاری بیوی؟

●

گہرے سناٹے اور پراسرار اُداسی کی اپنی ایک الگ شاعری ہوتی ہے۔ ہوا کی اپنی موسیقی— خوشبو کے اپنے سرتال— اور محبت کے اپنے راگ ہوتے ہیں۔ ممکن تھا یہ کہانی جنم ہی نہیں لیتی۔ وہ بھی میرے یعنی سیلان جیسے شخص کے لیے جس کی زندگی کے لیے ٹھہرے ہوئے پانی یا سمندر کی، خاموش لہروں کی مثال ہی دی جا سکتی ہے۔ لیکن معاف کیجئے گا، اس کہانی کے شروع ہونے کا وقت سنگین ہے۔ اور اس کہانی کے لیے آج کے سنگین وقت اور وقت سے جڑے انسانی حقوق کو گواہ بنانا ضروری— اور اس سے بھی ضروری یہ— کہ محبت کی رواں لہروں پر تیرتے محبوب کا یہ سوچنا...... کہ ہم پرندے یا جانور کیوں نہیں— اور انسانی حقوق کا آنکھیں تریر کر یہ دیکھنا کہ یہ مردانہ سماج تو ہمیشہ سے حقوق نسواں کا استحصال کرتا رہا ہے— لیکن معاف کیجئے گا یہاں کسی عورت کے حقوق کا استحصال نہیں ہوا ہے— بلکہ خاموشی سے چالیس پار کے ایک شوہر کی

زندگی میں آہستہ سے ایک اپسرا آ جاتی ہے — وہ اپسرا پوچھتی ہے...... میرا حق تو صرف محبت ہے...... تو یہ حق مجھے کیوں نہیں دیتے تم...... اور اس سے بھی زیادہ یہ جاننا ضروری ہے کہ وہ عورت کوئی بیوی نہیں تھی — ایک 22 سال کی دوشیزہ تھی، جس کی آنکھیں میرے یعنی سیلان کے لیے ہر لمحہ بارش، خواب اور اندر دھنش بن جاتے تھے۔

اس نے ٹھہر کر پوچھا...... مجھے میرا حق لاؤ۔

جواب میں کہا گیا...... یہ حق کسی اور کا ہے۔

'نہیں؟'

'حق دوسرے کا ہوتا تو تم یہاں نہیں ہوتے۔ بولو، کیوں ہو یہاں تم۔ اس کے پاس کیوں نہیں ہو، جس کے پاس تمہیں ہونا چاہیے —'

شاید وہ کھلکھلائی تھی...... لیکن وہ اب بھی پوچھ رہی تھی...... اور اس نے پوچھا...... 'میرا حق مجھے دیتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو۔ محبت کا یہ حق کھو چکے ہوتے تو کیا میں یہاں ہوتی — تمہارے پاس — تمہاری سانسوں کے قریب...... تمہاری جنبش، تمہاری بیتابیوں میں — تمہاری حیرانیوں میں...... اور تمہارے ہاتھوں کی انگلیوں میں...... جو کمپیوٹر پر ٹائپ کرتے ہوئے حرف سے محبت اور لفظ سے شدت بن جاتے ہیں...... آنکھوں سے خواب اور ہونٹوں سے نغمہ بن جاتے ہیں۔'

اور پھر اس نے کہا۔ سنو سیلان...... میں اڑتی ہوں۔ تیرتی ہوں۔ شبنم کے دھاگے سے لہروں کے جال بنتی ہوں۔ وقت چھوٹے چھوٹے رنگین پروں والی تتلیوں کی طرح اڑتا ہے — میرے آس پاس۔ ان تتلیوں کو تمہارا احساس سمجھ کر اپنی مٹھیوں میں جکڑ لیتی ہوں۔ سارے کا سارا دن میرے جسم پر 'ڈینے' ہوتے ہیں۔ ست رنگے آسمان میں اڑنے کے لیے اور ساری رات...... میں تتلیوں میں اڑتے وقت کو تمہارے احساس کے ساتھ — ہرے ربن سے اپنے جوڑے میں بند کر لیتی ہوں......

اور پھر اس نے پوچھا...... 'تمہارے بیٹے کو پتہ ہے کہ تمہاری زندگی میں اس کی ماں کے علاوہ بھی کوئی آ گیا ہے؟'

یہ وہی وقت تھا، جب وینس کا دل دھڑکا تھا — اور سیاروں کے جھرمٹ میں نویں سیارے کے روپ میں جانے گئے پلوٹو کو دیس نکالا دیا گیا تھا۔

•

میں نے خاموشی سے نیٹ بند کر دیا۔ کچھ دیر تک خاموشی سے کمپیوٹر کے خالی اسکرین کو دیکھتا رہا..... حرف غائب تھے۔ نہیں۔ حرف چمک رہے تھے..... اور ان حروف کے میل سے آہستہ آہستہ سپنوں کی وادی سے آئی کسی دوشیزہ کا چہرہ بن رہا تھا — مہک احمد..... آنکھیں جیسے سیلان کی آنکھوں کے جزیرے میں گم..... پھول کی پنکھڑیوں سے ہونٹوں پر کے سارے لفظ جیسے بس صرف اسی کے لیے تھے..... جسم میں کپکپی تھی۔ میں اٹھا۔ بازو والا دروازہ کھولا اور بالکنی سے جھانکتے نیلگوں آسمان میں، مہک احمد کے ٹائپ کئے الفاظ کو اندر تک محسوس کرنے لگا — وہ جیسے بالکل سامنے تھی اور پوچھ رہی تھی — کتنا پیار کرتے ہو مجھے.....؟

جیسے تارے ٹوٹے۔ جیسے دھماکہ ہوا۔ جیسے بدن میں لرزش ہوئی.....

'کیم' پر ٹائپ کرتے دنیا کے سب سے حسین ہاتھوں میں تھرتھراہٹ تھی اور آنکھیں پاکیزہ اور شرارتی، دونوں طرح کی مسکراہٹ لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی.....

'بولتے کیوں نہیں۔ کتنا پیار کرتے ہو مجھے.....'

'نہیں کرتا.....' میں نے آہستہ سے دو لفظ ٹائپ کیے۔ وہ موسلا دھار بارش کی طرح برس گئی..... 'کرتے ہو' مگر ڈرتے بھی ہو..... اچھا، ترانہ کتنا پیار کرتی ہے تمہیں.....؟'

'بہت۔'

'مجھ سے زیادہ۔'

'ہاں۔'

'نہیں — مجھ سے زیادہ نہیں کر سکتی.....' وہ مطمئن تھی..... مجھ سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا۔ خود تمہارے جسم میں دھڑکنے والا دل بھی نہیں..... نگاہوں سے محبت کا ترانہ چھیڑنے والی آنکھیں بھی نہیں..... اور — میرا نام لینے والے تمہارے ہونٹ بھی تمہیں اتنا پیار نہیں کر سکتے جتنا میں کرتی ہوں.....

مہک رک گئی ہے — 'کیم' پر میرے اندر چل رہی 'یہ سونامی' یا طوفان کو دیکھا جا سکتا ہے۔ آنکھوں میں ایک لمحہ کو ہزاروں پرچھائیاں آ کر رخصت ہو گئیں..... دوبارہ اس کے ہاتھ ٹائپ پر ہیں۔ میرا دل انجانے سوالوں کے سیلاب سے دھڑک اٹھا ہے.....

اس نے پوچھا..... اچھا سنو..... کتنا چھوا ہے ترانہ نے تم کو..... میری بھی خواہش ہوتی

ہے۔ ساون بن جانے کی۔ بارش بن جانے کی...... ترانہ کی انگلیاں تمہارے بدن پر کیسے مچلتی ہیں......؟ بہت آہستہ...... بہت خاموشی سے— پیڑ کے سبز پتّے پر گرنے والی اوس کی بوندوں کی طرح— کتنا دیکھا ہے اس نے تمہارے جسم کو— کتنا جانا ہے ترانہ نے—؟ صرف اتنا ہی نا، جتنا ایک بیوی نبھائے جانے والے رشتوں کی بنیاد پر جان سکتی ہے— صرف اتنا ہی نا، جتنا کہ ایک جسم کا درد یا بھوک ہوتی ہے...... صرف اتنا ہی نا، کہ ایک وقت، اس بھوک میں ایک ساتھ واسنا کی لہریں بھی شامل ہو جاتی ہوں گی— لیکن...... وصال کے کسی بھی لمحے وہ کتنا تم کو جان پاتی ہے—؟ تمہارے روم روم میں کتنے خواب دیکھ پاتی ہے—؟ تمہاری سانسوں کی ہلچل میں کتنا ڈھونڈ پاتی ہے تم کو؟ ترانہ تم میں ہر بار ایک نئے سیلان کو دیکھنے کی کوشش کرتی ہے یا نہیں......؟ ایک نئے گیت، نئے سپنے، اور نئے سیلان کو......

مہک ٹائپ کرتی جا رہی تھی اور جیسے ہر لمحہ حیرتوں کی بارش میں، میں نہاتا جا رہا تھا— کیا ہے یہ؟ مہک کے آتے ہی اتنا بے بس کیوں ہو جاتا ہوں میں۔ اندر سے سوالوں کے کیکٹس خاموشی سے سر نکال رہے تھے...... ایک بارہ سال کا بیٹا ہے تمہارا...... مکمل جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کی تیاری میں— مہک اس سے دس ہی سال تو بڑی ہے۔ ایک ہندوستانی خاندان میں جنم لینے کے بعد عمر کی چالیس بہاروں کو پار کرنے کا مطلب جانتے ہو؟ ایک سنجیدہ شخصیت۔ خاندان کے لیے...... بچوں کے لیے اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرنے والا— اس عمر میں آنے کے بعد تو ایک پختہ مرد سانس لیتا ہے— جسے تمہارے مہذب سماج میں عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے...... کیونکہ یہ سماج جانتا ہے، یہ شخص ہمارے مہذب سماج کی علامت ہے— یہ شخص محبت نہیں کر سکتا۔ کسی دوسرے کے ساتھ سیکس کے بارے میں سوچنا اس کے لیے کسی قیامت سے کم نہیں۔ اور یہاں کسی بھی طرح کے ناممکنہ حادثے کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ پھر بھی مہک آ چکی تھی۔ ایک ایسے چور دروازے سے، جو پتہ نہیں میرے اندر کیسے کھلا رہ گیا تھا...... وہ آ گئی تھی...... وہ اپنی محبت کا حق مانگ رہی تھی......

ترانہ— اور سوال

محبت ایک عجیب سا سچ ہے کہ اس سچ کو جانے والے راستے بھی نہ سمجھ میں آنے والے اور خوشبو سے مہکے ہوتے ہیں— اور محبت کی طرح، محبت سے آنے والی زمینی اور جغرافیائی

تبدیلیاں بھی اسی سچ کا ایک حصہ ہیں — ارتقاء کی اس لمبی ریس میں ہماری اس عالمی برادری کے ساتھ چمتکار اور معجزے کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار بھی شامل ہے۔ معجزے سے ایجاد تک، برین کو داؤن کوڈ کئے جانے سے لے کر انسان کے کلون بنائے جانے تک — جادو کی اس نگری میں عرصہ پہلے وینس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا — آسمان پر چمکتا ایک ننھا سا روشن تارا، جس کا نام محبت تھا، ٹوٹا اور اس کی کرچیاں دور تک آسمانی چادر میں پھیلتی چلی گئیں۔ اور یہ وہی وقت تھا، جب محبت کی یہ نئی کہانی لکھی جا رہی تھی۔ اور یہ وہی وقت تھا، جب کہکشاں میں پھیلی ہوئی نہ ختم ہونے والی اداسی ہماری اور آپ کی اس دنیا سے پوچھ رہی تھی...... کہ محبت گم کہاں ہو گئی — اور برسوں بعد ایجاد و اختراع، معجزہ اور جراسک پارک کے اس عہد میں۔ ایک نئی کہانی خود بہ خود شروع ہوتی چلی گئی — سیلان کے روپ میں — ترانہ کے روپ میں — یا پھر مہک احمد کے روپ میں —

لیکن اس بار یہ کہانی مختلف تھی۔

جیسے اس دن — خاموشی کے جلتے ریگستان میں پانی کی ایک بوند ٹپ سے گری اور بھاپ بن کر اڑ گئی۔

مہک غائب تھی — اور ترانہ اپنے مکمل وجود کے ساتھ وینس کا دھڑکتا ہوا دل بن گئی تھی —

'اچھا تم نے کیا سوچا؟' ترانہ کی آنکھیں میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔

'پتہ نہیں۔'

ایک ایمانداری تو ہے تم میں — محبت کا اظہار کرنے سے نہیں گھبراتے کہ تمہیں بھی مہک سے پیار ہے......

میں خاموشی سے خلاء میں دیکھتا رہا۔

'اچھا بتاؤ، تم اس سے رومانی باتیں بھی کرتے ہو؟'

'ہاں......'

'بہت؟'

'شاید۔'

'سامنے ہوتے تو شاید اس کا ہاتھ بھی تھام لیتے......' ترانہ کی آواز برف جیسی یخ تھی —

'شاید......'

'شاید نہیں۔ تھام لیتے۔ یا ممکن ہے، اس سے بھی آگے— ' وہ کہتے کہتے رکی......
مہک سے بات کرتے ہوئے ایک لمحہ کو بھی میری یاد نہیں آئی...... مان لو۔ ایک دن میں تم نے اس کے ساتھ تین گھنٹے گذارے تو ایک مہینے میں ۹۰ گھنٹے ہوئے نا...... یاد ہے سانیال—

ترانہ نے میرے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اس کی آنکھیں پرانی یادوں کو محسوس کرتے ہوئے تھوڑا سا نم تھیں—یاد ہے...... تم کہا کرتے تھے...... جو مرد اپنی بیوی کے علاوہ، باہر کی دنیا میں کسی دوسری عورت سے ملا۔ اُسی پیار کے جذبے سے...... تو سمجھو اس نے اپنا ایک عضو کاٹ لیا۔ یاد ہے نا...... بار بار ملتا رہا تھا تو...... باہر کی دنیا میں۔ پرائی عورتوں سے...... تو اس کے سارے عضو کٹ گئے۔ یاد کرو کہتے تھے نا...... یہ بھی کہتے تھے...... کہ پھر ایسا آدمی، اسی پختہ جذبے کے ساتھ، اپنی بیوی سے بانہیں پھیلا کر کیسے مل سکتا ہے؟ اور اپنے بچوں سے؟ کیونکہ اپنے پیار کے سارے اعضاء کو کھو چکا ہے وہ...... ترانہ نے اس کی طرف دیکھا— مسکرائی— تمہارے اعضاء تو سلامت ہیں نا سانیال؟ میرے لیے؟ اور میرے بچوں کے لیے......؟

میرے اندر جیسے میری اپنی چیخ برف کی متعدد سلیوں کے درمیان لہولہان تھی...... اس ایک لمحہ اپنے ہی درد سے لڑتے، ابھرتے شاید میں نے کوئی فیصلہ لے لیا تھا۔

'وہ نیٹ کا سچ ہے، جسم کا نہیں......'

'اوہ!'...... ترانہ زور سے ہنس پڑی۔

'نیٹ سارے کرتے ہیں۔ کون نہیں کرتا۔ لوگ تو ایسی باتیں اپنی بیویوں سے شیئر بھی نہیں کرتے......'

'میں لوگوں کو نہیں جانتی جان۔ سانیال کو جانتی ہوں'...... ترانہ کی آواز میں کہیں بھی غصہ کا اظہار نہیں تھا...... تم نے کہا، وہ نیٹ کا سچ ہے۔ جسم کا نہیں۔ تم اس سے رومانٹک چیٹ بھی کرتے تھے؟

ہاں......

ہاتھ تھامتے تھے......؟

ہاں......

کس (Kiss)......؟

شاید......

شاید نہیں ہاں بولو

ہاں......

ہونٹوں پر......

ہاں......

چلو ہونٹوں پر، آنکھوں پر یا تمہاری مرضی ۔ کیونکہ پیار کے کسی بھی لمحے کی شدت کو بیان کرنا آسان نہیں ہوتا۔ مگر تم شاید سامنے ہوتے تو...... وہ سب کرتے نا سانیال......؟'

'سامنے ہوتے تو نا......؟'

'سامنے ہوتے تو شاید سنامی بن جاتے...... ہے نا۔ ڈرو مت سانیال...... کبھی کبھی بہت چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کل دیر تک سوچتی رہی۔ ہاری کہاں میں؟ سولہ برسوں میں تمہارے اندر کہاں ایک خلا چھوڑ دیا۔ کہاں سانیال' بتاؤ مجھے۔ اس سے یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں روکوں گی۔ سمجھاؤں گی۔ کیونکہ محبت تم سے میں نے کیا ہے۔ میں نے بہت محبت کی ہے۔ سانسوں سے سانسوں کی محبت۔ پہلی سانس سے آخری سانس کے سارے پھول۔ بس اسی کچی عمر میں تمہارے نام چن لیے — روکوں گی نہیں۔ سوچ لوں گی کہ شاید اتنی ہی محبت لکھی تھی میری تقدیر میں — کیونکہ جہاں محبت پر روک یا بندھن لگ جائے، وہاں محبت نہیں ہوتی۔ خود غرضی آجاتی ہے......

'پھر یہ سب......'

'تم بتاؤ۔ کیا سوچا ہے تم نے......'

'میری آواز جیسے گلے میں پھنس گئی — مہک شادی کرنا چاہتی ہے، مجھ سے......'

'تو......'

'وہ کہتی ہے، وہ انڈیا آجائے گی......'

'تو لے آؤنا......' ترانہ نے آہستہ سے میرا ہاتھ تھام لیا — لے آؤ مہک کو......

'اور تم......؟'

ترانہ آہستہ سے ہنسی...... جانتے ہونا اپنی ترانہ کو — بچپن سے بٹوارا کبھی پسند نہیں آیا......بس مہک کا ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں پکڑا کر چپکے سے نکل جاؤں گی۔'

اس نے سر گھما لیا تھا......

•

میرے اندر جیسے زور سے بادل گرجے تھے......اور اس درمیان سولہ برسوں کی ترانہ کا ہر رنگ و روپ — ہر سنگار نظروں کے سامنے تھا......لگا، پرستان میں جانا کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ پتھر جیسی حقیقت پر چلنا مشکل — آنکھوں میں کہیں چھن سے مہک کی پایل بج گئی — اور آنکھوں کی پتلیوں پر ترانہ چھا گئی......تو لے آؤ نا اسے......

•

مجھے نہیں معلوم، داستان، قصے کہانیوں کی اب تک کی تاریخ میں ایک بیوی نائیکا یا ہیروئن کیوں نہیں بنتی —؟

مرد کی زندگی میں آنے والی دوسری یا تیسری عورت ہی 'نائیکا' یا ہیروئن کیوں بنتی ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ ایک مکمل زندگی کے ساون اور سپنے اپنے مرد کو بانٹتے ہوئے وہ کہیں کھو جاتی ہے۔ مگر اپنی تکمیل کے ساتھ ایک ہی گھر میں ہر لمحہ، دکھ سکھ کی سب سے بڑی ہیروئن وہی رہتی ہے۔

میں کسی بھی طرح کے الیوژن یا ڈائیلما میں نہیں تھا —

محبت کے جھرنے اور بارش سے الگ میں ترانہ کے تمام رنگوں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور اس دن — شاید میرے جذبات مہک تک پہنچ گئے تھے۔ اس نے آخری بار پوچھا تھا —

'بولو۔ میں دہلی آجاؤں؟ میں تم پر بوجھ نہیں بنوں گی سانیال۔ معاشی طور سے بھی نہیں۔ بس تمہارا ساتھ، تمہارا وجود چاہئے۔ ہاں۔ یا نا...... مجھے اسی لمحے تمہارا جواب چاہئے۔'

میرے اندر کسی بھی طرح کے پٹاخے یا آتش بازی کے چھوٹنے کی کوئی آواز نہیں تھی......

میں نے آہستہ سے ٹائپ کیا — بہت سوچ سمجھ کر — 'نہیں۔'

مہک 'سائن آؤٹ' کر گئی تھی۔ کیم پر اندھیرا تھا۔ مہک غائب تھی —

پھر وہ نہیں ملی......

اور دیکھتے ہی دیکھتے لمحے، مہینوں کا سفر کر گئے۔ شاید پانچ مہینے گزر گئے تھے۔

•

شاید یہ وہی وقت تھا، جب آسمان پر ایک ٹوٹتے تارے کو دور تک لکیر، پھر صفر میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا...... لیکن شاید ایسی ہی کسی دھند، کسی خاموشی سے ایک نہ بھولنے والے، آنسوؤں میں ڈوبے گیت کی تخلیق ہو جاتی ہے...... یا پھر صدیوں میں کوئی ایسا ہی پیار، تاج محل جیسی زندہ تخلیق دے کر محبت کرنے والوں کے لیے ایک مثال بن جاتا ہے۔

●

کوئی کوئی پیار
'تاج محل' ہو جاتا ہے۔
لیکن شاید تب سوچا نہیں تھا، آسمان میں ٹوٹتے ہوئے تارے میں آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے گیت کو سننا اور پھر محبت کی علامت تاج محل کو محسوس کرنا، آنے والے دنوں میں مجھے اس طرح حیران بھی کر سکتا ہے —

ترانہ پوچھ رہی تھی۔ تم اسے بھول گئے نا؟
'شاید......'
'اگر وہ سچ مچ آ جاتی تو؟'
'نہیں جانتا؟'
'جھوٹ بولتے ہو......' پیار کے لمحاتی احساس سے اس کی آنکھیں شرارتی بن جاتیں — وہ آتی تو خود پر قابو نہیں رکھ پاتے۔
'نہیں کہہ سکتا۔'
'ایسا کیوں ہوتا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہوتے ہوئے بھی اچانک زندگی میں خاموشی سے کوئی دوسرا کیوں آ جاتا ہے — وہ ٹھٹھکی — کہیں کوئی کمی نہیں تھی، شاید؟ کہیں کوئی خالی پن بھی نہیں چھوڑا تھا ہم نے — جیسے ان رشتوں میں اکثر ایسے خالی پن رہ جاتے ہیں — خالی دروازے جیسے — جس چور دروازے سے کوئی بھی آپ تک چھلانگ لگا سکتا ہے — لیکن شاید ایک بار ملی زندگی کا اپنا کوئی آزاد صفحہ بھی ہوتا ہے۔ اس صفحے پر کسی دوسرے کا نام لکھتے ہوئے شاید کوئی 'گلٹ' یا پچھتاوا بھی نہیں جاگتا — کیونکہ یہ اپنے اور اپنے دل کے درمیان کی بے حد اکیلی اور ذاتی سڑک ہوتی ہے، جس پر اس کی بیوی اور بچے نہیں چل سکتے۔

ترانہ اس کی طرف مڑی — اچھا مان لو۔ وہ اچانک کسی لمحہ تمہارے سامنے آ کر کھڑی

ہوجائے تو—؟ کیا کروگے تم سانیال—؟ منع کردوگے—؟ جانے کو کہوگے یا کہوگے کہ اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے تمہارا یا پھر...... بولو......؟

آسمان میں کتنے میزائل ایک ساتھ چھوٹتے چلے گئے تھے۔

●

بشنواز نے چوں حکایت می کند
و از جدائی ہا شکایت می کند
(مولانا روم کی مثنوی سے)

(بانسری سے سنو وہ کیا بیان کرتی ہے،
ہماری جدائیوں کا شکوہ بیان کرتی ہے۔)

وہ ایک عام سی صبح تھی۔ لیکن شاید وہ بے حد عام سی صبح نہیں تھی۔ وہ بیحد عام سی صبح ہو بھی نہیں سکتی تھی—اور خاص کر سانیال کے لیے— کہ بس ایک رات پہلے ہی مہک کے گم ہوجانے کا تذکرہ ہوا تھا۔ ایک رات پہلے تک سب کچھ معمول پر تھا۔ دریا کے پانی میں پتھر کی اچھال کے بعد تیز بھنور تو بنے تھے لیکن پھر سناٹا چھا گیا تھا— لہریں خاموش تھیں— اور اچانک اس خوبصورت، جگمگاتی صبح جیسے پانی میں ایک کے بعد ایک کتنے ہی پتھر اچھال دیئے گئے......اور ندی کے پانی میں لہروں کے کتنے ہی جال بنتے چلے گئے۔

صبح سات بجے کی دستک......

بیل کی گھنٹی جیسے کسی انجانے طوفان کو لے کر آئی تھی۔ دروازہ کھولنے والا بیٹا حیرت سے سامنے کھڑی عورت کو دیکھ رہا تھا— سانولا چہرہ، آسمانی رنگ کی قمیض اور اس سے میچ کرتی شلوار۔ کندھے سے جھولتا ہوا دوپٹہ......

'تم آصف ہونا......؟'

ترانہ کے سامنے آنے تک وہ اس کے گلے سے لگ کر بہنوں کی طرح رو پڑی تھی......

اور آپ ترانہ......؟ میں مہک ہوں۔ پاکستان سے کل رات ہی آ گئی۔ سانیال کہاں ہے؟

جیسے کمرے میں اچانک تیز زلزلہ آ گیا ہو۔ بیٹا حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ترانہ کی آنکھیں ابھی بھی معصومیت میں ڈوبی یا اپنی کیفیت کو چھپاتی ہوئی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں — میں باہر نکلا تو دو پر اسرار آنکھیں جیسے مجھے دیکھ کر طلسماتی کہانیوں سے نکلی، پتھر والی ساحرہ میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ وہ انگلی سے میری طرف اشارہ کرتی رہی تھی — لفظ گونگے تھے اور چہرہ، جسم جیسے جذبات کی کتاب بن گئے تھے — ایسی کتاب جو شاید آج تک کسی بھی انسانی زندگی کو نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔

مہک کی آواز میں لرزش تھی......

'ترانہ، ہم کیا دومنٹ کے لیے اکیلے میں مل سکتے ہیں۔ باتیں کر سکتے ہیں......؟

بیٹا، ماں کی بانہوں میں سہما سا تھا — ترانہ مسکراتی ہوئی کہہ رہی تھی......

'ہاں۔ کیوں نہیں......'

لیکن شاید ترانہ کی آنکھیں میری طرف دیکھ پانے میں کامیاب نہیں ہوئی تھیں — یا میں ترانہ، یا بیٹے کی طرف دیکھ پانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا — وہ کب اور کیسے میرے قریب آ کر کھڑی ہوگئی، مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔

'تمہارا کمرہ کون سا ہے؟'

اس کی آواز برف جیسی تھی۔ پاکستانی لباس سے اٹھنے والی خوشبو، ہندوستانی خوشبو سے مختلف نہیں لگی۔

●

کمرہ جیسے دنیا کے کسی آٹھویں عجوبے میں تبدیل ہو گیا تھا — اندر تک جیسے آگ میں ڈوبی ایک لہر تھی — شاید جس نے میرے پورے وجود کو اس وقت جلا کر رکھ دیا تھا۔ لفظ کسی سرنگ یا گپھا میں کھو گئے تھے۔ باہر بیٹے یا ترانہ کے بارے میں کچھ بھی سوچ پانا مشکل تھا۔ کمرے میں یکا یک زلزلہ آ گیا تھا۔

وہ مجھے چھو رہی تھی...... انگلیوں کے پور پور کو، ناخن کو...... میرے لباس کو...... میرے وجود کو...... میری روح کو یا میری سانسوں کو......

'تم سانیال ہو...... نا۔ کیسے یقین کروں خود پر...... نہیں، اتنی خوش قسمت نہیں ہو سکتی میں...... تم...... اتنے قریب۔ اتنے پاس۔ نہیں۔ روکو مت...... چھونے دو مجھے۔ یہ تمہاری انگلیاں ہیں۔ یہ تمہارا لباس۔ تمہیں دیکھ سکتی ہوں۔ چھو سکتی ہوں۔ اتنی قریب ہوں تم سے اور تمہیں دیکھتے

ہوئے...... زندہ کیسے ہوں...... سانیال — کاش، مجھے موت آجاتی، اس لمحے...... تمہیں تم دیکھتے، محسوس کرتے اور جیتے ہوئے...... تم نے کبھی سوچا نہیں تھا نا، کہ مہک یہاں بھی آسکتی ہے۔ ایک دن تمہارے دیس، تمہارے شہر، تمہارے گھر میں — اپنی سانسوں کی گونج میں خاموشی سے ایک گھروندہ بنا کر رکھ لیا تھا تمہیں — سوچا بھی نہیں کہ ایسا کرتے ہوئے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوگی — تم ٹھیک ہونا...... بولتے کیوں نہیں سانیال۔'

'تم کیسے آئی......' آہستہ سے کوہ قاف کی وادیوں سے جیسے کوئی آواز گونجی ہو۔ جیسے جسم میں سمائی سانسوں نے سب کچھ بھول کر اس کے نام کا کلمہ پڑھنا شروع کر دیا ہو۔

'یونیورسٹی کی طرف سے دہلی کی قدیم عمارتوں کو دیکھنے کے لیے 20 لڑکے اور لڑکیوں کا ایک وفد آیا ہے۔ ہم کل رات ہی آگئے تھے۔ رات کا ایک ایک لمحہ جیسے تمہارے نام کی جاگتی تسبیح بن گیا تھا۔ ساری رات تمہارے ہونے کی عبادت سے گزرتی رہی۔ پھر سورج کی پہلی کرن کے ساتھ سجدے سے فارغ ہوئی اور کسی کو بتائے بغیر......'

'تم نے کسی کو بتایا بھی نہیں......؟'

'نہیں......'

اگر کسی نے تمہاری تلاش شروع کی......؟ زلزلے کا یہ پہلا جھٹکا تھا۔

وہ معصوم سی اب بھی میری انگلیوں کو چھو رہی تھی۔ 'حنا جانتی ہے تمہارے بارے میں...... مگر زیادہ نہیں......'

'حنا کون ہے؟'

'میری ایک دوست......' وہ آہستہ سے بولی...... آج دس بجے ہمیں پولس ہیڈ کوارٹر بھی جانا ہے...... فارملٹی پوری کرنے...... لیکن میں تو جا ہی نہیں سکتی......' وہ کانپ رہی تھی...... اس کی آنکھیں بند تھیں...... بس تمہارے ہونے کے احساس کو خود میں سمیٹ لینا چاہتی ہوں۔ پھر......' وہ آہستہ سے بولی...... دنیا میں آنکھیں کھولنے کا مقصد پورا ہو جائے گا میرا......' وہ بچوں کی طرح میری طرف مڑی...... پھر کمرے کو دیکھنا شروع کیا...... یہ تمہارا بستر ہے نا۔ تم اسی بستر پر سوتے ہونا...... لیٹ جاؤں؟ تھوڑی دیر...... بستر کی شکن میں بھی تم ہوگے — ہے نا سانیال؟ تمہارا لمس ہوگا...... لے لوں یہ سارے کے سارے لمس...... بولونا......؟

جھٹکے سے وہ آگے بڑھی اور بستر پر لیٹ گئی...... لمحے بھر کو آنکھیں بند کرلیں...... پھر

اٹھی...... آنچل برابر کیا۔ وہ ہنس تھی۔نہیں وہ رورہی تھی...... 'چلو اپنے گھر بھی آ گئی۔ اپنے بستر پر بھی سولیا...... مجھے رکھ لو نا یہیں......؟ مجھے کہیں مت جانے دو— میں تو بس تمہارے لیے آئی ہوں۔ مجھے روک لو نا یہیں...... مجھے مت جانے دو۔'

کہیں دور مولانا روم کی بانسری کے سر گونج رہے تھے...... بانسری سے سنو، وہ کیا بیان کرتی ہے...... بانسری نے ان لمحوں کو قیامت کے لمحوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ میرا چہرہ کسی بت کا چہرہ تھا۔ باہر ترانہ اور بیٹے کے بارے میں سوچتے ہوئے اندیشے کے ہزاروں گھنے بادلوں کے درمیان کہیں خود کو محسوس کر رہا تھا...... اور مہک قریب، بند آنکھیں لیے میرے سینے پر سر رکھے، آنکھیں بند کیے جیسے کسی اور ہی دنیا میں گم تھی...... میں شاید کانپ رہا تھا...... آہستہ سے اپنا کانپتا ہاتھ اس کی پیٹھ پر رکھا تو وہ جیسے میرے سینے، میری سانسوں میں گم ہوتی چلی گئی— لیکن اندیشے، سوالوں کی برچھیاں لے کر کھڑے تھے...... 'مہک نہیں گئی تو؟ مہک کو جانے کے لیے کیسے کہوں؟ مہک کے نہیں جانے سے کتنا بڑا ہنگامہ کھڑا ہو سکتا ہے۔' معاملہ پاکستان سے آئی ہوئی ایک لڑکی کا ہے۔ اور لڑکی غائب؟ پھر؟ دہشت گردی سے لے کر سوسائیڈ بم تک کتنی کہانیاں اس ایک لمحے مجھے پریشان کر گئی تھی۔ مگر شاید مہک سے کچھ بھی کہہ پانا ممکن نہیں تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مہک میرے وجود سے الگ ہو...... اس کی محبت، معمولی نشے سے آگے بڑھ کر، عبادت بن کر میرے وجود میں گھل رہی تھی...... پھر جیسے وقت ٹھہر گیا...... وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔ میری طرف مڑی۔ پتھرائی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک جزیرہ آباد تھا۔

'جا رہی ہوں۔ تمہیں پریشان نہیں کروں گی...... اپنے محبوب کو پریشان دیکھ بھی نہیں سکتی۔ مگر تمہیں ایک بار دیکھنا ضروری تھا۔ تمہیں چھونا۔ تمہارے لمس کو اپنے اندر محفوظ کرنا......'

اس کے چہرے پر انوکھی سی مسکراہٹ تھی...... مجھے روکنا مت...... اور ہاں۔ اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ میں پاکستان واپس چلی جاؤں گی......'

وہ آہستہ سے ہنسی...... 'تمہارے دیس' تمہارے شہر میں رہ نہیں سکتی۔ لیکن...... مر تو سکتی ہوں نا......!'

آگے بڑھ کر اس نے اپنے گرم ہونٹ میرے ہونٹ پر رکھ دیئے۔ پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، محسوس ہوا، جیسے پاؤں کے نیچے کی زمین کانپ رہی ہو۔ بانسری کی آواز قریب آ گئی تھی۔

'جب تو نے مجھے مست کر دیا، مجھ پر حد جاری نہ کرو
شریعت مستوں پر حد جاری نہیں کرتی ہے۔

چونکہ مستم کردۂ حدّم مزن
شرع مستاں رانیاد حد زدن

●❖●

شاہی گلدان

شاہی گلدان نئے گھر میں قدم رکھنے کے بعد بھی موجود تھا۔ اور صرف موجود ہی نہیں تھا بلکہ اپنی موجودگی ثابت کرنے کے لیے بھی ہمیں پریشانیوں میں ڈال گیا تھا۔ اب اسے رکھا کہاں جائے......؟

'رکھنے' کی یہ بات ابا کو کچھ ایسے ناگوار گزرتی تھی، جیسے کسی نے اچانک شاہی تاج ان کے سر سے چھین لیا ہو۔

'کیا مطلب'...... ارے شاہی گلدان ہے۔ کیوں نہ اسے ڈرائنگ روم میں رکھ دیا جائے۔'

'ڈرائنگ روم — ؟' فرحین کے لیے اپنے نئے گھر کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں اس کی کہیں کوئی جگہ نہیں تھی۔ کیونکہ گھر آنے والے رئیس زادے اور دوست نہ اسے کوئی اینٹک پیس سمجھتے اور نہ اس سے وابستہ کہانی میں ان کی آنکھیں گم ہو چکی شہنشاہیت کی سڑک تک جانے کی ہمت کر سکتی تھیں۔ بس وہ کھل کر ہنس دیتے — 'بھابھی...... تم بھی نا...... کسی کباڑی بازار سے لیا گیا......؟'

اشرف کے لیے اس شاہی گلدان کی کشش صرف اتنی تھی کہ ابا کا احترام اس عمر میں کچھ زیادہ ہی بڑھ گیا تھا۔ اور ابا وقت کے ساتھ آج بھی شہنشاہیت کے اسی قلعے میں قید تھے، جہاں سے شاید باہر نکلنا اب اس عمر میں ان کے لیے آسان نہیں رہ گیا تھا۔

ہاں، اگر اس نشانی سے جڑی نفرت کو دیکھنے کی بات تھی تو وہ بس امی کی آنکھوں میں دیکھی جا سکتی تھی — جہاں گلوکوما تو اتر آیا تھا، مگر آنکھوں میں چھائے گھنے اندھیرے کے کہرے

کے باوجود شاہی گلدان کی تاریخ تک، بے رحم ماضی کے اوراق پلٹتی ان کی آنکھیں اگر چہ کچھ بول نہیں پاتیں، لیکن خاموشی میں ساری کہانی سنا ڈالتیں...... 'کہ لو کہاں کا شاہی گلدان۔ بچوں نے تو ایک گھر بنا لیا اور ایک ہم تھے کہ شادی کے بعد تمہارے چھپّر کھٹے میں آئے تو ساری زندگی تنگی کے سائے میں، اسی چھپر کھٹ میں گذر گئی۔ بس لے دے کر زندگی بھر اس شاہی گلدان کی کہانی کہتے رہے...... کہ بڑے بادشاہوں کے خاندان کے ہو۔ لیکن کہاں کے بادشاہ۔ تین وقت کی روٹی تو سڑک کا بھکاری بھی پیدا کر لیتا ہے......'

●

میرا نام اشرف ہے۔ اشرف جہانگیر۔ بچپن میں تاریخ کی کتابیں مجھے پسند نہیں تھیں۔ بڑا ہوا تو تاریخ سے نفرت ہوگئی۔ تاریخ میرے لیے ایک خوفناک آئینے کی مانند تھا، جس میں اپنی صورت دیکھنے کا احساس ہی مجھ میں خوف بھر دیتا تھا۔ تاریخ کے اوراق مجھے بے رحم لگتے تھے۔ کیونکہ بچپن کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی گھر کی ٹوٹتی محرابوں سے جھانکتی خاموشی مجھے زخمی کرتی تھی۔ ابا نے میری پیدائش کے بعد ہی خود کو مسجد کے حوالے کر دیا تھا۔ تنگی کے اس ماحول میں جب امی کا چڑ چڑاپن اور غصہ ابا کے کمزور وجود پر ظاہر ہوتا تو ابا سب کچھ بھول کر بس اس شاہی گلدان کو لے کر اپنی بے چارگی دکھانے آجاتے۔

'لو میں کیا کروں۔ سب تقدیر کے کھیل۔ کسے معلوم تھا کہ تیموریہ خاندان کا زوال آجائے گا اور ایک دن ان کی اولادیں پیسے پیسے کو ترس جائیں گے......'

صبا مجھ سے دو سال چھوٹی تھی۔ امی ابو کو لڑتے دیکھ بس خاموشی سے اپنے کمرے میں بند ہو جاتی — اور تکیے پر گر کر آنسو بہانا شروع کر دیتی۔

تاریخ کے بے رحم اوراق پر 'تیموریہ ٹھونگا بھنڈار' کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھتا ہوں اور اس جھلک میں ابا کی بدقسمتی کی اُس کہانی کو محسوس کر سکتا ہوں، جب انہوں نے شروع، شروع ایک چھوٹی سی دکان میں ٹھونگا کا یہ کاروبار شروع کیا تھا۔ پیٹ کی دوزخ کو شانت کرنے کے لیے شاہی تخت سے ٹھونگے کی طرف ہجرت کرتے ہوئے کتنا کچھ ٹوٹ گیا تھا ان کے اندر۔ تاریخ کے اس بے رحم قلعے میں جھانکتے ہوئے وہ آنسو آج بھی نظر آجاتے ہیں، جو صبح ابا کی خشک آنکھوں میں نظر آیا کرتے تھے۔ سرخ پھولی آنکھیں رات کی ساری روداد سنا ڈالتیں کہ 'شاہی حجرے' سے حال کے مقبرے کو دیکھنے کا تصور کیسے ہوتا ہے — ابا حال سے پریشان تھے اور تاریخ اُنہیں خوش کرتی تھی۔

شاید انہی دنوں تاریخ سے نفرت کی کہانی کی شروعات ہو چکی تھی۔ تاریخ کی یادگاریں اور مقبرے مجھے بس ان گھنونے مکڑی کے جالوں کی طرح لگتے، جن میں پھنس کر کسی کیڑے کی موت ہو گئی ہے۔ اس وقت کی جدو جہد میں ہم بھی انسان کہاں تھے۔ کیڑے تھے— مردہ کیڑے اور شاہی داستانیں سنانے والا ٹوٹا پھوٹا گھر کسی مقبرے کی طرح لگتا، جس سے نجات حاصل کرنے کی فکر لمحہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

کیا تاریخ کو کسی تشریح و توضیح کی ضرورت ہوتی ہے؟ یا تاریخ کسی نہ کسی صورت میں زمانہ اور عہد کے مطابق خود کو نئے سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ میری بڑھتی عمر کے ساتھ گھر کے اجنبی سے ماحول میں امید کی ایک نئی کرن چمکی تھی —اور ساتھ ہی تبدیل شدہ تاریخ یا اس کی تشریح کا ایک نیا چہرہ دیکھا تھا میں نے۔ دو جگہ سے میری بحالی کی خبر آئی تھی۔ ایک جگہ نئے کالج میں لکچرر کے طور پر اور دوسرا ایک ریپوٹیڈ فرم میں فیلڈ افسر کے طور پر— میں نے یہ بات ابا اور گھر کے کسی فرد کو نہیں بتائی۔ کیونکہ ان میں سے ہی کسی ایک کو جوائن کرنے کے فیصلے پر پہنچنا تھا مجھے۔ یہ احساس تھا کہ غربت کی اس تاریخ میں تھوڑی سی تبدیلی تو آئے گی۔ مگر یہ تبدیلی ایک نئی شکل میں بھی آئی تھی— یا تبدیلی ایک نئی تعریف کے ساتھ آئی تھی۔

اُنہی دنوں شہر کے ایک کالج میں طالب علموں کی دو جماعت کے درمیان جھگڑا ہوا اور یہ جھگڑا اتنا طول پکڑا کہ سارا شہر اور شہر کی چھوٹی چھوٹی سڑکیں دہشت میں ڈوبے نوجوانوں کی چیخ و پکار سے لرز گئیں۔ جلدی جلدی دکانیں بند ہونے اور شٹر گرنے لگے۔ جو دکانیں کسی وجہ سے کھلی تھیں وہ لوٹ لی گئیں۔ لوگ چھتوں سے، کھڑکیوں سے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اس وقت شہر کے کالجوں میں مشتعل طالب علموں کی ایسی جھڑپیں کوئی نئی بات نہیں تھی۔

میں کمرے سے باہر آیا تو اماں اور صبا گھبرائے ہوئے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

''ابا نہیں آئے......؟''

پتہ نہیں...... کہاں ہوں گے؟

سڑک سے آ رہی چیخ و پکار کی آوازوں کے درمیان میں خوفزدہ تھا۔ دو گھنٹے بعد ابا لوٹ آئے۔ آواز میں لرزش...... یہ بتانے کہ کمبخت نے دکان لوٹ لی۔ ٹھونگے سڑک پر پھینک دیئے۔

مشین کے کل پرزے الگ کردیئے۔ ڈرائنگ روم میں رکھے شاہی گلدان کو دیکھتی ابا کی آنکھیں پڑھتا ہوا میں تاریخ اور تشریح وتوضیح کی نئی سڑک سے گزر رہا تھا۔ ابا خوفزدہ اور پریشان ہونے کا ناٹک کررہے تھے۔ ابا کہیں سے بوجھل یا پریشان نہیں تھے۔ اس بات سے بھی نہیں کہ دکان لوٹ لی گئی تو اب یہ گھر کیسے چلے گا۔ ان کی نظریں ایک ٹک شاہی گلدان پر گڑی تھیں اور اسی احساس نے مجھے تاریخ کی نئی تعریف سے متعارف کرایا تھا۔ موجودہ وقت کے بھیانک اوراق کی جگہ انہوں نے سنہری تاریخ کو ترجیح دی تھی۔

'اب کیا ہوگا؟' اما نے آنگن سے برآمدے میں بھاگتے چمگادڑ کو دیکھ کر گردن جھکالی تھی۔ تب میں آہستہ سے بولا تھا— اب ابا کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میری نوکری لگ گئی ہے۔

شاید اس لمحہ ابا کی آنکھوں میں جو چمک لہرائی تھی، وہ ان تیمور یہ بادشاہوں کی آنکھوں میں بھی نہیں ہوگی، جب وہ جنگ کے میدان سے، فتح کے احساس کے بعد محل لوٹتے ہوں گے۔

●

محبت آپ کی زندگی کو بامعنی بنادیتی ہے۔ شاید اب بہتر اور معقول وقت ہے کہ اس دبلی پتلی سی، لمبی سی فرحین کا تذکرہ بھی کردیا جائے۔ میری چھت کے سامنے والی چھت پر آنچل کا کونا بار بار ہونٹوں سے دبائے اور بار بار آنچل کے سرکنے سے پریشان۔ میری نگاہوں کا سامنا ہوتے ہی گھبرا جانے والی فرحین۔ کب صبا کی دوست بن کر گھر آنے جانے لگی، پتہ بھی نہیں چلا۔ لیکن اپنی آمد سے اس نے گھر کے سارے لوگوں کا دل جیت لیا تھا— ابا کے سر میں تیل دیتی ہوئی۔ کبھی امی سے چھین کر روٹیاں بناتی ہوئی۔ صبا کے بال سنوارتی یا گھر کے چھوٹے چھوٹے کام میں اپنی حصہ داری کا احساس دلاتے ہوئے اس نے خاموشی سے جیسے اعلان کردیا تھا— 'میرا گھر ہے، میں جو کچھ کررہی ہوں اپنے گھر کے لیے کررہی ہوں— پہلے تھوڑی سی بات چیت پھر جھجھک۔ پھر ابا امی اور صبا کی موجودگی میں تھوڑا سا مذاق۔'

''نماز کیوں نہیں پڑھتے ہیں یہ......؟''

''زیادہ کتابیں پڑھنے سے کیا ہوگا؟''

''کم سے کم جمعہ کے دن تو مسجد جایا کریں۔''

''ابا آپ تو بولا کریں۔''

یا پھر صبا سے — کہ تمہارے بھیا ہر وقت غصے میں کیوں رہتے ہیں؟

اور ایک دن خاموشی سے گھر کے ایک گوشے میں، میں نے اس فرحین کی بچی کو تنہا پا کر اچانک سینے سے بھینچ لیا تھا — 'اوئی اللہ' کہہ کر بھاگنے کے بجائے وہ جیسے میرے سینے میں خرگوش کی طرح دبک گئی تھی۔ آنکھیں نیچی کیے۔ لرزتی ہوئی۔ مگر جیسے برسوں سے پیاسی ندی کو تھوڑا سا سکون ملا تھا۔

وہ آہستہ سے بولی تھی — 'کوئی آجائے گا۔'

''پھر آپ شرارت کرتی ہی کیوں ہیں؟''

اس کے کان کی لویں سرخ تھیں۔ آنکھوں کی پتلیاں لرزتی ہوئی۔ آنچل ذرا سا سرکا تھا۔ وہ ہونٹ دابے آہستہ سے بولی۔

'نماز پڑھنے جایا کیجئے، گھر میں رونق رہتی ہے۔'

'دیکھئے فرحین...... میں نے ایک جھٹکے سے اسے بانہوں میں دوبارہ بھینچا تھا — 'میں مذہب کا احترام کرتا ہوں۔ تم اس ٹوٹتے اجڑتے گھر کی ویرانی دیکھ رہی ہو نا...... اس گھر نے اور اس گھر سے پیدا شدہ بہت سارے سوالات نے میرے اندر کے مذہب کو کب مجھ سے دور کر دیا، میں نہیں جانتا — مگر ڈرو مت۔ میں اتنا دور نہیں گیا کہ واپس بھی نہ آسکوں، مگر مجھے میرے عقیدوں کے لیے مجبور مت کرنا۔'

جاتے جاتے، وہ سہمی سہمی سی آنکھوں سے اتنا کہہ گئی تھی۔ 'چلو تمہارے بدلے کی نماز میں پڑھ لوں گی۔ تمہارے لیے اللہ میاں سے معافی بھی مانگ لوں گی۔'

آنچل برابر کرتی فرحین تیزی سے بھاگی تھی — ٹھیک اسی لمحہ جلد بازی میں دیوار سے ٹکرانے کے دوران سوکھی سفیدی کا ایک بڑا جھول گرا تھا۔ شاید یہ حال کی دستک تھی۔ اور تاریخ کا ذرا سا حصہ اس لمحاتی رومانی ماحول کے احساس سے ٹپک گیا تھا۔

پرانے گھروں کی دیواروں پر چھپکلیاں اتنی کیوں گھومتی ہیں۔ اچانک ہی میری نظر دیوار کی جانب گئی تو وہاں دو چھپکلیاں چونکی نگاہ سے میری طرف دیکھ رہی تھیں...... میں چھت کی کمزور اور بارش میں لرزرہی دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ آس پاس کی دیواریں بھی چولہے کے دھوئیں سے سیاہ پڑ گئی تھی...... چھت کو سہارا دینے کے لیے بانس کے موٹے لٹھے لگے تھے۔ اب یہ لٹھے صدیاں گزارتے ہوئے تھکے اور پکے آم کی طرح گرنے کے انتظار میں تھے۔ ایک خوشبو بھی چپکے

سے مجھے چھو کر گئی تھی۔ ایک مکان پرانا پڑ گیا تھا۔ ابا کے ٹھونگے لوٹ لیے گئے تھے — اور بے نور شاہی گلدان کی تاریخ کی چمک ابا کی آنکھوں کو سحر زدہ کر گئی تھی — فرحین جاتے جاتے اپنے جسم کی خوشبو اور انگارے میرے جسم میں چھوڑ گئی تھی — اور دو نوکریوں میں سے ایک کو چننے کے خیال میں، اسی لمحہ دہلی والی ریپوٹیڈ مگر پرائیویٹ فرم کو دل ہی دل میں اپنی منظوری دے دی تھی...... چھوٹے آنگن سے بڑے آنگن کا سفر — سیاہ تاریخ سے دہلی کی زندہ اور موجودہ تاریخ کو دیکھنے کی باری تھی — جہاں قدم قدم پر تیموریہ بادشاہوں کی نشانیاں خوبصورت ماضی کی دستکیں سنا رہی تھیں۔

مٹھی بھر تاریخ

گھر میں میرے دہلی جانے کی خبر پھیل گئی تھی۔ اس لیے رات دسترخوان پر طلباء کے ہنگامے یا ابا کی دکان لوٹنے کی کہانی کہیں نہیں تھی۔ ابا کی آنکھوں میں ماضی کی حسین سڑک نظر آ رہی تھی، اور ماضی کی ان سڑکوں پر قلعہ معلی کی لال اور سفید برجوں کے کلس چمک رہے تھے......

'تو تم دہلی جا رہے ہو......'

ابا کی آواز ایسی تھی، جیسے اپنے آبا و اجداد کے گھر جا رہا ہوں — اپنا پشتینی مکان دیکھنے۔

رات کے کھانے کے بعد ہم چھت پر آ گئے — آسمان پر چاند روشن تھا۔ بادلوں کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں تھا۔ چھت پر پلنگڑیاں بچھ گئی تھیں...... ایک پر میں، ایک پر صبا اور سامنے والے کارنس کے قریب ابا کی پلنگڑی بچھی تھی۔ ابا چاند نہارتے ہوئے جیسے شاہی گلدان کی تاریخ میں گم ہو چکے تھے......

''مئی کا مہینہ تھا وہ...... اب بھلا کیا یاد رہے گا۔ باتیں بھی پرانی پڑ گئیں۔ اور ایک دن باتیں بس پرانی ہو کر کھو جاتی ہیں۔ پشتینی کہانیاں بس ماہ و سال ہوتی ہوئی ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے سارا واقعہ ابھی ان آنکھوں کے سامنے گزر رہا ہو......

صبا اٹھی۔ ابا کے پائتانے بیٹھی...... آہستہ سے سر دبانے لگی۔ ابا کی آنکھیں بند تھیں۔

'بہت بھاری غدر ہوا تھا۔ غدر۔ لیکن ایک تاریخ کے گزر جانے کے بعد صرف تاریخ کے چھینٹے رہ جاتے ہیں۔ اور ان چھینٹوں کو اگلے زمانے کے لوگ اپنے اپنے طریقے سے دہراتے

ہیں۔ غدر تو بس غدر تھا۔ کون غدّار تھا، اپنے یا انگریز۔ کہنا مشکل — 90 سال کے بوڑھے پینشن یافتہ بادشاہ کو کمی کس بات کی تھی — بیٹھے بٹھائے لاکھ روپے مل جاتے تھے — انگریز حاکم ان کی صلاح سے ہی کام کیا کرتے۔ سات یا آٹھ بجے ہوں گے۔ بادشاہ تسبیح خانے میں تھے۔ شاید نماز پڑھ چکے تھے — کھڑکی کے پاس آئے تو دریائے جمنا سے دھوئیں کے بادل منڈرا رہے تھے۔ بادشاہ نے انجانے خطرے کی بو سونگھ لی۔ گھبرائے ہوئے واپس آئے۔ اونٹ برداروں کی ٹولی کو بھیجا کہ ماجرا کیا ہے۔ اونٹ بردار واپس آئے اور گھبرائے لہجہ میں بتایا کہ میرٹھ سے غدّاروں کی پلٹن آئی ہے۔ تلواریں گھماتے، گھوڑے دوڑاتے پاگل فوجی ہیں جو میرٹھ سے ہنگامہ کرتے ہوئے آرہے ہیں۔ صاحب لوگوں کے بنگلے جلا دیئے گئے۔ جو انگریز سامنے آیا، اس کا قتل کر دیا گیا...... سارے شہر میں بھگدڑ مچ گئی۔ میرٹھ سے آئے انقلابی شہر میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ انگریزوں نے ہوشیاری سے اسے بند کرا دیا۔ دہلی پر موت برس گئی۔ غدر کی آگ دور تک پھیل گئی اور اس مارکاٹ، تباہی کے بعد تھوڑا سکون ملا تو یہ آوازیں گردش کر رہی تھیں۔ خلق خدا کا، ملک بادشاہ کا...... لیکن تجربوں کی لمبی راہ داری سے گزرنے والا بوڑھا بادشاہ جانتا تھا کہ ان غداروں نے ان کی زندگی کے چین وسکون کے دن چھین لیے ہیں۔ آنے والے دن بربادی کی کہانیاں لے کر آئیں گے۔ اور وہی ہوا تھا......

ابا نے گلا کھکھارا...... ایک لمحے کو چپ ہوئے پھر جیسے ایک بار پھر وہ تاریخ کی تاریک گپھاؤں میں قید تھے۔

'بادشاہ کی مجبوری تھی، غداروں کا ساتھ بھی دینا تھا اور نہیں بھی دینا تھا۔ ان سے دوبارہ بادشاہ بننے اور انگریزوں کو بھگانے کی اپیل کرنے والی ان کی ہی رعایا تھی — اور اس وقت بادشاہ کی مجبوری تھی یا تیموریہ سلطنت کی سنہری تاریخ کا دباؤ کہ بادشاہ ان غداروں سے ناراض ہوتے ہوئے بھی ان کی ہر بات ماننے کو مجبور تھے...... اور پھر...... بھلا انگریز مکاروں کے سامنے، یہ جذباتی ہندوستانی کب تک چلتے — کشمیری گیٹ، کابلی گیٹ سے انگریزی فوجیں شہر میں داخل ہوگئیں...... چاروں طرف مارکاٹ مچ گئی۔

پھر وقت نے کروٹ بدلی، شاہ زیب، ہمارے خاندان کا شجرہ ان سے ہو کر گزرتا ہے۔ ٹی بیگم پائیں باغ میں تھی۔ بیگمات اور محل کی عورتوں کو ایک بڑے سے ہال میں جمع کیا جا چکا تھا۔ خبر ملی تھی کہ بادشاہ نے ہمایوں کے مقبرے میں، چھپنے کی تیاری کر لی ہے اور حکم ہوا ہے کہ اپنی

اپنی جان بچانے کی کوشش کی جائے کیونکہ انگریزوں کا قہر کسی وقت بھی محل پر ٹوٹ سکتا ہے۔ محل میں افراتفری کا ماحول تھا۔ جان بچانے کی ناکام کوشش کی جا رہی تھیں۔ شاہ زیب جانتے تھے کہ اس غدر کے ماحول میں اپنے عزیز ایک دوسرے سے بچھڑ جائیں گے۔ زخمی انگریزوں کے دل میں ہمدردی کہاں— لیکن وہ محل سے کسی شاہی نشانی کے بغیر نکلنا نہیں چاہتے تھے اور یہی شاہی گلدان......

محل چھوڑتے ہوئے بس یہ شاہی نشانی کپڑوں کی ایک پوٹلی میں عقیدت کے ساتھ باندھی۔ تنی بیگم کا ہاتھ تھاما اور باہر نکل گئے...... تب تک خبر آ چکی تھی کہ بادشاہ قیدی بنا کر دہلی لائے گئے۔ شہزادوں کو خونی دروازے کے نزدیک گولی ماردی گئی...... اور تینوں شہزادوں کے سرنڈ ھال بادشاہ کے سامنے 'سرخوان پوش' سے ڈھک کر بھجوائے گئے...... اُف یہ ظلم کی انتہا تھی۔'

شفاف آسمان پر بادلوں کے کچھ ٹکڑے اچانک آ گئے تھے۔ اور ان ٹکڑوں نے اچانک چاند کو اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

ابا سونے کی تیاری میں تھے...... 'اور اس کے بعد سے یہ شاہی گلدان'...... وہ بیحد آہستہ سے بولے— 'آخری نشانی...... اسے دیکھ لیتا ہوں تو پھر اپنی بربادی یاد نہیں رہتی۔'

ابا ایک بار پھر ماضی کی گپھاؤں میں چلے گئے۔ اور مجھے دہلی جانے کی تیاری مکمل کرنی تھی۔

تاریخ اور تشریح و توضیح

میں جانتا تھا، ہر عہد اپنے حساب سے تاریخ کی تشریح و توضیح پیش کرتا ہے۔ کبھی وقت اسے خونخوار اور نا قابل برداشت بنا کر پیش کرتا ہے تو کبھی تاریخ کے خوفناک چہرے میں اپنے لیے پانی جیسا ایک شفاف چہرہ بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔ لیکن دہلی جانے کے بعد کے تجربے ماضی کی اس سنہری تاریخ سے اس طرح بھی جڑ سکتے ہیں، مجھے اندازہ نہ تھا۔ اس لیے اس تحریر میں صرف شاہی گلدان کی تاریخ نہیں ہے، بلکہ اس تاریخ سے وابستہ شاخیں بھی ہیں، جنہیں چھوٹی چھوٹی ندیوں کی طرح ایک بڑی تاریخ یعنی سمندر میں سما جانا تھا۔ نہیں، شاید اس طرح آپ اس بات کی حقیقت نہیں سمجھ پائیں گے جو میں کہنے جا رہا ہوں۔ اس لیے تھوڑا ٹھہر ٹھہر کر مجھے ساری تفصیل صاف کرنی پڑے گی۔ دہلی جاتے ہوئے ابا خوش تھے......

''لو تاریخ نے ہمیں ایک موقع اور دیا......؟''

'لال قلعہ پر پرچم کشائی کا یا شاہی قلعے میں اپنا پشتینی تخت تلاش کرنے اور شہنشاہیت کے اعلان کا......؟' میں بہت آہستہ سے بولا تھا۔

•

دہلی کے چار پانچ برسوں کی زندگی میں اپنے لیے ایک خوبصورت 'فلور' حاصل کرنے میں مجھے زیادہ مشکلوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہاں، وہ کہانی آپ شروع میں ہی سن چکے کہ ابا شاہی گلدان کو ڈرائنگ روم میں نشانی بنا کر رکھنے کی ضد کر رہے تھے اور اپنی بات کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب بھی ہوئے تھے۔ صبا کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے سسرال میں خوش تھی۔ فرحین نے گھر کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ ان چار پانچ برسوں کی خوشیوں اور الجھنوں نے کچھ کچھ دہلی وال تو مجھے بنا ہی دیا تھا— اب یہ اشرف جہانگیر بہت حد تک بدلا ہوا، شاید مضبوط ہونے کی حد تک، تاریخ سے آنکھ ملانے کی ہمت کر رہا تھا۔ شروع میں فرحین نے بھی جاب کرنے کا خیال کیا تھا— مگر آرام دہ زندگی کے احساس نے اسے 'جاب' پر گھر کو فوقیت دی تھی—

گھر کے باہر برآمدے میں پھولوں کے گلدستے ایک قطار سے سجے تھے۔ اس دن چھٹی کا دن تھا۔ لیموں کے بونسائی پودے کو لے کر فرحین سے میری تھوڑی سی جھڑپ ہوئی تھی۔

'پاگل ہو، پودا سوکھ جائے گا......'

'نہیں سوکھا تو......؟'

'سوکھ جائے گا......'

'اور نہیں سوکھا تو......؟'

'چلو وقت آنے پر دیکھیں گے۔'

چھٹی کے دن فرحین برآمدے میں آئی۔ پھر تیزی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے برآمدے میں کھینچ لے گئی۔ گلدستے کے پودے میں چھوٹے چھوٹے لیموں کے جاگنے کی پہلی آہٹ مل چکی تھی۔ میں بھونچکا تھا۔ اچانک مجھے یقین نہیں ہوا۔ فرحین ہنسے جا رہی تھی۔ جیسے تاریخ نے اپنے پاؤں پھیلائے۔ جیسے وجود میں برسوں سے سوئی ہوئی شہنشاہیت چپکے سے جاگی۔ میں جو کہہ رہا تھا، شاید مجھے بھی نہیں پتہ تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں...... مذاق ہی سہی...... مگر میرے اندر سے شاید کوئی شکست یافتہ شہنشاہ بول رہا تھا۔

'ہاں، چلو ہار گیا۔ بولو کیا مانگتی ہو۔ چاہو تو آزاد ہو جاؤ۔ طلاق لے لو مجھ سے۔''

'طلاق'— فرحین کانپ گئی۔ اچانک نکلے اس مکالمے سے جیسے ہوا ٹھہر گئی۔ پودے سے جھانکتے ننھی لیموں کی کونپلوں نے جیسے ٹھنڈی ہوا کے خوف سے خود کو ہلکے ہرے پتوں میں چھپا لیا......

'کیا...... کیا بولے تم......؟' فرحین ڈری ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

نہیں، مجھے خود حیرت تھی۔ اس بے تکی بات کا یہاں کوئی مطلب نہیں تھا۔ شاید نیوز چینلوں پر آنے والے مسلسل اس طرح کے مکالموں نے مجھے اس حیران کن لمحہ ایک سنگدل حکمراں میں تبدیل کر دیا تھا۔

تو کیا میرے اندر سچ مچ ایک تانا شاہ چھپا تھا۔ ایک ایسی بات جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ایک ایسی بات جس نے قہقہہ لگاتی فرحین کی آنکھوں میں ایک بھیانک ڈر پیدا کر دیا تھا۔ میں نے شاید تاریخ کی نکلتی شاخوں میں اس بونسائی لیموں سے نکلے یا ٹپک رہے خون کو دیکھ لیا تھا۔

اس رات فرحین کی آنکھیں نم تھیں۔

'تم نے ایسا کیوں کہا، میں نہیں جانتی، مگر کچھ تو ہوگا تمہارے اندر۔ تم بتاؤ نا بتاؤ۔ گھر سے غائب رہتے ہو۔ بڑے آدمی ہو۔ عورتوں کے فون آتے ہیں۔ میٹنگس چلتی ہیں۔ سچ بتاؤ اشرف، ایک سکنڈ کے لیے بھی تمہیں فواد کا خیال نہیں آیا؟'

میں نے دیکھا، فواد بستر پر سو گیا تھا۔

'میں شرمندہ ہوں......'

میں خود سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر آخر تک 'میں شرمندہ ہوں' یہ جملہ میرے ہونٹوں پر نہیں آ سکا۔ آخر ایسا کیا کیا تھا میں نے۔ بس ایک چھوٹا سا مذاق— مذاق میں طلاق کی بات کرنے سے طلاق تھوڑے ہو گئی۔ میاں بیوی میں ایسے مذاق تو ہو ہی سکتے ہیں' مگر جیسے فرحین زخمی تھی۔

شاید وہ اس مذاق پر دیر تک روتی رہی تھی۔ اس کی آنکھیں پھولی ہوئی تھیں۔

'تم نماز کیوں نہیں پڑھتے؟'

'یہ میرا اور خدا کا معاملہ ہے۔'

'نہیں، یہ صرف تمہارا اور خدا کا معاملہ نہیں— فرحین چیخی تھی— اب فواد بھی ہے۔

پانچ سال کا ہوگیا۔ اسے اپنے مذہب کو جاننا ہے — قرآن شریف شروع کرانا ہے۔ کل ابا بھی کہہ رہے تھے اشرف مت بنانا...... فرحین ایک لمحہ کو ٹھہری — ''نماز پڑھتے تو اللہ کا ڈر ہوتا تمہیں۔ پھر اتنی بڑی گالی نہیں دیتے۔ تم کیا جانو، ہم شادی شدہ عورتوں کے لیے طلاق موت سے بھی زیادہ ہے۔ ایک بار پھر وہ بلک بلک کر رو پڑی تھی۔ اور شاید اس بار ایک شکست خوردہ شہنشاہ حقیقت میں تیز آواز میں دہاڑا تھا —

'پاگل ہوگئی ہو تم۔ ایک چھوٹے سے مذاق کو بھی ڈائجسٹ کرنے کی کپیسٹی نہیں ہے تم میں۔ کیا تمہارے سامنے مجھے ہر لفظ کو ناپ تول کر بولنا پڑے گا۔ بس ایک مذاق تھا۔ ایک چھوٹے سے مذاق کا افسانہ بنالیا تم نے۔ چھٹی کا دن مشکل سے ملتا ہے۔ اس چھٹی کے دن کو بھی عذاب بنا دیا تم نے......'

میں اتنے زور سے چیخا تھا کہ شاید لال قلعہ کے بجھے ہوئے کلسوں تک میری آواز گونج گئی ہو۔ فوادا اٹھ کر رونے لگا تھا۔ میں دل کا غبار نکال کر نیچے ڈرائنگ روم میں آیا تو اچانک نگاہ، اس شاہی گلدان کی طرف چلی گئی۔ لگا، اس گلدان سے سچ مچ ایک رشتہ رہا ہے میرا — ایک ایسا رشتہ شاید جسے میں جان رہا تھا — لیکن میں نے جان بوجھ کر اپنے آپ سے چھپانے کی کوشش کی تھی۔

مجھے احساس تھا۔ کمرے سے ابا کی خاموش آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ اور شاید ان کے پیچھے اماں بھی ہوں گی۔ بے نور آنکھوں والی اماں...... شاید یہ میرے لیے تبصرے یا مکالمے کا وقت تھا — تو کیا آج جو کچھ بھی ہوا وہ اس شاہی گلدستے سے جڑی تاریخ کی نئی تشریح و توضیح تھی......؟ میں جس طرح فرحین پر چلایا تھا، یا جس طرح ایک کمزور لمحے حیوانیت یا درندگی مجھ پر سوار ہوئی، وہ شاید اس سے پہلے مجھ پر کبھی نہیں حاوی ہوئی تھی......؟ کیا میرے اندر کے لہو میں سوئے ہوئے حکمراں یا تاناشاہ نے کوئی کروٹ لی تھی۔ یا پھر یہ ایک عام سی بات تھی — ایک ایسی کہانی جو گھر گھر میں روز دہرائی جاتی ہے۔ لیکن شاید میرے اب تک کے 'بی ہیویر' کے خلاف — اور مجھے فرحین کو اس بات کا احساس کرانا تھا کہ بونسائی لیموں والے واقعہ کے ساتھ میں نے جو کچھ بھی کہا' وہ صرف ایک چھوٹا سا مذاق تھا۔ اور شاید اسے مذاق ثابت کرنے کے لیے دو تین بار، ایک بار تو، ایک بیحد رومانی لمحہ فرحین کو بازوؤں میں بھرتے ہوئے، بوسہ لیتے ہوئے، میں نے اس سے کہا — تو تم مجھ سے طلاق کیوں نہیں لے لیتی۔ اور اتنا کہہ کر میں زور زور سے ہنسا تھا — دیکھا، کیسے ڈر گئی۔ ارے...... ایسے طلاق تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ جسٹ کڈنگ، لیکن تمہارا چہرہ اتنا پھیکا

کیوں پڑ جاتا ہے......'

مگر شاید مجھے یہ علم نہیں تھا کہ کبھی کبھی تاریخ اپنی ہی تشریح وتوضیح میں اس قدر سخت ہو جاتی ہے کہ دو زندگیاں داؤ پر لگ جاتی ہیں۔

فتوے کی سیاست

میں دہلی کی جس کمپنی میں، 'ون آف دڈائریکٹرس' میں تھا، اس کا نام میکلارڈ کمپنی ہے۔ میکلارڈ نے صابن، تیل سے لے کر باسمتی چاول تک کے پراڈکٹ مارکیٹ میں اتارے تھے۔ اور کچھ ہی برسوں میں میکلارڈ گروپ ہر گھر کی پہلی پسند کے طور پر جانا جانے لگا تھا۔ میرے ذمے ان دنوں فارین ڈیلی گیٹس کو انٹرٹین کرنے سے لے کر نئے پروڈکٹ پر ایڈ فلم بنانے تک کی ذمے داری شامل تھی۔ ایسی ہی ایک ایڈ فلم کے لیے میں نے بالی وڈ کے ایک بڑے اور قیمتی ڈائرکٹر کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ڈائرکٹر نے بجٹ اور تھوڑی بہت صلاح کے بعد ایڈ کے لیے کرکٹ کی دنیا کے ایک کھلاڑی کی خدمات لی تھیں۔ اس کھلاڑی کا اب تک کوئی ایڈ کسی چینل پر نہیں آیا تھا۔ اور شاید یہیں سے میری بدقسمتی یا ستاروں کی گردش کی کہانی بھی شروع ہوئی تھی۔ ایڈ فائنل ہوا۔ بجٹ فائنانس سے ہو کر میرے پاس آیا اور میرے سائن کے بعد ڈائرکٹر نے دس سے چالیس سکنڈ تک کی تین تین فلمیں تیار کرلیں۔ فلمیں اچھی بنی تھیں۔ لیکن بدقسمتی کی کہانی کی شروعات بھی یہیں سے ہوئی۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس کے پینل کو کھلاڑی پر ایک سنجیدہ اعتراض تھا کیونکہ کھلاڑی کے ڈرگس لینے اور بیوی کو مارنے کی کہانی کچھ ہی دنوں پہلے نیوز چینلوں پر ہائی لائٹ ہوئی تھی۔ بورڈ آف ڈائرکٹرس کا خیال تھا کہ ایڈ آتے ہی ہندستانی خاندان اس اشتہار کی مخالفت کرے گا نتیجہ پروڈکٹ فلاپ کیونکہ ہمارا پروڈکٹ، گھر گھر کا پراڈکٹ کہلاتا ہے۔ یہ معاملہ اتنا طویل ہوا کہ سارے بورڈ ڈائرکٹرس میری مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔ دوسری جانب اکیلا میں تھا۔ اور یہی وہ دن تھے' جب فرحین کی ناراضگی کی کہانی بھی شروع ہوئی تھی۔ برآمدے میں بونسائی لیموں کے پودے پر تو شباب آ گیا تھا، مگر ہماری گرہستی کو جیسے نظر لگ گئی تھی۔ میری خواہش ہوتی تھی کہ رات کو واپس آؤں تو فرحین سے باتیں کروں مگر فرحین کی ناراضگی کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ گھر آ کر جیسے میرا بلڈ پریشر ایک دم سے بڑھ جاتا۔ میں آفس سے گھر لوٹتے ہوئے سکون اور شانتی کی امید لے کر آتا تھا، لیکن فرحین کی موجودگی اب مجھے چڑ چڑا کرنے لگی تھی۔ جیسے اس کی حرکت پر گھر

آنے کے بعد میرے اندر بیٹھا جانور خاموشی سے مجھے بتاتا رہتا کہ ان سب کی ذمے دار کوئی اور نہیں فرحین ہے اور جیسے اس وقت میرا دماغ آگ کے شعلوں کی طرح جلنے لگتا۔ میں امید کر رہا تھا کہ ان حالات میں مجھے بیوی کی مدد ملے گی، حوصلہ ملے گا مگر مدد اور حوصلہ دور ہمارے چھوٹے سے مذاق کو جیسے فرحین نے اپنی نہ ختم ہونے والی ناراضگی سے جوڑ لیا تھا۔ میرے ساتھ مشکل یہ تھی کہ آفس میں چلنے والی سازش یا مخالفت پر گھر میں کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اور اس رات...... شاید اندر دبا لاوا آتش فشاں بن گیا تھا۔ ایک بار پھر ایڈ فلم کو لے کر بورڈ آف ڈائرکٹرس کی میٹنگ ہوئی۔ شاید زندگی میں، میں اتنا ہیوملیٹ، کبھی نہیں ہوا تھا...... میں گھر آیا تو میرا دماغ سوچنے سمجھنے سے انکار کر چکا تھا۔ ایک فائل کی تلاش میں فرحین سے میری جھڑپ ہو گئی۔ مجھے نہیں پتہ میں غصے میں کیا کیا بولتا رہا۔ میری آنکھیں لال تھیں۔ لوٹتے ہوئے میں نے شراب کے دو پیگ بھی لیے تھے۔ کچھ اس کا بھی اثر تھا۔ میں زور زور سے چلاّ رہا تھا۔

''کیوں میری جان کی دشمن بنی ہو تم۔ مجھے چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔ آئی ہیٹ یو۔ میری زندگی کو دوزخ بنا کر رکھ چھوڑا ہے تم نے۔ اور میں پورے ہوش و حواس میں تمہیں...... طلاق دیتا ہوں...... طلاق...... طلاق...... طلاق۔''

جیسے ہوا رک گئی۔

وقت رک گیا۔

بالکل فلمی منظر...... فرحین کا چہرہ سفید پڑ گیا — آنسو پلکوں سے زار و قطار گر رہے تھے — اچانک آواز آئی۔

''قریشہ، دلہن کو اپنے ساتھ کمرے میں لے جاؤ'' میں مڑا۔ دروازے پر ابا غصے سے آگ بگولہ کھڑے تھے۔ اماں کا چہرہ فق تھا۔

'اگر مولویوں کے حساب سے یہ طلاق جائز ہے تو دلہن اسی لمحے سے تم پر حرام ہوئی۔'' رات کافی ہو گئی ہے۔ اب صبح مسجد میں جا کر اس پر فتویٰ لینا پڑے گا۔'

ابا کا چہرہ سخت تھا۔ 'مذہب سے کوئی سمجھوتہ نہیں۔'

جب تک مجھے کچھ سمجھ میں آتا، اماں فرحین کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے میں جا چکی تھیں — اور اماں کے کمرے سے فواد کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

●

تنہا کمرہ جیسے کچھ دیر پہلے آئے 'زلزلے' کا گواہ بن گیا تھا۔ غصے کے عالم میں دیئے گئے طلاق کے دو دو گواہ اماں اور ابا کی شکل میں موجود تھے۔ اور میں جانتا تھا، ابا چاہے تیمور یہ سلطنت کے زوال کی علامت یا نشانی کے طور پر ہوں لیکن مذہب کے معاملے میں میں وہ کسی کٹر سلطان سے کم نہیں۔ کمرے میں سگریٹ کا دھواں پھیل رہا تھا۔ خالی بستر مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ آج ساری رات مجھے اسی خالی بستر پر گزارنی تھی۔ اور اس کے بعد جو ہنگامے شروع ہونے والے تھے، میں نے اس کا اندازہ لگانا شروع کر دیا تھا۔ آفس کی پریشانیاں ہی کم نہیں تھیں، اور اب میں اپنی ہی نادانی سے ایک اور پریشانی کو جنم دے چکا تھا۔

صبح ہوگئی۔

ابا مذہبی معاملوں میں اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہیں لے سکتے تھے۔ فرحین کا سامان میرے کمرے سے اماں کے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ میں نے بیماری کا بہانا بنا کر آفس سے چھٹی کر لی تھی۔ آنکھیں فرحین کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ معصوم سی شرمیلی لڑکی، چھپ چھپ کر اسے دیکھنے والی۔ میری آہٹ پا کر آنچل کا کونا دانتوں سے دبا لینے والی...... ایک بار پھر تاریخ زندہ تھی اور وقت کے ساتھ اپنی بوسیدگی اور افسردگی کی تشریح و توضیح کر رہی تھی۔

دس بجے ابا مسجد گئے۔ اور آدھے گھنٹے میں ہی مسجد کے 'مولی صاحب' اور دو اماموں کو لے کر آگئے۔ مجھے بلایا گیا۔ ڈرائنگ روم میں ابا سمیت ان تین اماموں کی موجودگی کے باوجود خطرناک حد تک سناٹا پسرا تھا — جیسے یہ امام یا مولوی کسی گھریلو جھگڑے کو سلجھانے نہیں بلکہ کسی کی میت میں آئے ہوں

'......آپ نے بہت اچھا کیا، جو ہمیں خبر کی۔ خوشی ہے، اسلام زندہ ہے، اسلام دراصل ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نظر رکھتا ہے۔'

ابا الجھن میں تھے — 'لیکن کیا کیا جائے؟ فتویٰ کیا کہتا ہے، شریعت کیا کہتی ہے؟'

چشمہ لگائے سفید داڑھی والے امام فرقان کو میں پہچانتا تھا۔ ورنہ بڑے شہروں میں جان پہچان کے موقع ہی کیا ملتے ہیں۔ اتفاق سے پڑوس میں مسجد نہ ہوتی اور مسجد کو ابا نے آباد نہ کیا ہوتا، تو ممکن تھا، یہ معاملہ اتنا آگے بڑھتا بھی نہیں۔ لیکن اب یہ معاملہ گھریلو نہیں تھا۔ مذہب کا معاملہ تھا، اور گواہی میں ابا اور امی بھی شامل تھے۔

'لڑائیاں پہلے بھی ہوئیں؟'

'ہاں۔'

'لیکن اس بار تین طلاق...... بڑی بی بھی اس واقعہ کی گواہ ہیں؟'

'ہاں۔' ابا کا لہجہ سہما ہوا تھا۔

'یہاں تو یہ معاملہ مسلک سے بھی جڑا ہے۔ آپ کو تو پتہ ہے بریلویوں کے گاؤں میں، دارالعلوم کے مولوی نے نماز جنازہ پڑھا دی تو کیا فتویٰ آیا——؟

مولوی صاحب کو یہ بات بری لگی تھی—— 'ہاں یاد ہے، ایک بریلوی مولانا کا فتویٰ آیا کہ جو لوگ نماز جنازہ میں شامل تھے' ان کی بیویوں کا نکاح حرام ہے۔ پتہ ہے ایسے فتوے دین کا رتبہ گراتے ہیں۔ مذہب کو بدنام کرتے ہیں''

دوسرے امام بولے—— وہ غصے میں تھے۔ 'ایسا آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ بات مسلک کی ہے تو بریلوی مولانا نے کوئی غلط فتویٰ نہیں دیا۔'

کمرے میں شاہی گلدان اپنے نکمے پن کی کہانی سناتا ہوا خاموش تھا—— میری نگاہ اس طرف گئی پھر جھک گئی۔ تینوں مولانا فتوے کو لے کر الجھ گئے تھے۔ ابا نے بیچ بچاؤ کیا۔

'ارے بھائی...... ہم نے بیٹے کو بلایا ہے۔ اس نے غصے میں طلاق دی۔ اب کرنا کیا ہے؟'

'آپ کا مسلک'...... امام صاحب مسکرائے۔

'مسلک نہیں جانتا۔ نماز پڑھتا ہوں۔ سب کا احترام کرتا ہوں۔'

'لو، مسلک نہیں تو پھر کس کا فتویٰ مانیں گے۔ بریلویوں کا یا دیوبندیوں کا؟'

'اسلام کا—— ' ابا ناراض تھے—— 'قرآن پاک کیا کہتا ہے، حدیث کیا کہتی ہے۔ غصے میں طلاق ہوئی یا نہیں؟'

'طلاق کی پہلی ادائیگی غصے کی ہوتی ہے۔ باقی دو ادائیگی کے درمیان آپ کے سوچنے کی پوری گنجائش رہتی ہے' اسی لیے منہ سے تین بار طلاق، طلاق، طلاق نکالنے کا چلن ہے......'

'کیوں میاں، اس سے پہلے بھی کبھی بیوی کو غصے میں طلاق دینے کی نوبت آئی؟ میرا مطلب ہے منہ سے تین بار بولنے کی نوبت'...... اب تیر میری طرف تھے۔

دوسرے امام صاحب نے بھی دریافت کیا...... 'کبھی اس سے پہلے غصے میں طلاق......؟'

میں نے بات درمیان میں کاٹی—— 'غصے میں نہیں مذاق میں۔'

'مذاق—؟' آنکھیں بند کیے مولانا ابرار جھٹکے میں اٹھ کر بیٹھ گئے— 'یعنی طلاق مذاق میں بھی دیا جاتا ہے—؟ امام صاحب ابا کی طرف مخاطب ہوئے...... 'نوجوانوں نے مذہب کو بھی مذاق بنا رکھا ہے۔'

'یعنی مذاق میں کتنی بار......' امام صاحب جیسے پیچھے پڑ گئے تھے۔

'شاید دو بار......'

'یعنی کل رات ملا کر تین بار......'

اس بار سفید داڑھی والے امام نے ابا کی طرف دیکھا۔ بھائی میں تو یہی جانتا ہوں کہ ایک ساتھ تین طلاق کہنے سے بھی طلاق ہو جاتی ہے۔

'اور انہوں نے تو تین بار......'

'لیکن دو بار مذاق میں—' مولی صاحب ٹھہرے— 'کوئی شخص تین بار طلاق دے تو بیوی سے اس کا تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ اب اس سے نکاح کی صورت صرف یہ ہے کہ کسی دوسرے شخص سے اس عورت کے نکاح کے بعد پھر طلاق ہو جائے اور دونوں نکاح کے لیے تیار ہوں......'

سامنے کارنس پر دیکھا شاہی گلدان جیسے مسکرا رہا تھا۔ میرے کان کے پردے پھٹ رہے تھے— مولانا، امام صاحب اور ابا کی گفتگوئیں کہاں کس مقام تک پہنچیں، میں نہیں جانتا— لیکن شاید اب میں آگے کچھ بھی نہیں سن رہا تھا...... دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ صرف آدھے ادھورے سے کچھ لفظ میرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ عدّت، دوسرا نکاح— پھر طلاق۔ قرآن شریف اور حدیث کے کوٹیشنس...... شاید ابا بتا رہے تھے کہ وہ کسی مسلک کو تو نہیں، لیکن دیوبندیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

اور بڑے امام نے اٹھتے ہوئے کہا تھا— پھر دیوبند سے فتویٰ لیا جائے گا۔ آپ گھبرائیں نہیں، لیکن دلہن پر اب عدت لازم ہے۔ کیونکہ یہ شرعی معاملہ ہے......

سب چلے گئے۔

ڈرائنگ روم میں اب کوئی نہیں۔ میں اکیلا ہوں۔ شاید ہمیشہ سے اکیلا رہا ہوں۔ میری نسیں پھٹ رہی ہیں۔ اپنی زندگی جینے کے لیے بھی مجھے مذہب کے فتوی کی ضرورت پڑ گئی ہے— کہاں ہوں میں۔ کہاں کھڑا— میری اپنی آزادی کہاں ہے؟ انسانی زندگی کو مذہب کے فتوؤں

سے آزاد کیوں نہیں کیا جاتا......

میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ لگا، اپنے پشتینی مکان میں ہوں۔ گھومتی چمگادڑیں — دیوار پر دوڑتی چھپکلیاں، ٹوٹتی محرابیں، بے رنگ و روغن دیواریں...... میں ایک بار پھر ماضی کی گپھاؤں میں تھا...... گپھا میں پھیلے ہوئے خوفناک سانپ...... تاریخ چہرہ کہاں بدلتی ہے۔ لوٹ گھوم کر وہیں آجاتی ہے۔ شاید، ہاں...... تشریح و تعریف بدلتی رہتی ہیں۔ کسی فیصلے میں پہنچنے تک میں نے ڈرائنگ روم میں رکھے شاہی گلدان کو اس بار نظر اٹھا کر دیکھا اور ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

اور آخر میں فیصلہ

Give me a theme

The little poet cried

'And I will do my part

'T is not a theme, u need

The world replied

You need a heart.

مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے — شاید اسی لئے تاریخ مجھے بد ہیئت اور بد صورت لگتی ہے — شاید اسی لیے میں نے خود کو حال کی سرنگوں کو سونپ دیا ہے۔ اپنی تمام تر آزادی کے احساس کے ساتھ — میں کچھ بھی پسند کروں — ایک بنجر زمین — خزاں کا موسم، میری گمنامی میری اپنی ہو — میرا لہجہ، میری فکر اور میرے فیصلوں پر میری اپنی مہر ہو — میں کچھ بھی پسند کروں — بچوں کو — پھولوں کو یا عورت — جنگلی اور قبائلی تہذیب سے الگ — سفید سیاہ اور نفرت کے بادلوں سے الگ — میرا راستہ' میرا اپنا راستہ ہو —

لیکن — زندگی کے ایسے ہر گوشہ، ہر راستے میں مذہب کیوں آجاتا ہے؟ اس لیے مجھے دنیا کا یہ جواب منظور ہے — کہ تمہیں ایک دل کی ضرورت ہے — ایک دھڑکتے انسانی دل کی — اور اس دل پر کوئی روک کوئی بندش نہیں ہے —

اور اسی لیے اب ضرورت تھی کہ جو فیصلہ میں نے تمام تر غور و فکر کے بعد کر لیا ہے، اسے گھر کے لوگوں کے سامنے بھی رکھا جائے۔ مجھے علم تھا کہ مذہب کی نہ نظر آنے والی شاخیں میرے

گھر میں دراڑ ڈال سکتی ہیں۔ مگر میں نے سب کچھ سوچ لیا تھا۔ شام تک کتنی ہی بار میں فرحین کا چہرہ دیکھنے کے لیے ترس گیا۔ ابا مغرب کی نماز کے بعد لوٹے تو میں اماں کے کمرے سے فرحین کا ہاتھ تھامے ڈرائنگ روم میں لے آیا — فواد، فرحین کی گود میں تھا — فرحین کا چہرہ ایک ہی دن میں کسی بے جان بت میں تبدیل ہو گیا تھا۔

میں نے نگاہیں اٹھائیں۔ ابا کی طرف دیکھا — قدرے ٹھہر کر اماں کی طرف۔ پھر آگے بڑھا — شاہی گلدان کو ہاتھوں میں اٹھایا اور اسے زمین پر زور سے دے مارا۔

'سنیے ابا۔ اب ہم سلطان نہیں ہیں۔ عام آدمی ہیں۔ سلطان ہونے کی نشانی ٹوٹ چکی ہے — 'میں ذرا زور سے بولا — اور یہ عام آدمی کا فتویٰ ہے...... 'میں نے فرحین کا ہاتھ تھام لیا — مجھے فرحین کے ساتھ رہنے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ آپ کا فتویٰ بھی نہیں۔'

میری آواز بلند تھی — 'آپ کا مذہب بھی نہیں —'

میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ ابا شاہی نشانی کے ٹوٹنے سے زیادہ زخمی ہوئے تھے یا مذہب کی پیروی نہ کیے جانے سے۔ لیکن ابھی ایک ردّعمل باقی تھا — بیڈ روم میں داخل ہونے کے بعد، میرا ہاتھ چھڑا کر فرحین نے تلخ لہجے میں دریافت کیا تھا — 'شاہی گلدان توڑنے کی کیا ضرورت تھی — ؟'

لیکن اس کے بعد کے لفظ کسی دھماکے سے کم نہیں تھے — 'فیصلہ تم نے اکیلے کیسے کر لیا۔ مجھ سے نہیں پوچھا — کہ میں شریعت کو مانتی ہوں یا نہیں؟'

میں ایک بار پھر سناٹے میں تھا۔ یا ایک بار پھر شاہی گلدان کے ٹوٹنے کے باوجود میرے اندر کوئی سویا ہوا شہنشاہ بیدار ہو گیا تھا۔

مجھے احساس ہوا، بونسائی نیبو کے پیڑ کا قد ذرا سا اور بڑھ گیا ہو —

●❖●

وارن ہسٹنگز کی ٹوپی

ٹوپی کی قسمت ایسے بھی کھل سکتی ہے، محمد علی بھائی نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ چھوٹی بڑی ،ترچھی، دوپلی، فیروز آبادی، حیدر آبادی، لکھنوی، ملتانی، مولانا ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اسٹائل ٹوپیوں کی اتنی بڑی کوئی 'ڈیل' بھی ہو سکتی ہے، محمد علی بھائی کے لئے ایسا سوچنا عرش پر اڑنے کے برابر تھا۔ وہ تو صبح سے شام تک رنگین، ریشمی، مخملی، ملائم، چکور، گول اور ولایت علی خاں والی ٹوپیوں کا مول تول کرتے گزار دیتے تھے ___ دور کہاں، یہیں اپنے دلّی کے نظام الدین میں ___ بستی حضرت نظام الدین۔ سنا ہے پڑوس میں کوئی بہت بڑے شاعر بھی تھے۔ غالب نام تھا۔ ارے وہی غالب اکیڈمی والے غالب۔ جہاں ٹھیلا لگاتے ہیں، وہی تو ان کا گھر ہے ___ گھر نہیں دکان ___ یا جو بھی ہو، محمد علی بھائی صبح سے شام تک اس لئے بھی پریشان رہتے ہیں کہ ہر آنے والا نیا مسافر بس اُسی کے ٹھیلے کے پاس آ کر پوچھتا ہے ___

'غالب اکیڈمی جانتے ہو؟'

اب کیا ___ وہ چیخیں یا چلاّئیں کہ بھیاّ، جہاں کھڑے ہو وہی تو ہے اُن کی دکان۔ پتہ نہیں اس دکان مکان میں یا جو بھی کہہ لیں، صبح سے کیا کیا ہوتا ہے کہ لوگ بس جوق در جوق چلے ہی آتے ہیں۔ جیسے اور کوئی کام ہی نہیں۔ کتنے ہی لوگ اس کی دکان پر آ کر دریافت کرنے کے بعد، جیسے اُسے پریشان کرنے پر آمادہ ہو جاتے ___

___ نہیں جانتے؟

نہیں ___

___ غالب کو نہیں جانتے؟

نہیں—

___ ہوگا کوئی ایسا جو کہ غالب کو نہ جانے؟

میں نہیں جانتا، بس۔

___ پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہیں؟

تم ہی بتلاؤ کے ہم بتلائیں کیا

___ یعنی کوئی مسلمان غالب کو نہیں جانے؟

'اے بھائی اس کو مسلمان مت کہئے' ___ بتانے والوں نے محمد علی بھائی کو بتایا تھا ___ نہیں جانتے کیا۔ شاعر تھا ___ کوٹھے پر جاتا تھا ___ شراب پیتا تھا۔

'توبہ توبہ'......

محمد علی بھائی کی آنکھوں میں غالب، ان کے خاندان، بلکہ خاندان در خاندان کے لئے ڈھیر ساری نفرت جمع ہو جاتی۔

___ روزے نہیں رکھتا تھا

اچھا

___ نماز بھی نہیں پڑھتا تھا

اچھا

___ پھر تو ٹوپی بھی نہیں پہنتا ہوگا؟

نہیں ___ یہی تو ___ غزلوں کی طرح اُس کی ٹوپی بھی مشہور ہے۔ غالب کی بڑی سی ٹوپی ___ بابل کے ٹیڑھے مینار کی طرح دور تک جانے کے بعد ذرا سی جھک گئی ___ ٹوپی کے اوپر کے حصہ میں پیوند لگی ہوئی ___ کپڑے کا بالشت بھر حصہ۔ مخملی ٹوپی ___ کچھ لوگ اس کے ٹھیلے کے پاس آکر پوچھتے بھی تھے ___

غالب ٹوپی ہے؟

نہیں

'کمال ہے، غالب اکیڈمی کے پاس ٹوپی بیچتے ہو اور غالب ٹوپی نہیں رکھتے۔ بھائی کمال ہے۔'

کمال تو بس پوچھنے والے کی نظر میں ہوتا___ یعنی، ہوگا کوئی ایسا جو کہ غالب کو نہ جانے — محمد علی بھائی بدلی ہوئی سیاست کی فارسی نہیں جانتے تھے۔ مگر غالب کو مسلمان کہنے کے نام پر ان کے تن بدن میں آگ لگ جاتی___ شرابی اور مسلمان۔ ہونہہ۔ سنا ہے ڈومنی کے کوٹھے پر جاتا تھا۔ فرنگیوں کے لئے شاعری کرتا تھا۔ ان ہی گلیوں میں گھومتا ہوگا کل۔ نہیں۔ کسی نے بتایا___ وہ تو گلی قاسم جان میں رہتے تھے___ یہاں سے کیا واسطہ___ پھر یہاں کاہے کو آگئے___؟ دکان کھلوادی اور وہ مزار تو دیکھئے___ یہاں مزار بھی بنوالیا___ لیکن کیا ہوا بھائی اتنا بڑا مزار اتنی جگہ گھیر لی۔ مگر باہر سے تالہ بند۔ دروازے پر کتے لوٹتے ہیں یا صاحب جان فقیر دو چار کتوں کو کسی محبوب کی طرح اپنے سینے سے چمٹائے 24 گھنٹہ سوتا رہتا ہے۔

''یہی ہوتا ہے مذہب سے پھرنے کا انجام۔ ارے انہی مسلمانوں نے تو ......اور شراب پئیں۔''

محمد علی بھائی کو غالب کا ذکر گوارا نہ تھا۔ کچھ پیارا تھا، تو اپنے محبوب کا تذکرہ___ محبوبِ اولیا یعنی درگاہ حضرت نظام الدین۔ ایک قطار سے پھول والے___ چھوٹی چھوٹی اِن تنگ گلیوں میں محبوب اولیاء کی برکت ہے۔ چھوٹے چھوٹے ہوٹل تو دیکھ لیجئے۔ ہزاروں کی تعداد میں بھوکے، لاچار، غریب، فقیر۔ پانچ پانچ روپے میں کھانا کھلائیے۔ باہر سے آنے والا آدمی محمد علی بھائی کی دکان پر بھی رکتا ہے۔ ٹوپی کی قیمت پوچھتا ہے۔

'کتنے کی ہے؟'

'توبہ توبہ......'سرمے' والی آنکھیں اور زیادہ ندی جتنی گہری ہو جاتیں___ 'کیا بولتے آپ۔ ٹوپی کی قیمت نہیں ہوتی...... ہدیہ ہوتا ہے۔ ہدیہ......

'جو مرضی ہدیہ دے دیں۔'

محمد علی بھائی جانتے تھے، ہدیہ کے نام پر دینے والا دو چار پیسے زیادہ ہی دے جائے گا۔ کبھی کم نہیں دے گا___ اب بھلا قرآن پاک، تسبیح اور ٹوپی جیسی پاک چیزوں کی خرید پر مول تول کرنے کی ہمت کون کرے گا___ اللہ کا کلام۔ اللہ کے گھر میں باادب جانے کے لئے ایک ٹوپی ہی تو احترام کا واحد ذریعہ ہے۔ بچپن میں ابا بھی کہتے تھے___ مسجد میں سر ڈھک کر جانا چاہئے۔

'کیوں؟'

'فرشتے ہوتے ہیں۔ مقدس گھر ہے اس لئے۔'
'نہیں پہنی تو؟'
'شیطان سر پر تھپڑ مارتے ہیں۔'
ہوss ہوss محمد علی بھائی کو ہنسی آتی ہے۔ ایک وہ دن اور ایک یہ ___ ٹوپی کی عزت اور دبدبہ جو دل میں قائم ہوا، سو آج تک ہے ___

ٹوپی کو آنکھوں سے چومتے ہیں۔ ریشمی، دوپلی، ترچھی، بچوں کی، روئی جیسی ملائم ٹوپیاں ___ ہاں تو۔ ذکر چلا تھا، ڈومنی کے کوٹھے پر جانے والے غالب کا۔ شراب پینے والے غالب کا اور تقدیر تو دیکھئے۔ جگہ ملی تو کہاں۔ یہاں محبوب اولیاء کے آستانہ کے قریب ___ عرس کے دنوں میں یہاں ٹھیلا لگانا بھی مشکل ہو جاتا۔ جوق در جوق آدمی ہی آدمی ___ محبوب اولیاء کے آستانہ پر قوال اپنے اپنے راگ الاپ رہے ہیں۔
'بھر دے جھولی مری یا محمد
لوٹ کر پھر میں جاؤں نہ خالی......'
وہ ٹھیلے کو غالب کے مزار والی گلی کے کنارے لگا کر، کپڑے سے برابر کر، محبوب اولیاء کے در پر دستک دینے پہنچ جاتا۔ کسی نے بتایا تھا۔ یہیں علامہ اقبال کی دعا بھی قبول ہوئی تھی۔ کہتے ہیں اقبال نے سات برسوں تک کچھ بھی نہیں لکھا۔ آستانے میں حاضری دی اور یہ شعر پڑھا ___

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو، وہ نام ہے تیرا
مسیح وخضر سے اونچا مقام ہے تیرا ss

'اب دیکھئے اقبال کہاں ہیں ___ شاعر مشرق کہا جاتا ہے ___ کسی نے بتایا تھا، علامہ کا مزار تو لاہور میں ہے ___ یہی تو غلط ہے۔ علامہ کو یہاں ہونا چاہئے تھا۔ یہاں تو بیکار غالب کو بھیج دیا۔ شرابی کہیں کا۔'
محمد علی بھائی کو اقبال پسند تھے...... پسند ہی نہیں تھے، بہت پسند تھے۔ وہ کہتے بھی تھے ___ ارے غالب کی کا بات کرتے ہو۔ شاعر تھے تو اقبال۔ ایک کیا۔ دس سنادوں اشعار۔ ابھی اسی وقت۔ مسلمانوں کے تھے۔ اپنے تھے اور یہ غالب۔ لیکن دقت یہی تھی۔ کبھی کبھی لوگ غالب ٹوپی تو پوچھنے چلے آیا کرتے، اقبال ٹوپی پوچھنے کوئی نہیں آتا تھا۔

یہ پوری بستی ہی محمد علی بھائی کو اللہ کی سوغات لگتی تھی۔ نور سے جھلمل ___ چاروں طرف جیسے نور ہی نور پھیلا ہو۔ ایک قطار سے پھول والوں کی سیر ___ اور ٹھیک اُن سے چار قدم، آنکھوں کے فاصلے پر تبلیغی جماعت والوں کا دفتر ___ دفتر کیا تھا، مسجد کہیے۔ مسجد کیا، سب کے لئے ایک آشیانہ ___ دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔ سوڈانی، چینی، افریقی، امریکی اور پتا نہیں کہاں کہاں سے ___ چہرے الگ، رنگ الگ، زبان الگ۔ لیکن کام ایک۔ مشن ایک۔ اسلام کی تبلیغ۔

تب اُس نے شروع شروع یہاں ٹھیلا لگانا شروع کیا تھا۔ ٹوپی خریدنے آئے بہت سے لوگوں کو تو وہ پہچان بھی نہیں پاتا تھا ___ کہ کیا، یہ بھی مسلمان ___ کمال ہے۔ یہ بھی ___ یہ کالا بھجنگ ___ یہ بھی۔ یہ افریقی بھی۔ یہ چینی بھیا بھی ___ سب کو ٹوپیاں دیتے دیتے ایک دن وہ مسجد میں چلا گیا۔ اُف۔ چاروں طرف نور کی بارش۔ اُس سے کہا گیا ___

''وہ چلّا میں چلے۔ چالیس دنوں تک۔ نہیں تو چوبیس دن۔ نہیں تو اپنے شہر میں ہی تین دن کا وقت نکالے۔ آزاد اپارٹمنٹ سے تاج اپارٹمنٹ۔ گھر گھر گھومنا ہے۔ نماز پڑھنے کی تبلیغ کرنی ہے۔''

'سبحان اللہ...... سبحان اللہ'

محمد علی بھائی ہر بات پر سبحان اللہ کہتے ہیں۔ تبھی سے یہ عادت پڑی ہے۔ چلّہ میں جانے لگے تو جیسے گھر والوں کو بھولنے لگے۔ ابا تو جا ہی چکے تھے۔ مرشد آباد میں انتقال ہوا ___ اور وہ اپنے بھائی مشتاق کے ساتھ یہاں خوریجی، دہلی میں آ کر بس گئے ___ زیادہ دنوں تک غائب رہنے لگے تو بیوی نے طوفان اُٹھا دیا ___

'گھر کی سوچو۔ دو دو بچے ہیں۔'

'تو......'

'بچہ مدرسہ جانے لگا ہے۔'

'اچھی بات ہے۔' سرمہ لگی آنکھوں میں 'خاندانی جنون' پیدا ہوا ___ 'عیاشی میں جاتا ہوں کیا۔ مذہب کے کام سے جاتا ہوں۔'

'اور گھر؟'

'بتایا تھانا۔ پہلے خلیفہ نے کیا کیا تھا۔ پیارے نبیؐ کے لئے گھر میں کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ محمد علی بھائی کو، جاہل بیوی کو پیٹنے کی خواہش ہوئی۔ مذہب کے کام پر بندش لگاتی ہے۔ مگر کیا کرتے۔ جب آس پاس والوں کے 'مشورے' بڑھے کہ بھائی اولاد والے ہو، اور پھر بزنس بھی ٹھپ...... پڑ رہا ہے...... تو ذرا سی آنکھ کھلی اور 'چلّے' میں جانا کم کر دیا۔ بند نہیں کیا۔ بڑا بھائی مشتاق اُن دنوں 'ڈرائیوری' کرنے لگا تھا۔ دو ایک بار شیخ اور ایک 'عرب' کی صحبت میں دوسرے ملک جا چکا تھا۔ اس لئے محمد علی بھائی بھی ڈرائیونگ سیکھ چکے تھے۔ اس درمیان سعودی عرب سے تبلیغ میں آئے شیخ یاسر سے اُن کا سامنا ہوا تھا۔ تبلیغ کے لئے حیدر آباد گئے۔ وہاں سترہ سال کی ایک دلہن پسند آگئی۔ غریب باپ کو بیٹی کی قیمت چکائی___ واپسی میں بستی نظام الدین آئے۔ محمد علی بھائی سے ملے تو دل کی بات ہونٹوں پر آگئی۔

'ہمارے ساتھ چلو گے؟'

'کیوں نہیں؟'

'ویزا بنا ہوا ہے۔'

'بالکل ہے۔'

ڈرتے ڈرتے محمد علی بھائی نے پوچھا۔ 'عمرہ (آدھا حج) تو کر سکوں گا نا؟'

'عمرہ کیوں۔ حج کیوں نہیں___؟'

محمد علی بھائی لاجواب ہو گئے۔ مکہ مدینہ کے پُرنور نظارے آنکھوں میں گشت کرنے لگے___ بیوی بچوں کو، پیسے کے لئے تسلی دی___ اور خود نکل گئے، اللہ میاں کی نگریا___ خانہ کعبہ۔ اللہ میاں کا گھر ہی تو ہے___ عمرہ کیا۔ حج بھی کر آئے اور دو سال میں ہی شیخ کی نوکری بھی چھوڑ کر آگئے۔

محمد علی بھائی لوٹ تو آئے لیکن تجارت اور بزنس کے ''دو اور دو، دو سو'' کے پہاڑے سیکھ چکے تھے___ آنکھیں کھل گئی تھیں___ لے دے کر وہی ایک ٹھیلا___ وہ اپنی اس 'تجارت' کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کے فراق میں تھے___ شاید اس لئے بھی کہ مشتاق نے سلیم پور میں گھر لے لیا تھا اور وہ اب تک خوریجی کے دو کمروں والے کرائے کے فلیٹ میں دہلی کی گرمی برداشت کر رہے تھے۔ لیکن امید تھی۔ اللہ کی لاٹھی میں دیر ہے اندھیر نہیں___ ایک دن معجزہ ہوگا۔ جھولی

پھیلائیں گے، اور محبوب اولیاء اتنا دے دیں گے کہ قارون کا خزانہ بھی کم پڑ جائے گا۔

●

قارئین!

برسوں پہلے ایک جادوگرنی نے پوچھا تھا۔ آپ جادو پر یقین رکھتے ہیں ___ اور یقیناً، اس سوال کو پوچھتے ہوئے جادوگرنی طنز سے مسکرائی تھی ___ یعنی اس عہد میں، اس ترقی یافتہ عہد میں بھی ___؟ ممکن ہے، آپ کسی جادو یا معجزے پر یقین نہ رکھتے ہوں مگر ہمارے محمد علی بھائی کے ساتھ، آگے جو واقعہ پیش آیا، وہاں یقین کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ یکا یک، جیسے طلسم ہوشربا کی داستانوں سے اٹھ کر کوئی کردار، زندہ ہو کر اُن کے سامنے متعلق کھڑا ہو گیا ہو۔ یہ آنکھوں کا دھوکہ نہیں تھا۔ پھر بھی ہمارے محمد علی بھائی نے آنکھیں ملیں۔ بستی حضرت نظام الدین کے فٹ پاتھ کنارے رکھے، اپنے ٹھیلے کا جائزہ لیا ___ نظر اٹھا کر دیکھا ___ سامنے ایک فرنگی تھا اور ایک تھے اپنے صادق بھائی ___ جو کتنی ہی بار تبلیغی جماعت کی مسجد میں دکھائی دیئے تھے۔

دونوں یکا یک اُس کے ٹھیلے کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اس طرح، جیسے لیو تالستائے کی ایک کہانی میں، کسی بھوکے پیاسے کے گھر خود بھگوان چل کر آ گئے ہوں۔

'جی۔ صادق بھائی۔ السلام علیکم......'

محمد علی بھائی غور سے صادق بھائی کا چہرہ پڑھ رہے تھے ___

'سلام مجھے نہیں، انہیں کیجئے ___'

'اخواہ۔ مسلمان ہیں؟ سبحان اللہ۔' محمد علی بھائی نے تپاک سے ہاتھ آگے بڑھایا ___

'نہیں۔ مسلمان نہیں۔'

محمد علی بھائی نے فوراً ہاتھ پیچھے کھینچ لیا ___ 'کیا کہتے ہیں صادق بھائی۔ کافر کو سلام کرنا منع ہے۔'

'ہوگا ___'

'آپ تو نماز روزہ سب کرتے ہیں۔ پھر ایسی بات......' محمد علی بھائی کہتے کہتے رک گئے ___ فرنگی، انگریزی میں دھیرے دھیرے صادق بھائی سے کچھ کہہ رہا تھا اور صادق بھائی انگریزی میں اُس کا جواب دے رہے تھے...... ٹیل ہم۔ ٹیل ہم پلیز ___ ٹیل ہم دیٹ آئی ایم ویری مچ پلیز ٹو ٹاک وہاٹ ہی سیڈ۔ تم سے مل کر بہت خوش ہیں۔'

'کیا کہتے ہیں صادق بھائی......'

صادق بھائی نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔ دھیرے سے کان میں کہا___ 'محمد علی بھائی، تیری تو چل پڑی......'

'مطلب'

'اِن سے ملو___ یہ ہیں___ ایرک ہسٹنگز......'

'ای......رے......ک......' محمد علی بھائی نام لیتے لیتے ٹھہر گئے...... کیا ......ایریک......؟

'ہسٹنگز۔ وارن ہسٹنگز کے خاندان کا......'

'تو میں کیا کروں۔'

'کرنا تمہیں ہی ہے محمد علی بھائی___ 'صادق بھائی ہنس رہے تھے۔' کیونکہ بزنس کا معاملہ ہے۔'

'بزنس اور مجھ سے؟'

محمد علی بھائی کی پیشانی پر شکن پڑ گئی تھی___ اب سامنے والا آدمی اُنہیں اچھا لگنے لگا تھا___

ایریک ہیسٹنگز نے، صادق بھائی سے کہا___ Come to the point 'convey to him, what I mean.

صادق بھائی نے ترجمہ کیا___ محمد علی بھائی، اِن کی باتیں غور سے سنو۔'

'اوہ! یس......یس۔' محمد علی بھائی جوش سے بولے۔ اتنی انگریزی تو وہ جانتے ہی تھے۔

اٹیس اے لانگ لانگ اسٹوری، اِمباورنگ مومنٹس آف آلموسٹ تھری سنچوریز: لمبی کہانی ہے۔ ڈھائی سو سال کے عرصے میں پھیلی ہوئی......'

صادق نے ترجمہ کیا، جیسے تھوک نگلا ہو___

پوچھتے پوچھتے وہ ٹھہرے___ آر یو اے ڈسنڈنٹ آف سراج الدولاز فیملی؟

'آپ نواب سراج الدولہ کے خاندان کے ہیں نا؟ یعنی یہ بات بالکل سولہ آنے سچ ہے، نا؟'

محمد علی بھائی ایک لمحہ کو جیسے ننگے ہو گئے۔ گہرا سناٹا چھا گیا۔

•

'غربت' کے اِس باب کو بھولے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ کہاں سراج الدولہ، کہاں وہ ___ لیکن سنتے تھے......، اُن کے بھائیوں میں سے ایک لیاقت الدولہ کے خاندان سے اُن کا 'شجرۂ نصب جا کر مل جاتا ہے۔

تب اٹھارہویں صدی کا مرشد آباد اور تھا۔ کہتے ہیں لندن، پیرس اور روم کی چمک بھی اُس کے سامنے ماند تھی اور اس بات کا اعتراف تو رابرٹ کلائیو تک نے کیا تھا ___ ریشمی کپڑے اور ہاتھی کے دانت سے بنی خوبصورت چیزوں کی وجہ سے بھی مرشد آباد کی شہرت دور دور تک تھی۔

'اُن دنوں......' ایریک ہیسٹنگز ایک لمحہ کو ٹھہرا ___ صادق بھائی کا ترجمہ جاری تھا ___ مرشد آباد بھاگیرتھی اور اب کے ہگلی ندی کے دونوں طرف بسا ہوا تھا۔ کہتے ہیں یہیں، یہیں بھاگیرتھی کے کنارے، پہلی بار تمہارے آباء واجداد میں سے ایک، اور ہمارے وارن ہسٹنگز کی ملاقات ہوئی تھی ___ ایک بڑی ڈیل کے لئے......

'ڈیل؟'

محمد علی بھائی بچوں کی طرح کانپ گئے ___ جیسے تیز ہوا چلی ہو اور تیز طوفانی ہوا میں اُن کا جسم مثل بید تھرّانے لگا ہو ___

'ڈیل...... بزنس ڈیل......'

محمد علی بھائی کے لئے وہ فرنگی ایک 'گورا' آدمی تھا اور یہ گورا آدمی اِس وقت مسکرا رہا تھا ___

یکا یک سر میں جیسے تیز تیز بجلی کڑکنے لگی ___

'لیکن اتنے برسوں بعد ___ یعنی دو سال نہیں دس سال نہیں، سو سال نہیں ___ بلکہ ڈھائی سو سال......؟'

محمد علی بھائی کو حیرانی تھی ___ اتنے برس میں تو قبرستان کی تاریخ بھی بدل جاتی ہے ___ دنیا کی کون کہے؟ ڈھائی سو سال پرانے مردے تو پتہ نہیں کہاں سے کہاں نکل جاتے ہوں گے SS ہو ہو SS۔

'ہنسو مت ___ 'صادق بھائی کی آواز میں ناراضگی تھی ___ یہی تو کمی ہے۔ ہم

ہندوستانیوں میں۔تاریخ بھول جاتے ہیں۔نہیں بھولتے تو یہاں رہتے کیا؟ اِن کی طرح چاند پر چلے گئے ہوتے ___ یہی تو فرق ہے۔ان کے لئے سب کچھ تاریخ ہے ___ بلکہ سچ یہ ہے کہ اریک بھائی بھی تاریخ ہیں ___ اِن کا حال اور ماضی بھی تاریخ ہے......'

'یس......' اریک ہسٹینگز نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔

صادق بھائی اُس کی طرف گھومے ___ 'پتہ ہے۔یہ کیا کہہ رہے ہیں ___ تمہیں تلاش کرنے میں ساری زندگی لگ گئی ___ وارن ہسٹنگز کے مرنے کے بعد ڈیل کی یہ تاریخ کچھ پشتوں تک تو چلتی رہی مگر کسی کو بھی ہندوستان آنے میں کامیابی نہیں ملی ___ دراصل وارن ہسٹنگز کے گھر والے، اُن پر زندگی کے آخری لمحوں میں لگنے والے الزامات اور مقدموں سے بالکل خوش نہیں تھے ___ پھر لگاتار کورٹ کچہری، گواہیاں، اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت کم ہو رہی تھی۔کمپنی کے افسرِ اعلیٰ بھی کمزور پڑنے لگے تھے۔لیکن تاریخ ان ڈھائی سو برسوں میں آنے والی نسل کو اس ڈیل کی کہانی سناتی رہی اور ہیسٹنگز خاندان کا ہر آدمی سوچتا تھا ___ وہ ہندوستان جائے گا ___ لیاقت الدولہ کے خاندان والوں کو پکڑے گا ___ اور اس تاریخی ڈیل کے بارے میں بتائے گا ___'

معاذ اللہ! محمد علی بھائی صدیوں پرانی تاریخ کی اس محبت سے بے حد متاثر تھے ___ مگر میرا گھر۔میرے بارے میں......'

صادق بھائی نے اُس کا ہاتھ تھاما ___ 'جو تاریخ کی حفاظت کرتے ہیں، وہ تاریخ میں شامل لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں۔'

'مگر ___'

صادق بھائی، محمد علی بھائی کے ہاتھوں کو تھامے رہے ___ 'DNA جانتے ہو یا نہیں؟'

'ہاں۔' محمد علی بھائی کو اپنے نالج پر فخر کا احساس ہوا ___

'اسپیل برگ نے کھدائی میں ملے ڈائنا سور کے انڈے سے پورا جوراسک پارک تیار کر لیا۔کب، کیسے، کیا' جیسی چیزیں تاریخ میں نہیں آتیں ___ صرف جانو، دیکھو اور سنتے رہو ___'

'یس...... یو آر رائٹ......'

محمد علی بھائی کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔سب سمجھ گیا ___ سمجھ گیا صادق بھائی۔

لیکن کیا اور کتنا سمجھا تھا، محمد علی بھائی نے ___ لیاقت الدولہ اور سراج الدولہ کے خاندان کی 'رام کہانی' تو کب کے نوابوں کے قبرستان میں دفن ہو چکی تھی۔

مرشد آباد چھوڑے بھی ایک زمانہ ہو گیا ___ پھر کبھی وہ لوٹ کر تاریخ کی سنہری 'گپھا' میں نہیں گئے۔ وہاں تھا ہی کیا۔ سوائے ناامیدی اور ایک دُکھ بھری کہانی کے۔ وہ تو، اللہ اللہ خیر صلیٰ جمنا پار، خوریجی میں دو چھوٹے کمروں والا ایک اصطبل مل گیا اور مل گئی بستی حضرت نظام ___ مل گیا ٹو پیوں والا ایک ٹھیلہ ___ اور مل گئے، انہی بستیوں میں اپنے صادق بھائی ___ جن سے کسی اُجاڑ دُکھ بھرے لمحے محمد علی بھائی نے ذکر کیا تھا، کہ وہ کس کے خاندان سے ہیں اور اب کیا ہو گئے۔

'نہیں اِس بات کو آپ ایسے نہیں سمجھیں گے ___ ' ارک ہسنگز کا چہرہ چمک رہا تھا ___ 'دراصل اُس وقت ہمارے سائنسداں زمین اور کرۂ باد کو لے کر ایک تجزیاتی رپورٹ لائے تھے۔ زمین کا کرۂ باد پانچ پرتوں کا بنا ہوا ہے۔

'ٹراپوس فیئر، اسٹریٹوس فیئر، میسوس فیئر، تھرموس فیئر اور ایکسوس فیئر ......'

'تو......' محمد علی بھائی کے چہرے پر گھبراہٹ تھی ...... اتنے سارے فیئر ...... اس گھبراہٹ میں وہ ایریک ہسینگز کا چہرہ دیکھنا بھول گئے ___ جس کی دائیں آنکھ کے پاس کے کالے تل سے، روشنی کی چنگاریاں نکل رہی تھیں ___ ٹھیک ایسے، جیسے پرندے اُڑتے اُڑتے 'بجوکا' کو دیکھتے ہوں ___ ٹھہرتے ہوں ___ لوٹ جاتے ہوں۔ نہیں، یہ تمثیل ٹھیک نہیں ___ ہاں، یاد آیا، مولوی صاحب، مدرسے میں اپنی جگہ باہر جاتے ہوئے 'گوتکیہ' کو رکھ دیتے تھے، پھر اشارے سے کہتے تھے ___ 'یہ میں ہوں، جانا مت۔' اُن کے جانے کے بعد بھی گوتکیہ عجب عجب طرح سے مولوی صاحب کی شکلیں لیتا رہتا تھا۔ اس وقت کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ ڈر بھی رہا تھا۔ سمجھنا بھی مشکل تھا۔ اُس پر اس گورے بھائی کا چہرہ ___ بڑا ڈیل ___ لیکن یہ ڈیل کے درمیان میں کرۂ باد کہاں سے آ گیا۔

'ڈیل کے درمیان میں کرۂ باد؟' محمد علی بھائی خود کو روک نہیں سکے۔

ترجمہ کرنے والے صادق بھائی دل کھول کر ہنسے ___ گورے آدمی کی چھوٹی آنکھیں سکڑ گئیں ___ لیکن دوسرے ہی لمحے اُن میں چمک پیدا ہو گئی ___ صادق بھائی نے اُس کے

لفظوں کا ترجمہ کیا___ دِس فول از سے اِنگ......

اوہ نوss نوss اریک ہیسٹنگز ہنس رہا تھا___ پھر اُس نے کچھ کہا۔ اب اُس کی انگریزی اور ترجمہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا___

'جیسے جیسے ہم اوپر بڑھتے جاتے ہیں، ہوا پتلی ہوتی جاتی ہے......'

'تو......'

'یہ سب سمجھنا اتنا آسان نہیں۔ ہندستان میں ولایتی مال کی کھپت کے سلسلے میں ڈیل ہوئی تھی۔ ہری دوار، ایودھیا، بنارس اور ایسے ہی کچھ مذہبی مقاموں پر گیروا ریشمی کپڑے تھوک میں بھجوانے کی بات ہوئی تھی___ لارڈ ویلزلی نے خود ہی بہترین مال کے لئے ہندوستان کے ان بڑے ہندو بازاروں کی اسٹیڈی کی تھی۔ مگر— صادق دھیرے سے پھسپھسایا___ محمد علی بھائی جتنا کہا جائے، اتنا ہی سمجھو۔ زیادہ آگے پیچھے مت دیکھو___ آگے پیچھے دیکھو گے تو یہ ڈیل ہاتھ سے نکل جائے گی۔ فائدہ تمہیں ہوگا تو کمیشن مجھے بھی تو ملے گا۔ سمجھے کہ نہیں۔ اب کیا ہے کہ یہ لاٹری تمہارے نام کھل گئی بس......اب ایسے سمجھو......کہاں یہ......کہاں ہم......ای کتنا پڑھے لکھے ہیں اور ہم___ کیا مقابلہ ہے___ کوئی مقابلہ ہوتا تو دو سو سال سے زیادہ کیا یہ ہم پر حکومت کرتے......؟ ایک دن سب کی قسمت بدلتی ہے۔ سمجھو تمہارے دن بھی......

درمیان میں اریک ہیسٹنگز نے ناگواری سے اُس کی پھسپھساہٹ کے بارے پوچھا۔

صادق بھائی نے ترجمہ کیا......دِس فول از سے اِنگ......

'اوہ......یس......' اریک ہیسٹنگز کے چہرے کی سلوٹیں ختم ہوئی تھیں......لیکن اب یہی سلوٹیں محمد علی بھائی کے چہرے پر 'اُچھل' کر چھا گئی تھیں___

'معاملہ الجھا ہوا ہے___'

'نہیں اُلجھا ہوا نہیں___' صادق بھائی سمجھا رہے تھے___ بس تمہارے سمجھنے کا پھیر ہے۔ آخر نواب سراج الدولہ کے خاندان سے ہو___ ایک بڑے آدمی کی دوسرے بڑے آدمی سے ڈیل ہوئی تھی۔ ڈیل ناکام ہوئی___ ڈھائی سو برس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا___ اور اِس کے بعد......'

'ڈھائی سو......کیا یہ کچھ زیادہ___ زیادہ آپ کو نہیں لگتا؟'

'لگتا ہے تو کیا کریں؟' صادق بھائی کے چہرے پر ناراضگی تھی___ یقین بھی ایک چیز

ہے___ اور محمد علی بھائی۔ یہ تو ایک موقع ہے۔ سنہرا موقع___ تمہارے لئے۔ اِدھر اُدھر مت دیکھو۔ ذرا سوچو۔ ڈھائی سو سال پہلے جو ڈیل ہوئی تھی___ وہ اجودھیا، ہری دوار اور ہندوؤں کو لے کر___ اور اب کی ڈیل مسلمانوں کے ساتھ___ تمہارے ساتھ۔ امریکہ، انگلینڈ سب تمہارے ساتھ ہیں___'

'کہاں ساتھ ہیں؟'

'کیوں؟'

اُسامہ کیا پہلے ہمارے آدمی تھے۔ اُن کے تھے۔ ایک ڈیل تو اُن کی بھی ہوئی تھی۔ کیا ہوا___ اور بغداد میں عراق میں___ ہم کیا اردو اخبار بھی نہیں پڑھتے ہیں۔

محمد علی بھائی کی سرمہ لگی آنکھوں میں، 'ذہانت' کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

'سب کرۂ باد کی وجہ سے۔ اُس وقت زمین کا کرۂ باد بدل گیا تھا۔ ریشمی کپڑے پہننے والوں کو پھپھولے نکل جاتے تھے۔ بڑے بڑے دانے چیچک جیسے۔ انگلینڈ میں اس کو لے کر میٹنگ ہوئی۔ وارن ہسٹنگز بھی شامل ہوئے اور کہا گیا اس وقت ہندوستان سے درآمد کئے ہوئے ریشم سے انگلینڈ میں تیار کیا گیروایا بھگوا کپڑا ہندوستان بھیجنا مشکل ہے۔ یہ ہندو ذات کو صرف پریشانی میں ڈالنے جیسا ہے___ بلکہ اس سے انگلینڈ کے راجاؤں کے لئے اُن میں یقین میں بھی کمی آئے گی اور یہ ڈیل ہوئی تھی___ تمہارے پُرکھوں میں سے ایک لیاقت الدولہ سے، جن کی لکھنؤ سے مٹیا محل اور کلکتہ کے مٹیا برج تک طوطی بولتی تھی۔

●

قارئین!

یہ قصہ بھی ڈھائی سو سال پہلے کا ہے اور اس کہانی میں تاریخ اتنا ہی دخل ہے، جتنا دال میں نمک اور سچی بات یہ ہے کہ ہماری اس کہانی میں 'سانڈ' کا کوئی تذکرہ نہیں ہے اور جو تذکرہ ہے، وہ ٹوپی کا ہے۔ اس میں ڈھائی سو سال پہلے کی تاریخ آ تو گئی ہے۔ مگر اتفاق سے۔

وارن ہیسٹنگز کے خاندان کے لوگوں نے، سراج الدولہ کے خاندان سے مل کر اپنی نئی ڈیل کی منشا ظاہر کر دی تھی اور جیسا میں نے بتایا، اس میں نمک برابر اتہاس کا دخل تو رہے گا۔ پلاسی کی جنگ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اور ہندوستان کا غیر ملکی حکومت کا غلام بن جانا___ یہ واقعہ، (اتفاق ہی ہے) اس کہانی سے وابستہ ہے۔ اورنگ زیب کی موت کے بعد اُس کی

اولادوں کی خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ سارے صوبوں میں بدامنی پھیلنے لگی۔ مغلیہ حکومت کے دو اہم صوبے دکن اور بنگال، خودمختار بن گئے۔ بنگال میں علی وردی خاں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے دائرے کو بڑھنے سے روک رکھا تھا۔

1756 میں علی وردی خاں کی وفات ہوئی اور اُن کی وصیت کے مطابق سراج الدولہ کو بنگال کا نواب تسلیم کرلیا گیا۔ دہلی حکومت اتنی کمزور ہوچکی تھی کہ اُس سے فرمان حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔ سراج الدولہ کو بنگال کا نواب تسلیم کرلیا گیا۔ سراج الدولہ کے مقابلہ ایسٹ انڈیا کمپنی، سرمایہ داری کی تیزی سے اُبھرنے والی سب سے بڑی طاقت تھی۔ اس کا مرکزی دفتر لندن میں تھا لیکن شاخیں بمبئی، مدراس اور کلکتہ میں تھے اور جو ایک دوسرے سے آزاد تجارت کرتی تھیں۔ لیکن وہ آپس میں تعلقات بنائے رکھتی تھیں۔ اٹھارہویں صدی میں مرکزی حکومت کی کمزوری کی وجہ سے ایسٹ انڈیا کی شاخوں نے مقامی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ مدراس کلکتہ میں کمپنی کے چالاک آفیسر بھیجے گئے تاکہ ہندوستان کی بڑی منڈی پر دھاوا بولا جاسکے۔ ایسے افسران میں وارن ہسٹنگز بھی تھا جو 1772 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا گورنر بنا۔

اُس وقت ہندوستان کی آبادی کا ایک بڑا حصہ انیسویں صدی کے پہلے دہائی تک متفرق صنعتوں میں لگے تھے۔ بُنکاری، عوام کا قومی روزگار تھا۔ لاکھوں عورتیں کتائی سے اپنے خاندان کے لئے کمائی کرتی تھیں۔ انگریزی چمڑے کے کام سے لاکھوں کو روزگار ملتا تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے طے کیا، کچے ریشم کی پیداوار کو بڑھاوا دیا جائے۔ ہدایت نامہ جاری ہوا۔ ریشم کے کاریگر، کمپنی کے کارخانوں میں کام کریں اور جو نہیں کریں گے، سزا کے حقدار ہوں گے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان میں ریشم اور سوتی کپڑوں کا بننا کم ہوگیا۔ جن لوگوں نے پچھلی صدیوں میں یوروپ اور ایشیا کے بازاروں میں یہ مال غیر ممالک سے بھیجے تھے، وہ ہی ان مالوں کو بڑھتے ہوئے مقدار میں باہر سے منگانے لگے۔

کمپنی کا اختیار نامہ 1813 میں رینول ہوا۔ تلاشی لی گئی۔ گواہیاں ہوئیں۔ وارن ہسٹنگز، ٹامس منٹو، سرجان میلکم وغیرہ گواہوں کی گواہیاں لی گئیں۔

وارن ہسٹنگز کا بیان نپا تُلا تھا۔ ہندوستانی پیداوار کے بارے میں وہ اتنا بھر جاننے کے بارے میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ برٹش مال کس طرح یہاں اپنی جگہ بنا سکتا ہے اور ہندوستانی صنعت کی قیمت پر کس طرح برٹش صنعت یہاں اپنی جگہ بنا سکتے ہیں۔

وارن ہیسٹنگز سے پوچھا گیا۔ کیا ہندوستانی عوام، اپنے استعمال کے لئے یوروپ کے مال کی مانگ کرسکتی ہے؟

وارن ہیسٹنگز نے جواب دیا تھا ___ ہندوستان کے غریبوں کو کسی کمی کا احساس نہیں ہے۔ اُنہیں چاہئے تھوڑا تھوڑا ___ روٹی کپڑا اور مکان۔ یہ ساری چیزیں وہ اپنی دھرتی سے پاسکتے ہیں۔

سرجان میلکم کا ماننا تھا ___ ہندو باہمت، اُداس اور بھلے مانس ہیں ___ وہ سچے اور کھرے ہیں۔ وہ ولایتی مال نہیں کھپا سکتے۔ کیونکہ اُن میں خریدنے کی طاقت نہیں ہے۔ وہ آسان اور سادہ زندگی ہی گزارا کرتے ہیں۔

'لیکن اُنہیں یہی آسان اور سادہ زندگی غیر ممالک سے مہیا کرائی جائے تو؟'

وارن ہسٹنگز کا جواب تھا ___ شاید اسی دن کے لئے وہ یہاں بھیجے گئے ہیں۔

●

یہی وقت تھا، جب کمپنی کے کارخانوں کی وکالت کرنے والے سراج الدولہ کے بھائیوں میں سے ایک لیاقت الدولہ، وارن ہیسٹنگز کے آئے اور اُن سے ہیسٹنگز کے مکالمے کچھ اس قسم کے رہے۔

'ساتھ دو گے؟'

'ہاں۔'

'بڑی ڈیل بڑا پیسہ۔'

'آپ حاکم۔'

'ریشم کے کپڑے بنگال تک محدود ہیں۔ تم مرشد آباد کے۔'

'جو حکم حاکم۔'

ہمارے پاس بارہ ریزیڈینسیاں اور کئی کارخانے ہیں۔ کچھ جگہ پٹّی ریشم، مہین ریشم کے مال بنتے ہیں۔ ہمیں اچھے مہین ریشم کی ضرورت ہے۔ ہندوؤں کو وہی کپڑے دو، جو وہ پہنیں، وہی کھانے کو دیں، جو وہ کھائیں اور وہی رہنے کو دو جو...... ان سے سستے میں ریشم لو۔ مال ولایت بھی بھیجا جائے گا۔ انہیں بھگوا ریشم کی دھوتی، ریشم کے کُرتے اور ریشم کی جنیو دو۔ لیاقت الدولہ لاکھوں میں کھیلو گے تم۔'

لیکن لیاقت الدولہ کے لاکھوں میں کھیلنے کا خواب پورا نہیں ہوا۔ ہندوستانی آزاد پیداوار کے لئے، کمپنی کا قدم سیدھے سیدھے اُنہیں اور غلام کرنا تھا۔ اختیار نامہ کے رینول کی بات ہوئی۔ شور شرابا ہوا اور لیاقت الدولہ سے ہونے والی بڑی ڈیل انگریزوں کی دھوکہ بازی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

اس المیہ کو وارن ہسٹنگز نے اپنی ڈائری میں یوں لکھا:

'جو کچھ ہوا، اُس سے ہمارے برٹش کے کام کرنے والوں کو تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہئے—— ہندوستان کے کام کرنے والے، انگلینڈ کے کام کرنے والوں سے، پہلے اس صنعت میں ہیں۔ ان کے اپنے حدود ہیں۔ پانی اور کھانا کم ملتا ہے پھر بھی اُن میں محنت کی لگن غضب کی ہے—— ہم یعنی برٹش کام کرنے والوں سے زیادہ ہم ہندوؤں کو سمجھ نہیں پائے—— لیکن ایک دن___ آنے والے دنوں میں سے کسی ایک دن ہندوستانیوں کے ساتھ مل کر ہمیں اس غیر ملکی سرمایہ کاری کو بڑھاوا دینا پڑے گا۔ ہندوستان انوکھی صلاحیت والا، انوکھا ملک ہے اور یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ وہاں مذہب ہی سب کچھ ہے۔ مستقبل میں ہندوستان ہی سب سے بڑا بازار بننے کی گنجائش بھی رکھتا ہے۔

قارئین!

قصہ کوتاہ، یہ وہی پُرزہ تھا، جسے چاندی کے ورق میں، صندوقچی میں رکھ کر، انتہائی حفاظت سے اریک ہسٹنگز نے نکال کر اُس کے سامنے رکھا تھا___ لو، دیکھو......

محمد علی بھائی کے ہاتھ بڑھانے سے وہ تھرتھرانے لگا تھا۔

صادق بھائی نے ترجمہ کیا___ 'چھونا مت، صرف دیکھنے کی چیز......'

'لیکن......'

'لیکن کیا؟'

'دیکھوں تو سہی کیا لکھا ہے۔'

'تاریخ، اتہاس، اتہاس کو چھو سکتے ہو تم......'

'نہیں......'

'دیکھ تو سکتے ہو۔'

'کیا؟'

'ہسٹری — تمہیں دیکھنے کا حق ہے' ایرک نے جوش سے کہا —

'لیکن کیسے دیکھوں گا'

صادق بھائی نے ترجمہ کیا — تم حال کے اتہاس پر نظر رکھو۔

'وہی جو حال کا اتہاس ہے۔'

'حال کا اتہاس......؟'

'یس۔ جو تم نے بنایا...... تم نے۔'

گورے آدمی کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر کچھ کہہ رہا تھا اور اُس کا ترجمہ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

'پہلی ڈیل اجودھیا، ہری دوار — لیکن اب تمہاری — پہلی ہندوؤں کی — اور اب تمہاری یعنی مسلمانوں کی — اجودھیا کی ڈیل نہیں ہو سکی۔ وہ کمزور تھے۔ سچے اور بھولے بھالے۔ اور تم سے تو ڈر لگتا ہے۔ تم تو ورلڈ ٹریڈ ٹاور بھی گرا دیتے ہو۔ ایک دم ورلڈ ٹریڈ سے زیرو آور — تمہارے اُسامہ تمہارے صدام — سمجھ رہے ہو نا — تم نے، تم نے ایک ہو کر سرکار گرا دی۔ 'ہندتو' کی سرکار کس نے گرائی — ؟ تم نے — کیونکہ پہلی دفعہ ایک تھے تم — اور بابری مسجد، ورلڈ ٹریڈ ٹاور منہدم کیے جانے سے گجرات تک تم زیادہ سے زیادہ مسجدوں میں پہنچ رہے ہو۔ لُک — زیادہ سے زیادہ — تمہیں زیادہ سے زیادہ ٹوپیاں چاہئیں۔ ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں۔ پہلے والی جو ڈیل نہیں ہوئی تھی، ہم اُس کی قیمت چکا دیں۔

'کیا چکائیں گے؟'

محمد علی بھائی کا جسم، اچانک چلنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے سے لرز رہا تھا —

'جو مانگو گے ملے گا۔'

'مانگ۔ مانگ نا......' صادق بھائی کی بری بڑی آنکھیں ایسی ہو گئی تھیں، جیسے اُنہوں نے تندور میں 'سینکے' جانے والے تندوری چکن کو تاڑ لیا ہو۔

'چلو ہم ہی دیتے ہیں۔' ایرک ہسنگر لٹانے پر آ گئے تھے۔

'دہلی تم کو دیا۔'

'دہلی......'

'ہاں ـــ یعنی دہلی مارکیٹ۔' صادق بھائی ہنسے۔
محمد علی بھائی کی آنکھیں جیسے پتھر کی ہوگئی تھیں۔ ایسے دہلی کیسے دے دیا۔ دہلی تو کبھی مغلوں کی، کبھی انگریز، کبھی باجپائیوں کی اور کبھی سونیا کی ہے۔
'چلو لکھنؤ لے جاؤ ــ اودھ دے دیا۔'
'اودھ؟'
'یعنی پورے اودھ کا مارکیٹ۔' صادق بھائی کھلکھلا کر ہنس رہے تھے ـــ 'دیکھتے کیا ہو۔ مصافحہ کرو۔ مصافحہ اتنی بڑی ڈیل۔'
'ارے ہاتھ بڑھاؤ۔'
اُس نے ہاتھ بڑھایا۔ یعنی محمد علی بھائی نے ہاتھ بڑھایا ــ مصافحہ یعنی ہاتھ ملانے کے لیے ــ اور ٹھیک اسی لمحہ وہ اپنی دنیا، بستی حضرت نظام الدین اور ٹھیلے کی دنیا میں واپس آ گئے۔ اریک ہسنگز تھوڑا سا محمد علی بھائی کے کالے مٹ میلے، کُھر درے ہاتھوں کو بڑھا دیکھ کر تھوڑا ٹھٹھکا تھا۔ ٹھیک ایسے، جیسے کرنٹ لگا ہو ــ ایک بار جب دو سال کی ڈیوٹی پر 'شیخ' کی جنت میں کار چلانے وہ سعودی گیا تھا۔ فائدہ اتنا ہوا کہ دو سال میں 'عمرہ' بھی کر آیا اور حج بھی ہو گئے۔ وہاں رہتے، سہتے، کار چلاتے ہوئے محمد علی بھائی کی آنکھوں میں اتنی روشنی بڑھی تھی، جتنا اِس ڈیل کا سن کر بھی نہیں بڑھی۔ بس، وہ تو ایک دن، شیخ کے حساب کتاب کو لے کر دُکھی محمد علی بھائی نے سلام ٹھونک دیا ـــ
'سلام شیخ۔ اپنا ٹھیلا پیارا۔ اپنی بستی حضرت نظام الدین پیاری۔ تبلیغی جماعت کا دفتر پیارا اور اپنی پلّی دوپلّی ٹوپیاں پیاری۔ میں تو چلا ـــ'
'کیا سوچنے لگے؟' صادق بھائی نے جھٹکا دیا تو اُسے خیال آیا۔ اریک ہسنگز نے مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ پینٹ کی جیب سے باہر نہیں نکالا ہے۔
'مجھے سوچنے کا ٹائم چاہئے۔'
'ٹائم؟'
'آخر ڈیل ہے۔ مذاق ہے۔'
اریک ہسنگز کے پوچھنے پر صادق نے ترجمہ کیا ـــ ہی ٹولڈ......
'اوہ یس۔ یس......'

صادق بھائی نے بتایا ___ 'ہم پھر آئیں گے۔ سوچنے کے لئے دو دن کی مہلت ہے۔ اُس کے بعد — اور ہاں۔ کل یہ تمہارے ساتھ لنچ بھی کریں گے۔ یہیں کریم میں اور ___ تمہارے کارخانے بھی دیکھیں گے، جہاں تمہاری ٹوپیاں بنتی ہیں۔ ہے ss ای۔ مسٹر محمد علی — ٹھیک؟'

صادق بھائی، محمد علی بھائی کی سرمہ لگی آنکھوں میں جھانک رہے تھے۔ جاتے جاتے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ اریک بھائی کی مرسڈیز باہر تھانے کے پاس لگی تھی۔ بستی حضرت نظام الدین سے باہر نکلتے ہی تھانہ ہے۔ وہاں عام طور پر بستی یا فاتحہ پڑھنے آنے والے لوگ گاڑیاں لگا دیا کرتے ہیں اور ان گاڑیوں کے لئے یہیں کے رہنے والے پانچ دس روپے لے کر گاڑی کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے، تھانے بھی کچھ پیسے پہنچ جاتے ہوں۔ مگر یہ بات یقین سے اس لئے بھی نہیں کی جاسکتی، یہاں سارا علاقہ بابا نظام الدین کا ہے۔ جو بھی کام کرو گے، محبوب الٰہی خوش ہوں گے۔

●

'کریم میں کھانا کھائیں گے؟'

اتنی بہت ساری باتوں میں جو بات محمد علی بھائی کو یاد رہی، وہ یہ تھی کہ کریم میں کھانا کھائیں گے۔ کریم مطلب اسٹیٹس سمبل۔ یہاں، ٹھیلا لگانے سے پہلے ہی وہ کریم کے بارے میں کتنی کہانیاں سنتا رہا۔ جب کے کریم ہے ہی کتنی دور۔ ٹھیلے سے دس قدم ناپ لو۔ دروازہ پر باوردی چوکیدار آتے ہی سلام داغتا ہے۔

کریم میں کھانے کی 'ہمت' اپنی جگہ تھی۔ مگر ___ یہ بات بھی بار بار پریشان کرتی رہی کہ وہ اریک بھائی کو جواب کیا دیں۔ اچھا ہے — کریم کی مدھم مدھم روشنی میں برسوں کا خواب پورا ہوا اور اریک بھائی کو جواب نہ دیں۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔

ایک بات اور تھی ___ اریک بھائی نے کہا تھا ___ جہاں ٹوپیاں بنتی ہیں، وہ اُس کارخانے کو بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔ آخر کو لمبی ڈیل کا سوال ہے۔ جتنا مال یا آرڈر چاہئے، اُس حساب سے اریک بھائی اس ٹوپی مارکیٹ کو سمجھنا چاہتے تھے......

خوابوں میں ڈوبی رات کیسی ہوتی ہے، یہ پہلی بار محمد علی بھائی نے جانا۔ رات بھر رہ رہ کر کروٹیں بدلتے رہے۔ کبھی بچوں کو چھوتے۔ کبھی اُٹھ کر بیوی کے ہونے کا احساس کرتے۔ کیا سچ

بچ اُن کی ڈیل ہوگی— کیا اِس ڈیل سے اُن کی دنیا بدل جائے گی—؟

•

صبح چھ بجے ہی صادق بھائی گاڑی لے کر گھر آ گیا۔ اریک بھائی بستی حضرت نظام الدین، درگاہ پر پہنچ چکے تھے اور اندر آستانے میں گورے چٹے مجاوروں کو دنادن سو دو سو کی رسید دے رہے تھے۔ صندوقچی لئے بیٹھے 'تاجروں' نے اریک بھائی کو محاصرہ میں لے لیا تھا۔ یہ کوئی بہت اچھا منظر نہیں تھا، محمد علی بھائی کے لئے۔ ایک لمحہ کو رات والا خواب 'فر......ر' ہو گیا۔ اریک بھائی نے اُسے دیکھ کر خوشی ظاہر کی مگر محمد علی بھائی کے چہرے پر 'سردمہری' پسری رہی۔

'تو چلیں'۔ صادق بھائی نے پوچھا___

'صفیہ کی ڈیری'___ یہی وہ جگہ تھی، جہاں محمد علی بھائی کی ٹوپیاں بنا کرتی تھیں۔ تین بڑے بڑے ہال تھے— زیادہ تر عورتیں تھیں— جو یہ کام کیا کرتی تھیں۔ بستی حضرت نظام الدین کے اندر گلیوں میں یہ 'ڈیری' تھی۔ ایک 'ہال' صرف مشینوں کے نام تھا۔ جہاں پاؤں سے چلنے والی مشینوں پر عورتیں ٹوپی کو آخری شکل دیا کرتی تھیں۔ سوت، ریشم، جھالے سے لے کر مشین— ایک ایک چیز کو اریک بھائی دیکھتے رہے۔ تب تک سورج کافی سر چڑھ آیا تھا۔ اب منزل تھی کریم کی۔ صادق بھائی کا خوف یہ تھا کہ بات بن جائے اور اُن کا کمیشن نہ جائے۔

جبکہ محمد علی بھائی کی پیشانی پر اُگنے والی تیسری آنکھ اب تھوڑی تھوڑی کھلی تھی۔ وہ نہ زیادہ جوش میں تھے، نا حوصلہ افزا— وہ ٹھیک ایسے ہی 'ہندوستانی' تھے، جن 'ہندوستانی ہندوؤں کے لئے وارن ہیسٹنگز نے اُس ڈیل کے بارے میں ذکر کیا تھا___ 'یعنی تھوڑے تھوڑے میں مطمئن رہنے کا نظریہ— اور یہ نظریہ کسی بھی مارکیٹ اسٹریٹجی کو منہدم کر سکتا تھا۔

•

دلسین___ 'صادق بھائی اُس کی طرف مڑے___ تب ہندوستان میں تین قسم کے شہتوت تھے۔ یوروپ میں اُگایا ہوا سفید شہتوت، چین میں اُگایا ہوا کالا بیگنی اور ہندوستانی شہتوت۔ تین قسم کے کیڑے تھے۔ دیسی، اٹلی اور چین کے کیڑے۔

اریک بھائی نے ایک چھوٹی سی ڈائری کھولی___ 'کمپنی کے پاس 13-12 ریشم گھر تھے۔ کمپنی پیشگی دیتی تھی۔ لیکن کمپنی پر پہلا الزام تو یہی لگا کہ ہندوستانی سیاست آزادی کے ساتھ ساتھ معاشی اور صنعتی آزادی بھی کھوتی جا رہی ہے۔

'وہ گواہوں' مقدمہ، مزاحمت سے تھوڑے اُداس سے تھے۔ وہ تو سطح تجارت بڑھانا چاہتے تھے۔ شاید اسی لئے 'بھا گیرتھی' کے پاس وہ ایک بار پھر لیاقت الدولہ سے ملے۔ ملنا طے ہوا۔ رات 7 اور 8 کے درمیان — وارن ہیسنگز اپنی گھوڑا گاڑی میں تھے — لیاقت الدولہ کو گھر نہ بلانے کے پیچھے بھی کئی وجہیں تھیں — جیسے مقدمہ سے پہلے تیار کردہ ریشمی گیروا کپڑوں کے کچھ تھان ہری دوار، بنارس اور برندابن جیسے بازاروں میں پہنچائے گئے تھے...... پہلی بار — لو شروع کرو — '

ارک ہیسنگز اُس کی طرف مڑے۔ کریم کی میز پر خوشبو دیتا کھانا رکھ دیا گیا تھا۔ لذیذ پکوان — باوردی ویٹر۔ سر جوڑے کھڑا تھا۔ اُس نے دیکھا، صادق بھائی قورمے کا گوشت اپنی پلیٹ میں ڈال رہے ہیں۔

'اور یہ کہانی کا ڈراپ سین ہے۔ پتہ نہیں کس نے منڈی میں افواہ اُڑادی کہ ریشم کے مال میں گائے اور سور کی چربی ملی ہوئی ہے۔ اِٹس ٹوٹل نانسینس اینڈ انڈ اجسٹیبل — الگ الگ علاقوں سے دنگے پھیلنے کی خبر آ چکی تھی۔ اور......

ارک ہسنگز نے گوشت کا نوالہ توڑا — 'ٹھیک اُسی وقت وارن ہیسٹنگز کی گھوڑا گاڑی 'بھاگیرتھی' کی طرف بڑھ رہی تھی کہ راستے میں ہی اُنہیں دیوانی کا ایک آدمی گھوڑا بھگاتا اُن کے پاس آیا اور بولا — آگے نہ جائیں۔ لیاقت الدولہ مار ڈالا جاچکا ہے۔ کمپنی کی فوج الرٹ ہے۔ کچھ پاگل ہندوستانی ہیں، جنہیں سمجھانا ضروری ہے۔ بہتر ہے کہ......؟'

وارن ہسنگز پر لگنے والے اِس امپیچمنٹ کے مقدمے میں خلاصہ کیا گیا —

''ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں کے انداز میں ہی سمجھا جائے۔ اُن کے مذہب کو چھیڑے بغیر۔ وہ مذہب کے معاملے میں شہد کی مکھی کے چھتوں کی طرح ہیں۔ جس سے اُن پر حکومت کرنا آسان نہیں رہ جائے گا۔''

●

قارئین!

قصہ کوتاہ۔ شام ڈھل گئی تھی۔ بستی حضرت نظام الدین اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔ کریم میں کھانے کے بعد تھوڑا سیر سپاٹا ہوا۔ پھر وہ ہمایوں کے مقبرے کی طرف نکل گئے۔ واپس لوٹنے تک چراغ روشن ہو چکے تھے — گاڑیوں کا شور تھم گیا تھا۔ آسمان پر تارے ٹمٹما آئے تھے۔

اریک آہستہ سے بولا___ ڈھائی سو برس—اتہاس— اتہاس بدلنے کے لئے کافی ہوتے ہیں— نہیں؟

'یس......' صادق بھائی بتا رہا تھا___ 'سر! جنون تو وہی ہے۔ اجودھیا سے گودھرا اور گجرات تک۔'

'اب ہندو دھوتی کم پہنتے ہیں۔' اریک بھائی آہستہ سے ہنسا___ لیکن مسلمان ٹوپی ضرور پہنتے ہیں۔ اور پوری دنیا میں— بستی حضرت نظام الدین سے نِکارگوا، اور چین سے جاپان تک۔ پچھلی ڈیل ناکام ہوگئی تھی لیکن......'

مرسیڈیز دور کھڑی تھی۔ چاند کی روشنی میں، اندھیری سڑک پر تین بھوتوں کے سائے زمین پر نشان بناتے چل رہے تھے......

اریک بھائی انگریزی میں بولے___

صادق بھائی نے ترجمہ کیا___ ''تم ساتھ دو۔ اِس بار ٹوپی ہم پہنائیں گے۔ مسلمانوں کو۔''

آخری دو لفاظ وہ اتنے آہستے سے بولے کہ سامنے سے آتی گاڑی کے ہارن کے درمیان یہ الفاظ دب کر رہ گئے تھے۔

امام بخاری کی نیپکن

''ادب کے لئے مذہب ایک 'اسنابری' ہو جاتا ہے
جنگ کے نتائج کے طور پر/
مذہب میں نئے نئے راستوں کے منہ کھل گئے/
اور شاعر، خدا کو فیشنیبل رومالوں کی طرح استعمال کرنے لگے/
اس کے باوجود۔ بہت ہی معمولی رومال......''

......کافکا سے ایک مکالمہ

نیپکن ہے؟

ارے نہیں۔ نیپکن کا کیا کرنا ہے؟ نیپکن کو بھول گئے تھے، صلاح الدین قریشی۔ ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ خدا قسم۔ کیا وہ جانتے تھے کہ نیپکن کیا بلا ہے۔ پہلی بار اپنے شہر کے ایم۔ ایل۔ اے کے ساتھ لنچ کرتے ہوئے وہ زور سے چونکے گئے۔

'کیا— کھانے کے بعد نمکین۔ میٹھا تو سنا ہے سر......'

'ارے ہم ہاتھ پوچھنے کو بول رہے ہیں۔ آپ بڑ بکے رہ گئے صلاح الدین قریشی'۔

لیکن ٹھیک یہی 'لطیفہ' اس واقعہ کے دوسرے ہی دن انہوں نے اپنی بیوی کے ساتھ بھی دُہرایا تھا— نیپکن کے نام پر 'تیسرے نمبر کی بیوی قریشہ بھی چونکی تھی— 'پگلا گئے ہیں کیا آپ۔ ارے کھانے کے بعد لوگ تو میٹھا مانگتے ہیں— 'زور زور سے قہقہہ لگاتے ہوئے صلاح الدین قریشی نے رنگین، کچھ 'لنگی' اسٹائل کا نیپکن ہاتھ میں اُٹھاتے اور ہاتھ پوچھتے ہوئے ایم۔ ایل۔ اے صاحب والا جملہ دہرایا تھا— 'بڑ بک، کوئی کیا کہے گا۔ نیپکن بھی نہیں جانتی کیا۔ ارے ایسے

ہے......

'تو کیا۔ ہاتھ نہیں دھوئیں گے؟'

'پونچھ لیا — ' صلاح الدین قریشی فخر سے مسکرائے تھے — سب بڑے لوگ یہی کرتے ہیں۔ وہاں کا پانی سے ہاتھ دھونے کی فرصت ہوتی ہے۔ کھایا پیا — پونچھ لیا۔ ایسے۔

بیوی کی آنکھوں میں حیرانی کی کیسی چمک تھی، صلاح الدین قریشی کے لئے ٹھہر کر اسے دیکھنا اہم نہیں تھا۔ اہم تھا تو صرف یہ سوچنا کہ اب وہ بھی بڑے آدمیوں میں شامل ہو گئے ہیں۔ ایک بڑے آدمی یا ایک بڑا مسلمان......

دلچسپ یہ تھا کہ اس چھوٹے سے نیپکن کے ٹکڑے میں برسوں کی تاریخ سما گئی تھی۔

دلّی کی جامع مسجد۔ مغلوں کی حکومت...... تہذیب کے سنہرے برس یا ماضی کے جھروکوں میں بند تہذیب کی نشانیاں — اردو اخباروں سے اُچھل اُچھل کر دل و دماغ میں جگہ بناتے امام بخاری اور اُن کے خاندان کی تاج پوشی کی خوبصورت کہانیاں — دیکھا جائے تو سب کچھ یکا یک ہوا تھا۔ دلّی، جامع مسجد، بخاری اور نیپکن — یکا یک ہی — اگر اسے صرف محاورہ نہیں مانا جائے تو پیالے میں 'طوفان' جمع ہو گیا تھا۔

تین بیویوں والے صلاح الدین قریشی کو جیسے من مانگی مرادیں مل گئی تھیں۔

●

سیاست کا نشہ یکا یک نہیں چڑھتا۔ آہستہ آہستہ چڑھتا ہے اور جب چڑھتا ہے تو آنکھوں پر کالی پٹی باندھ دیتا ہے۔ دور کیوں جائیں، بچپن میں صلاح الدین قریشی نے ابا کے ساتھ فتوحہ کی سڑکوں پر وہ منظر دیکھا تھا۔ جادوگر کھرانا آنکھوں پر پٹی باندھے موٹر سائیکل دوڑا رہا تھا — فتوحہ، مین روڈ کے دونوں طرف، آنکھوں میں چمک لئے کھڑے لوگوں کے درمیان یہ دانتوں سے انگلی کاٹنے والا منظر تھا —

'سب نظر بندی کا کمال۔'

ابا کہتے تھے — ہنستے تھے — 'وہ اپنی نہیں، تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ دیتا ہے۔

ہو ہو'

'لیکن......'

’آنکھ بند کر چل سکتے ہو کیا؟ ہو s ہو s پھر ابا دنیا بھر کے جادوگروں کے قصے لے کر بیٹھ جاتے۔ ایسی ایسی کہانیاں، ایسے ایسے کرشمے، کہ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے، ابا کو دیکھ رہا ہوتا۔ تب پہلی بار مذہب کے کرشمے کے بارے میں بھی، اُس کے دل میں ایک چھوٹا سا وہم پیدا ہوا تھا۔ بڑے بھائی، سلیمان قریشی جو اُس سے کم سے کم 10-9 سال بڑے تھے، سمجھایا تھا۔

’جادوگروں اور پیغمبروں میں فرق ہوتا ہے۔ مذہب ایک اندھے عقیدے کا نام ہے۔ راستہ ذرا سا بھی مڑا تو دوزخ کا دروازہ حاضر......‘

تب یہی کوئی پندرہ سال کی عمر رہی ہوگی۔ بڑے ہوتے صلاح الدین قریشی کے دماغ میں گھرانا جادوگر، موٹر سائیکل اور پٹی بندھی آنکھوں کی جو تصویر کل سمائی، اُس نے پھر حافظے سے نکلنے کا نام نہیں لیا۔ ہاں، بڑے ہونے تک وہ اس نتیجے پر ضرور پہنچ چکا تھا کہ سیاست کی جادوگری، جادوگر کے کرشمے سے بھی کہیں زیادہ بڑی اور بھیانک ہے اور یہاں جو کرشمہ ہوسکتا ہے، وہ بڑا سے بڑا جادوگر بھی نہیں دکھا سکتا۔ یہی وہ وقت تھا، جب مذہب ناگ پھنی کے پودے کی طرح صرف چھونے کے احساس سے بھی چبھنے لگا تھا۔ کبھی ڈھیروں سوال کھڑے کرتا۔ اُڑن کھٹولے سی فنتا سی، کہانیاں، جادوگر کے ڈبّے سے نکلنے والے چوزے کی طرح اُسے گھیر کر بیٹھ جاتے۔ الگ الگ کمروں میں عقیدت واحترام سے نماز ادا کرتے بھائی بہنوں کا چہرہ نظر آتا تو کھڑکی سے باہر جھانکتی آنکھوں میں ایک لمحہ کو شرمندگی کا احساس پیدا ہوجاتا۔

امّی کہتی ـــــ ’نماز پڑھا کر بیٹے۔ طبیعت کو سرشاری ملتی ہے۔‘

ہاتھوں میں تسبیح لئے ابا اُس کے پاس آ کر رُک جاتے۔ ’اب بڑے ہوگئے ہو۔ جتنا کہنا تھا۔ کہہ لیا لیکن ـــــ نماز پڑھو گے تو روح کو ٹھنڈک ملے گی۔ ویسے بھی ماحول اچھا نہیں ہے......‘

’ماحول......؟‘

ابا کے ساتھ ٹہلتے ہوئے صلاح الدین کی آنکھوں میں کتنے جلتے دیئے ایک ساتھ لرز کر رہ جاتے۔

ابا آہستہ آہستہ لفظ چبا رہے ہوتے ـــــ ’میاں آہستہ آہستہ سب کچھ ختم ہو رہا ہے ہمارا۔ پہلے لباس گیا۔ پھر نشانیاں ـــــ تہذیب کی اپنی نشانیاں ہوتی ہیں۔ کل جن پر ہم فخر کیا کرتے تھے۔ صدیوں کی بادشاہت۔ تاریخی مقامات۔ وقت میں بھی دیمک لگتی ہے

صاحبزادے...... ہے...... ہے...... تہذیبوں کے چراغ گل ہو گئے۔ پچھلی بار دلّی گیا تو آنکھوں میں آنسو آ گئے۔'

'کیوں بھلا؟'

'جامع مسجد کا کیا حشر کر دیا ہے جاہلوں نے۔ اردو بازار ایک گندہ مچھلی بازار بن کر رہ گیا ہے۔ یہ محض عمارتیں نہیں ہیں صاحبزادے۔ تہذیبی وراثت ہیں۔ نشانیاں ہیں۔ انہیں کھو کر ہم کہیں نہیں ہیں۔ ایک راز کی بات سنو......' ابا کی سرمہ لگی آنکھوں میں فانوس روشن تھے ____

'سیاست میں اب اِسی دروازے سے آنا ہوگا۔'

'یعنی جو راستہ اردو بازار سے ہو کر جاتا ہے......؟'

ابا چپ تھے۔

'اردو بازار سے جامع مسجد اور لال قلعہ تک۔ لال قلعہ سے......؟'

ابا ایک بار پھر خاموش تھے۔

'سیاست نہیں ابا۔ یہ راستہ مسلمانوں کی سیاست سے ہو کر جاتا ہے ____ ' صلاح الدین کے دل میں آیا کہ پوچھیں، کہ کیا سیاست میں آنے کے لئے اس راستے کی پونچھ پکڑنا ضروری ہے ابا ____ ؟'

لیکن تب تک جامع مسجد سے بلند ہونے والے سیاسی خطبوں نے بتا دیا تھا کہ ابا نے کتنا پہلے مسلمانوں کی سیاست کے دروازے کو دیکھ، جانچ اور پرکھ لیا تھا۔ پہلی بیوی کی اچانک موت، دوسری سے دل نہ ملنے اور طلاق دینے کے بعد تیسری قریشہ سے 'ٹانکا' جڑنے تک صلاح الدین سیاست میں آنے کا من بنا چکے تھے۔ وہ بھی مسلمانوں کی سیاست میں ____ لیکن وہ یہ بھی جان رہے تھے کہ معاملہ جتنا سیدھا سیدھا نظر آتا ہے، اُتنا ہے نہیں۔ بلکہ کہا جائے تو ٹیڑھی کھیر ہے۔

'بانس پر چڑھنے کا تجربہ رکھتے ہیں کیا؟ نہیں نا۔ پھسل جایئے گا......'

صلاح الدین کے سیاست میں آنے کی خبر ملتے ہی یہ پہلا جھٹکا ملا تھا، ربانی گوشت والے کی دکان سے ____ صبح صبح گوشت لانے والی عادت ابھی تک تبدیل نہیں ہوئی تھی۔ اس سے دو فائدے تھے۔ قاعدے سے دیکھیں تو ذات برادری۔ لیکن وقت کے ساتھ پیشے بدل گئے تھے۔ پہلے یہاں ربانی کا باپ بیٹھتا تھا اور ابا گوشت لانے جاتے تھے ____ لیکن بچپن سے ہی ابا

کی انگلیاں تھامے، قصائی ٹولہ کی گلیاں ناپتے صلاح الدین کو بھی اچھا بڑا گوشت بھُنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ کبھی کبھی کسی دن نہیں آنے پر ربانی مذاق بھی جڑ دیتا ____ 'آجایا کرو صلاح الدین بابو۔ گوشت کی بوٹیاں، کاٹھ کے ٹھیپے پر کاٹتا ہوا وہ دوسرا لقمہ جڑ دیتا ____ ایمان بھی تازہ رہتا ہے اور ذات برادری بھی...... وہ کیا کہتے ہیں...... 'انڈر اسٹینڈنگ' بھی باقی رہتا ہے......'

بس اسی بات پر صلاح الدین کے اندر تک آگ لگ جاتی تھی۔ س...... سالہ...... قریشی ہونے مطلب یہ تو نہیں کہ اُن کا خاندان بھی یہی کاروبار کرتا رہا ہو...... مگر وقت گزرتے ہی سیاست میں آنے کا خیال آتے ہی اُسے سمجھایا گیا تھا...... میاں پہلے اپنا ایک منچ تو بنالو ____ قریش منچ۔ رجسٹریشن کرالو ____ مہینے میں ایک بار میٹنگ کرلو۔ اردو اخبار تو کچھ بھی چھاپتے رہتے ہیں۔ لیٹر پیڈ پر رجسٹریشن نمبر ہوگا تو آپ کی ہر خبر شائع ہوگی۔ یہی تو راستہ ہے میاں۔ 'بڑی سیاست' میں جو بھی واقعہ پیش آتا ہے، قریش منچ کے پیڈ پر ایک خبر بنا کر بھیج دو۔ ہر پارٹی کو ایسے ہی لوگوں کی ضرورت پڑتی ہے، جن کے پاس 25-20 لوگ ہوں۔ ضرورت پڑے تو قصائی ٹولہ کے چھوکروں کو ٹرک میں بیٹھاؤ اور نیتا کے گھر اپنی طاقت کا مظاہرہ کرآؤ۔ یہی شارٹ کٹ ہے میاں جی ____ سب یہی کرتے ہیں...... خبریں چھپنے لگیں گی تو لوگ بھی جاننے لگیں گے۔ نیتا لوگ بھی پوچھیں گے ____ کون ہے یہ صلاح الدین قریشی ____ بس بن گئی نا دھاک۔ سینہ چوڑا کرو اور قریشی برادری کا نام اونچا کرو۔

مگر 'بانس پر چڑھنے' کا تجربہ والی بات کہہ کر ربانی گوشت والے نے صلاح الدین کے، سیاست کی طرف بڑھتے پاؤں کو روکنے کی کوشش ضرور کی تھی اور یہاں بھی سیاست سے بھرا ہوا داؤ کھیلا تھا صلاح الدین نے۔ آنکھیں بھر کر دیکھا ربانی کو۔ کپڑے اُدھاڑے بیٹھا تھا۔ چالیس، بیالیس کی عمر۔ آس پاس والے سب ڈرتے تھے اُس کے نام سے۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا۔ کئی قتل کر چکا ہے۔ مگر پولس ہاتھ رکھنے سے ڈرتی ہے۔

آنکھ بھر کر دیکھا صلاح الدین نے۔ پھر ریل کو پٹری پر لانے کی کوشش کی۔

'کیوں ____ ؟ پھر کوئی بانس پر چڑھے ہی نہیں، کیونکہ تجربہ نہیں ہے......؟'

یہ تو میں نے نہیں کہا...... گوشت کاٹتے کاٹتے ربانی چونکا۔

'ہم تو منچ بنا چکے ہیں ربانی بھائی...... 'یہ صلاح الدین کی طرف سے پھینکا گیا سکسر

تھا......

'کیا؟'

دیکھتے نہیں۔ دیش بھر میں مسلمانوں کا، کیا حال ہو رہا ہے۔ توڑنے والے مسجد توڑ کر مندر بنا دیتے ہیں اور جو یہاں کی بھی مسجد توڑی جانے لگی تو......؟'

لال آنکھیں لئے لوہے کے 'چاپڑ' کو گھڑاک سے کھلی پر دے مارا ربانی نے...... آنکھیں غصے میں اُبل رہی تھیں۔ 'کوئی ایسا کر کے دکھائے تو...... دس...... پندرہ...... ایک سانس میں وزنی گالیوں کا بخار کم پڑا تو صلاح الدین مسکرائے......

'اب بتایئے۔ منچ چاہئے کہ نہیں۔ آپ کہتے ہیں۔ بانس پر کون چڑھے گا۔ اِدھر تو ہم بانس پر چڑھنے کا من بنا چکے ہیں۔ آپ چڑھائیں گے بانس پر۔ آپ کے ساتھ ہم چڑھیں گے۔ اب بولئے......

'معنے......؟'

'معنے یہ ربانی بھائی کہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے......'

ربانی نے اپنے لئے بھائی کا لفظ سنا تو اُس کا سینہ چوڑا ہو گیا......

'مطلب سمجھایئے۔'

'قریش منچ کے آپ سکریٹری ہیں آج سے ___ دفتر ہو گا، ہمارے گھر کے پچھواڑے والا کمرہ۔'

'ہم سکریٹری ہیں......'

گوشت کاٹنا چھوڑ ربانی نے پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا۔ چاپڑ اور کھلی کو کنارے کرتے ہوئے، گوشت کا پوتھن تھما کر، 'اُگھاڑی' ہوئی شرٹ دوبارہ ننگے بدن پر ڈال کر ایسے اُٹھا، جیسے کوہ نور ہیرا حاصل ہو گیا ہو......

'آپ عظیم ہیں صلاح الدین بابو......'

'نہیں۔ اس میں عظیم ہونے جیسی کوئی بات نہیں۔ منچ بن چکا ہے۔ کل کو ہم پارٹی سے بھی جڑیں گے یا اپنی پارٹی بنائیں گے۔ مگر طے رہا۔ آپ ہمارا ساتھ دیں گے۔'

'یہ بھی بھلا پوچھنے کی بات ہے۔'

صلاح الدین کے تیزی سے بڑھتے قدم کو ایک بار پھر ربانی گوشت والے نے ٹوکا

تھا___

سُنیئے..... سُنیئے صلاح الدین بابو۔ وہ کیا کہتے ہیں..... لیٹر پیڈ پر ہمارا نام چھپے گا

نا.....'

'کیا بات کرتے ہیں آپ۔ سکریٹری ہیں۔ آپ کا نام نہیں چھپے گا تو کس کا چھپے گا.....'
ربانی کی آنکھوں میں چمک تھی___ ایسی چمک جو تازہ گوشت میں ہوتی ہے۔

2

سیاست کا پہلا قلعہ اس آسانی سے فتح ہو جائے گا، یہ سوچنا بھی صلاح الدین کے لئے مشکل تھا۔ ربانی کو شامل کئے جانے والی بات پر پہلا اختلاف تو گھر سے ہی شروع ہوا۔ قریشہ نے ڈرائنگ روم میں زور زور سے ہونے والی گفتگو سن لی تھی۔ چائے کے بہانے 'ذرا ادھر تو آیئے' کا فرمان جاری کرنے والی قریشہ کے چہرے پر ناراضگی تھی.....

'کیا بات کرتے ہیں..... وہ گوشت والا.....'
'تم نہیں سمجھوگی قریشہ.....'
'اب وہ گوشت والا آپ کی برابری کرے گا۔ یہی سمجھانا چاہتے ہیں نا آپ.....؟'
'نہیں، یہ نہیں سمجھانا چاہتے ہیں.....'
'پھر کیا سمجھانا چاہتے ہیں۔ آپ ہی بتایئے.....'
'باہوبلیوں کا زمانہ ہے۔ ٹی وی نہیں دیکھتی ہو کیا۔ جیسے اکھاڑے میں پہلوان اُتارے جاتے ہیں، ویسے آج کل پارٹی میں یہ' باہو بلی' اُتارے جاتے ہیں.....

قریشہ کے چہرے پر آنے والی چمک نے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ میاں کی سیاست کے اس توڑ کو سمجھ چکی ہے۔ صلاح الدین نے آرام کی سانس لی۔ قریشہ تو مان گئی لیکن شاید ابا حضور کا زمانہ ہوتا تو وہ ہرگز نہیں مانتے۔ لمحہ بھر میں صلاح الدین ایوبی سے لے کر اسلامی تاریخ کے اوراق اُلٹ پلٹ دیئے جاتے۔ جس کا مفہوم ہوتا کہ اسلام' باہوبلیوں' یا تلوار کے بل پر نہیں، اپنے اعمال سے پھیلا ہے۔ یہ تو یہودیوں کی سازش ہے کہ ساری دنیا میں مسلمانوں کو بدنام کر دیا جائے۔

ابا کے انتقال تک گھر کا بٹوارہ ہو چکا تھا۔ سلام بھائی کے گھر کے آگے بندھی ہوئی خصّی، بکریوں کی فوج اُسے ناگوار گزرتی تھی۔ وہ پنج وقتہ نمازی تھے۔ گھر میں بچے بچیوں کی لمبی

فوج تھی، جن کی روزانہ کی چیخ وپکار بٹوارے والی دیوار سے آتی ہوئی صلاح الدین قریشی کے مزاج کو ناگواری میں بدل دیتی تھی۔ کہاں تو نمازی پرہیزگار ـــــ ہر سال بچوں کی لائین لگا دی ـــــ ٹھیک ہے، بچے ہو گئے تو اُن کی ڈھنگ سے پرورش تو کیجئے ـــــ بس، مسلمان صرف آبادی بڑھانے پر دھیان دیتے ہیں۔ اس لئے آر ایس ایس والے اِن سے چڑھتے ہیں۔

پہلے چھوٹا سا کباڑ کا بزنس شروع کیا صلاح الدین قریشی نے۔ بزنس میں فائدہ ہوا۔ چودہ طبق روشن ہو گئے ـــــ مگر 'صلاح الدین کباڑی والے' کا نام اُن کے 'ایستھیٹک' کو بوجھل کر دیتا تھا۔ پیسے کی ریل پیل شروع ہو چکی تھی۔ فتوحہ مین مارکیٹ میں کپڑوں کی دکان کھل گئی۔ قسمت یہاں بھی چمکی۔ دیکھتے ہی دیکھتے مین مارکیٹ میں کپڑوں کے تین شوروم کھل گئے۔

کہتے ہیں، پیسے آتے ہیں تو آگے کے دس دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ پھر کیا تھا، ایم ایل اے اور ایم پی کے یہاں بھی آنا جانا شروع ہو گیا اور یہ وہی پارٹی تھی، جہاں پہلی بار صلاح الدین قریشی نے 'نیپکن' کا استعمال کیا تھا ـــــ نیپکن کو نمکین سمجھنے والی بات پر ٹھہا کہ لگاتے ہوئے ایم ایل صاحب نے ہی سب سے پہلے اُسے سیاست میں آنے کی دعوت دی تھی۔

'ہم آپ کا احسان بھولے نہیں ہیں۔ الیکشن میں آپ کے لوگوں نے بڑی مدد کی ہے......'

'سو تو ہے...... اب آپ ہماری مدد کیجئے نا......'

'سب سے پہلے اپنے شہر کے مسلمانوں کو جوڑیئے، میرا مطلب ہے، ایک کیجئے ـــــ چلئے مانتے ہیں، قریشی برادری پر آپ کا کنٹرول ہے اور باقی برادری پر ـــــ؟ ہم تو ایسے ناپتے ہیں صلاح الدین صاحب......' ایم پی نے کھانے کے بعد باہر نکلی آرام چیئر پر اپنے پاؤں پسارتے ہوئے کہا ـــــ 'سمجھئے' ہی یاں روپئے میں دس آنا مسلمان ہیں تو آپ کے حصے میں ایک آنا بھی نہیں آیا ـــــ پورے دس آنا کو اپنے قبضے میں کیجئے نا......'

'لیکن یہ کیسے ہوگا......'

'تھوڑا اس شہر سے باہر نکلئے ـــــ باہر ـــــ ایک پالٹکس جامع مسجد کی بھی ہے ـــــ ہے کہ نہیں؟ وہاں بھونپو پر بخاری ایک بات بولتے ہیں۔ ہی یاں آگ لگ جاتی ہے ـــــ کا ہے؟ کا ہے کہ دلّی کی جامع مسجد بولتی ہے......'

'وہ امام ہیں بڑے آدمی ہیں ـــــ' صلاح الدین قریشی کہتے کہتے ٹھہرے۔

'آپ لوگ اُن کی آواز پر ناچتے ہیں کہ نہیں — ؟'

'سب ناچتے ہیں۔'

'کاہے ناچتے ہیں؟ امام ہیں تو نماز پڑھائیں۔ پولٹکس میں آنے کی کیا ضرورت تھی...... 'مسکراتے ہوئے ایم ایل اے صاحب نے گولڈ فلیک کا سگریٹ جلالیا۔ مسکرائے — 'تو مانتے ہیں نا آپ — کہ سیاست میں دم ہے۔ سیاست سب کو نچا سکتی ہے۔ آپ بھی ناچئے......'

'ہم کیسے نچائیں — اور ایک بات جان لیجئے۔ امام صاحب کی مسلمانوں پر گرفت کمزور ہوگئی ہے۔ جب سے انہوں نے فرقہ پرست پارٹی کا ہاتھ تھاما ہے، مسلمان اُنہیں اپنا نیتا تسلیم نہیں کرتے......'

'یہی تو...... یہی تو آپ غلط سوچتے ہیں صلاح الدین۔ ایم ایل اے صاحب سنجیدہ تھے — 'اس ملک میں مسلمانوں کی آواز آج بھی امام ہیں۔ آپ نہیں ہیں۔ وہ پارٹی بدلیں یا بلڈر بن جائیں — سرکار کو مسلمانوں کے کسی بھی مسئلہ پر بات کرنی ہوگی نا، تو وہ آپ کے پاس نہیں آئیں گے۔ امام کے پاس ہی جائیں گے — باقی معاملے، مقدمے بازیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں — سیاسی سنکٹ کو کیسے ٹالنا ہے، یہ آپ نہیں امام جانتے ہیں اور جان لیجئے۔ آج کے زمانے میں بدلو اور دل بدلو کچھ نہیں ہوتا۔ نام بکتا ہے — لوگ، پچھلا، ماضی سب کچھ بھول جاتے ہیں — آپ پہلے امام صاحب کی پونچھ پکڑیئے — تھوڑا لائم لائٹ میں آیئے۔ پھر مرضی آپ کی — چاہیں تو آپ اُن کی پونچھوا چھوڑ دیجئے۔ جس پارٹی کی چاہیں، پونچھ پکڑ لیجئے اور ہاں سنئے۔'

'کیا؟'

'سنا ہے وہ کوئی اپنی مسلم پارٹی بنانے جا رہے ہیں۔ انہیں پورے دیش کے مسلمانوں کا ساتھ چاہئے — 'ایم ایل اے صاحب ہنسے تھے — پونچھ پکڑنے کا یہ بالکل صحیح ٹیم ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ یہی ہے...... رائٹ چوائس بے بی...... اہا'۔

3

حقیقت یہ ہے کہ امام بخاری کی نیپکن سے سیدھے سروکار ہونے کا قصہ بھی یہیں سے

جڑا تھا___ اور سچ پوچھئے تو ایک وقت تھا، جب بڑے بخاری کی ایک آواز سے پورے ملک کے ماحول میں گرمی آجاتی تھی۔ لوگ انتظار کرتے تھے۔ کب جمعہ آتا ہے، کب دلّی کی شاہی مسجد سے مسلمانوں کے لئے نیا فرمان جاری ہوتا ہے۔ صلاح الدین قریشی، شاہی مسجد اور بخاریوں کے 'نشاۃ ثانیہ' سے واقف تھے۔ کہاں تو سمرقند و بخارا اور کہاں جامع مسجد سے جڑی ہوئی شاہی وراثت___ لیکن اس شاہی وراثت میں پہلے بھی کم پیوند نہیں لگے___ جب ایمرجنسی کے دنوں میں اندراجی کی بات پر، 'نسبندی پر مسلمانوں کا جھکاؤ' جیسے فیصلے پر بڑے بخاری نے آرام سے قرآن اور حدیث کی روشنی میں اپنا فیصلہ جاری کردیا تھا___ کیا ہندی اور انگریزی اخبار___ اردو اخباروں میں تو بخاری ہی بخاری تھے___ تب ٹی وی کہاں تھا___ چینل کہاں تھے___ کالے چشمے اور رعب دار سفید چہرے والی تصویر اپنے آپ میں کافی تھی۔ جس کا خوف آرام سے ہندو محلے میں محسوس کیا جاسکتا تھا___ لیکن یہیں سے بڑے بخاری کے لئے مخالفت کا بازار بھی گرم ہوا تھا۔ سیدھے سادھے کٹرپنتھی مسلمانوں کو نسبندی کرائے جانے کی بات آسانی سے ہضم نہیں ہوئی۔ کچھ نے تو اُسے مغل شاہی مسجد کے حجرے میں، وزیراعظم کے ذریعہ بھیجے گئے نمائندے سے خفیہ اور منافع بخش سمجھوتے کا نام دیا تھا۔ تب ایک زمانہ تھا، جب بڑے بخاری کے خلاف میں لکھی گئی تحریریں یا اخبار و رسائل جامع مسجد کے گلیاروں میں نذر آتش کردیئے جاتے تھے لیکن 'اس خفیہ سمجھوتے' سے مخالفت کا بازار بھی کھلا، ساتھ ہی مستقبل میں آنے والی حکومتوں کے لئے بھی___ مسلمانوں کے ہر طرح کے مسائل کو سلجھانے کے لئے، شاہی مسجد کے دروازے کھل گئے۔

کہتے ہیں دلّی بولتی ہے اور سارا ہندستان سنتا ہے___ شاہی مسجد کے گلیاروں سے نکلتی آوازیں فتوحہ کے گلی کوچوں میں بھی آرام سے پھیل جاتی تھیں___ تب ابا زندہ تھے___ ابا جو کہا کرتے تھے___ کہ قومیں اپنی نشانیوں سے پہچانی جاتی ہیں...... لیکن ان نشانیوں کے پالنہار اب سمجھوتہ پرست ہوگئے ہیں۔ موقع پرست___ ایسے موقع پرست، مسلمانوں کے قائد نہیں ہوسکتے۔ برصغیر کی 800 سالہ مسلم دور حکومت میں بنائی گئی مسجدیں اور یادگار آج زوال کے قریب ہیں تو ان کا ذمے دار کون ہے___؟ ابا، مولانا عبدالکلام آزاد جیسے کمزور مسلمان رہنماؤں کی مثال لے کر آجاتے تھے۔ جن کی کانگریس سے خوشامد اور چاپلوسی کی کہانیوں نے کتاب لکھنے اور رسالہ نکالنے سے الگ، کبھی انہیں ایک بہتر قائد بننے نہیں دیا___

ابّا کہتے تھے ـــــ 'آٹھ سو برسوں کی حکومت۔ بھلانے میں وقت لگتا ہے بیٹے۔ وشو ہندو پریشد جیسے نیتاؤں کو یہی تو ہضم نہیں ہوتا'

لیکن ابّا اپنی داستانوں میں مغلیہ حکومت کے زوال اور انگریزوں کے عروج کا قصہ مسلم حکمراں کی کمزوریوں اور عیاشیوں سے تعبیر کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ذرا سی کرسی اور پاگل پن کا نشہ تغلق سے بخاریوں تک پھیلا ہوا تھا ـــــ ایک بار تنقید کے دروازے کھلتے ہیں تو تسلیوں کے دس دروازے بھی کھل جاتے ہیں۔ اُنہی دنوں چھوٹے بخاری کے امام سے 'بلڈر' بن جانے کا بھی دھماکہ ہوا تھا ـــــ پھر بجرنگ اور شیو سینا کے طرز پر 'آدم سینا' بنانے اور آدم سینا' میں شامل ناموں کو سرکاری خفیہ فائل تک پہنچانے کا معاملہ بھی سامنے آیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ شاہی وراثت کے مینار اور گنبد ذرا سا دھندلے پڑ گئے تھے ـــــ شاہی مسجد سے آتی صداؤں میں اب پہلے جیسی گرمجوشی اور تمازت نہیں رہ گئی تھی۔ کالے فریم سے جھانکتی آنکھیں اپنا خوف اور رتبہ کھو رہی تھیں ـــــ ملک میں فرقہ پرستی کے رتھ گھومنے، بابری مسجد کے مسمار ہونے کے بعد سے لے کر مسلم سیاست میں اُٹھا پٹک تو کافی ہوئی لیکن دوسرے مسلم نیتاؤں کے ساتھ بخاری خاندان کا اثر بھی زائل ہوتا رہا ـــــ ایک وقت وہ بھی آیا جب بڑے بخاری مسلسل اپنی مخالفت سے گھبرا کر، اپنا تاج اپنے بیٹے کو سونپ کر، شاہی محل کے گلیاروں میں اوجھل ہو گئے ـــــ نئے امام بنے بخاری حکمراں، فرقہ پرست پارٹی کا ساتھ دینے کے لئے نہ صرف بدنام ہوئے بلکہ رہی سہی کسر چھوٹے بخاری نے پوری کر دی، جو بہار کے چھوٹے شہروں سے فتوحہ تک حکمراں پارٹی کی حمایت میں لگاتار دورے کر رہے تھے۔

صلاح الدین قریشی ایک بھیانک 'اگنی پریکشا' سے گزر رہے تھے۔ سچ اور غلط کی تعریفیں کسی قدیم زمانہ کی یاد دلاتی تھیں۔ کہاں اس گلوبل تہذیبی، گاؤں میں ماضی کے ایسے اوراق یاد رکھے جاتے ہیں ـــــ یاد رکھا جاتا ہے تو صرف حال۔ ممکن ہے آپ کا مستقبل خوبصورت ہو اور آپ کا حال شاندار ـــــ مگر آپ کا ماضی تو وہی رہتا ہے۔ آلودہ اور داغدار ـــــ

ابّا کی باتیں کہیں دُھند میں اُتر گئی تھیں۔ قریش منچ کی آئندہ میٹنگ میں بخاری کو خط بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ جسے تھوڑی بہت تنقید کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ قریش منچ کے خوبصورت لیٹر پیڈ پر، محلے کے صحافی نبی احمد سے لیٹر ڈرافٹ کرایا گیا اور خط شاہی مسجد کے پتہ پر بھیج دیا گیا اور

اتفاق دیکھئے ــــــ ایک ہی ہفتہ کے اندر جامع مسجد کے خوبصورت لفافے اور پیڈ پر جواب بھی آگیا تھا۔ فوراً ملنے کو کہا گیا ــــــ بلکہ یہ بھی لکھا گیا تھا کہ ہو سکے تو بیوی اور بچوں کے ساتھ آیئے ــــــ

قصہ کوتاہ، لنگی جیسے دکھنے والی نیپکن کی کہانی تھوڑا اور آگے بڑھی۔

4

چارخانے کی لنگی، وہ بھی گھٹنے تک موڑ کر باندھنے والے، ربانی گوشت والے سے شروع شروع میں، صلاح الدین کو پریشانیوں کا سامنا تو کرنا پڑا لیکن برادری والوں کو ایک جٹ کرنے میں اُس کا بڑا ہاتھ رہا ــــــ چارخانوں کی لنگی کی جگہ اُس نے کُرتا پائجامہ بھی پہننا شروع کر دیا تھا۔ اردو اخباروں میں قریش منچ کی چھپی خبروں میں اب اُس کا نام بھی آنے لگا تھا۔ یہ سب باتیں ربانی کو اب بڑا آدمی سمجھنے میں مدد دے رہی تھی اور ربانی گوشت والا ان سب کے لئے صلاح الدین کا شکر گزار تھا، جس نے چاپڑ سے بوٹی بوٹی گوشت کاٹنے والے کے اندر ایک مسلم سیاستداں کو ڈھونڈ نکالا تھا...... اور بقول ربانی، 'پالیٹشین' ایسے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی آسمان سے تھوڑے ٹپکتے ہیں......'

ربانی گوشت والے کی دو ایک باتوں سے صلاح الدین کو شروع شروع میں الجھن کا سامنا تو کرنا پڑا لیکن بعد میں اُس کے بھی نتیجے اچھے نکلے۔ جیسے ایک بار اُس کی غیر موجودگی میں ربانی نے قصاب ٹولہ کے قصابوں کی ایک ایمرجنسی میٹنگ بلالی ــــــ مدّعا تھا گوشت کی قیمت میں اضافہ اور دوسرا، قصاب کے پیشے کو عزت کی نظروں سے دیکھا جائے ــــــ اُن دنوں وہ کپڑے کے شوروم کی خریداری کے لئے باہر گیا تھا۔ واپس آنے پر پٹنہ سے شائع اردو اخباروں میں ربانی کی چھپی خبروں پر اُسے تعجب کی بجائے غصہ آیا لیکن اس کا اظہار کرنے سے وہ قاصر تھا ــــــ لیکن اسی کا دوسرا پہلو تھا، جو اُسے ایک صحافی دوست نے سمجھایا کہ عوام کے درمیان بڑی بڑی خبروں کی بجائے ایسی خبروں کا اثر زیادہ ہوتا ہے جو چھوٹے طبقے سے وابستہ ہوں ــــــ خاص طور سے جن میں چھوٹے چھوٹے مسائل پر دھیان دیا گیا ہو ــــــ ہاں ایسی خبروں سے قریش منچ کو فائدہ ہوا لیکن زیادہ اُچھل کود مچانے اور نئی تکنالوجی کے غیر ضروری استعمال سے ربانی گوشت والے کو کافی نقصان بھی سہنا پڑا تھا ــــــ ہوا یوں کہ اُس میٹنگ کے بعد، دبئی اور یو اے ای سے

آنے والوں کے منہ سے ڈبہ بند گوشت کے بارے میں سنتے سناتے ربانی نے اپنے پیشے کو نئی تکنالوجی کے آئینہ میں اُتارنے کی پہل کر ڈالی۔ ٹین کے ایک سائز کے ڈبے خریدے گئے ـــــ 'قریش مٹن کارنر' کا لیبل چپکایا گیا ـــــ ربانی تو اُس پر قریش منچ کا لیبل چپکانا چاہتا تھا، لیکن منچ سے جڑے لوگوں کی مخالفت کا ڈر بھی تھا ـــــ فتوحہ میں سائنس پڑھنے والے طلباء سے مشورہ ہوا۔ پلیٹ کے اندرونی حصّے کو سوڈیم اور کیلشیم کے ذریعے جمانے کی کوشش کی گئی۔ شروع میں ایسے 100 ڈبوں کو جانچ کے طور پر تیار کرنے کی ذمے داری تھی مگر بُرا ہو سائنس کا، جس نے کبھی بھی ربانی جیسے لوگوں کا ساتھ نہیں دیا ـــــ ڈبے سے بدبو آنے لگی ـــــ ناکام تجربہ کا وقت وہی تھا، جس کے ٹھیک دوسرے دن صلاح الدین اپنی بیوی قریشہ کے ساتھ امام بخاری سے ملنے کے لئے ٹرین پکڑنے والے تھے۔ ڈبہ بند گوشت کے ناکام تجربہ کے باوجود مطمئن، ربانی اور منچ سے وابستہ دوسرے لوگ ٹرین تک دونوں شوہر بیوی کو چھوڑنے آئے۔ سارا معاملہ سیاست سے جڑا ہوا تھا ـــــ جیسے وہاں سے واپس آتے ہی صلاح الدین قریشی، مسلم سیاست میں کسی نئے باب کی شروعات کرنے جارہے ہوں۔

دلّی پہنچنے، جامع مسجد کے قریب رفیق ہوٹل میں کمرہ لینے، فون پر گفتگو کے بعد دوسرے دن سات بجے ملنے کا وقت طے ہوا اور رات کا کھانا ساتھ میں کھانے کی دعوت مل چکی تھی۔ پتہ نہیں کیوں، اِن سب سے گزرنے کے دوران اُسے وہ منظر بار بار یاد آتا رہا، جو اُس نے فتوحہ کی سڑکوں پر ـــــ آنکھ پر پٹی باندھے موٹر سائیکل چلاتے جادوگر کو ابّا کی انگلیاں تھامے کبھی دیکھا تھا۔

5

ابّا نے کہا تھا ـــــ تہذیبیں اور قومیں اپنی نشانیوں سے بھی جانی جاتی ہیں ـــــ لیکن نشانیاں کہاں ـــــ دھندلی ہوتی نشانیوں کے ساتھ پرانی دلّی کے بازار آباد تھے ـــــ اردو بازار، مچھلیوں کی بدبو اور سڑک پر افراتفری کے ماحول کوئی نئے نہیں تھے۔ نئے تھے تو اِس بار دیوار پر لگے ہوئے، امام مخالف پوسٹر، جن کے بارے میں صلاح الدین نے سنا تو تھا، لیکن ایسے 'تاریخی پوسٹروں' کے دیدار پہلی بار ہوئے تھے۔

شام کی بتیاں جل چکی تھیں۔ پرانے بازار کی رونق اپنے عروج پر تھی۔ جامع مسجد کے

ٹھیک پیچھے بنا جنت نشاں، مغلیہ سلطنت کے دور کی یاد دلانے کے لئے کافی تھا۔ یہی وہ جگہ تھی، جہاں امام نے اُن کی ملاقات کی جگہ مقرر کی تھی۔ صلاح الدین نے سن رکھا تھا کہ اس جنت نشاں میں کچھ بیش قیمت جنگلی پرندے بھی ہیں۔ جیسے کرشن مرگ، بلیک بک، پاڈا ہرن، ہاگ ڈیر۔ وہی جنگلی جانور جن کے 'غیر ضروری استعمال' پر منیکا گاندھی کا قہر برستا تھا، یا سلمان خاں جیسے ہیرو کو جیل کی ہوا کھانی پڑتی تھی...... لیکن امام کا معاملہ اور پولیس ایسے 'مذہبی سنتوں' کی مخالفت میں کھڑی نہیں ہوسکتی۔ جامع مسجد کی لمبی، نہ ختم ہونے والی سیڑھیاں بتا رہی تھیں کہ اسی، پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک، مسلم سیاست کے تمام داؤ پیچ کھیلے جاتے ہیں...... اِن سیڑھیوں سے گزرنے اور جنت نشان میں پہنچنے تک صلاح الدین کی جگہ قریش منچ کا ڈائریکٹر لے چکا تھا۔ جسے آنے والے مستقبل کی تیاریوں کی اینٹ یہیں سے رکھنی تھی ــــ پہلی اینٹ۔

جنت نشاں کے باغوں میں قمقمے روشن تھے۔ قریشہ کے لئے سب کچھ نیا تھا اور حیرت میں ڈالنے والا۔ میاں جی کی حیثیت اور بڑھتے رتبے سے ایسا سروکار شاید پہلی بار ہوا تھا۔

پھر جیسے ایک جھما کہ ہوا۔ بخاری آگئے تھے۔ اُن کے شامل کچھ لوگ تھے، جن سے آہستہ لب ولہجہ میں بات کرتے ہوئے اُنہوں نے پلٹ کر اُن دونوں کی طرف دیکھا تھا۔ پھر امام نے کچھ اشارہ کیا۔ ایک نوکر نفیس ٹرے میں شاہی چائے اور کچھ میووں کی پلیٹ رکھ کر کچھ دور پر کھڑا ہوگیا۔ بخاری نے قریب آکر سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور خبر پوچھی۔ قریشہ سے پوچھا ــــ دلّی پہلی بار آئی ہیں، یا پہلے بھی آئی تھیں، پھر جواب کی پروا نہ کرتے ہوئے، سیدھے اپنی گفتگو پر آ گئے۔

'آزادی کے بعد مسلمانوں کی حیثیت کو کسی نے بھی نہیں سمجھا۔ ایک نے بھی نہیں'......

وہ تھوڑا رُکے، گلا کھکھار کر پھر بولے۔ 'آپ کیا سمجھے۔ ہم پارٹی بدل رہے تھے۔ مسلمانوں کی آزمائش تھی تو آزمائش ہماری بھی تھی۔ کہاں چلیں، کدھر چلیں۔ کانگریس کو بھی دیکھا۔ پھر سوچا بھاجپا کو بھی دیکھا جائے۔ دیکھنے میں کیا ہرج ہے۔'

چشمہ سے جھانکتی آنکھیں جیسے صلاح الدین کے اندر تک اُتر گئی تھیں ــــ 'آزادی کے بعد مسلمان بہت بری حالت میں رہے، آپ کو تو احساس ہوگا۔ ایک نفسیاتی ڈر کے سائے میں۔ اقلیت۔ آپ کو لگتا ہے کہ آپ کی اپنی پارٹی ہو، تو آپ زیادہ بھروسہ کرسکتے ہیں...... مسلمانوں کی پارٹی۔ مجھے ہر شہر میں ایسے لوگ چاہئیں جو ہماری نمائندگی کرسکیں۔ آپ کریں گے......؟

خوشبوؤں سے معطر فضا نے صلاح الدین کو کہیں اور ہی پہنچا دیا تھا ــــ کبھی یہاں

سے شاہی سواریاں گزرتی ہوں گی۔ ممکن ہے کبھی شاہی دربار بھی لگتے رہے ہوں۔ پھولوں کے گلیاروں سے آتی مہکتی خوشبوؤں کے درمیان وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ وہ یہاں کس مقصد سے آیا ہے......

''وہ ہمیں دلتوں سے بدتر بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں۔ سارے سرکاری چہرے ایک جیسے ہیں۔ سب مسلمانوں پر اپنی روٹیاں سیکنا چاہتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ آپ سیکنے دیتے ہیں۔ اس لئے، آپ سیکنے مت دیجئے___ آپ جانتے ہیں کہ وہ آپ کا کاروبار کر رہے ہیں۔ آپ اپنا کاروبار خود سنبھالئے___ اپنا مستقبل خود لکھئے___ ذرا سوچئے، سبھی ممکنات کے باوجود کیا آپ کی اقلیت آبادی کا کوئی شخص وزیراعظم ہوسکتا ہے___؟ ہوسکتا ہے___ آج نہ کل وہ اکثریت میں بھی آجائے۔ کیوں؟ کل کس نے دیکھا ہے___ اسی لئے چھوٹے شہروں میں چھوٹی سطح پر بھی مجھے آپ جیسے نمائندوں کی ضرورت ہے......''

چشمے کے اندر سے چمکتی بخاری کی آنکھوں نے پانسا پھینکا___ 'سوچئے مت ساتھ دیجئے۔ ساتھ دینے کا وقت ہے۔ تنقید کا وقت نہیں۔ پھر دیر ہو جائے گی...... مسلمانوں کو آپ جیسے سیاسی لیڈروں کی ضرورت ہے___ محنتی اور جاں باز۔ وہ آہستہ سے بولے___ اور جن کے پاس پیسہ کی بھی طاقت ہو۔'

ٹھیک یہی وقت تھا، جب خدمت گار نے آکر بتایا۔ کھانا لگ چکا ہے......

انتہائی لذیذ ترین کھانے کے دوران نیپکن نے اپنا جلوہ دکھایا تھا۔ صلاح الدین چپ تھے___ چپ سے زیادہ 'حیران' اور جذباتی___ جامع مسجد کے گلیاروں میں لگے مخالف پوسٹر اور دنیا بھر کے الزام سے الگ جو شخص سامنے تھا، وہ ہزاروں طرح کی مخالفت کے باوجود مسلمانوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی نمائندگی۔

سر پر آسمان روشن تھا۔ پھولوں کی کیاریوں میں قمقمے روشن تھے۔ جنت نشاں کے جنتی گلیارے میں آسمان کی ٹھنڈک کے سائے میں___ تمام سیاسی لفظوں کے ساتھ، بالکل اچانک کھانا ختم کرتے کرتے ایک لفظ چپکے سے داخل ہوگیا......

'نیپکن......؟'

'کیا؟'

'نے......پ......کن......'

پتھر کی میز پر چنے ہوئے مخملی دستر خوان پر، خوبصورت قابوں، پلیٹوں کے درمیان ایک انتہائی حسین گلاس میں گلدستے کی صورت نیپکن نظر آ رہے تھے۔ صلاح الدین نے مڑ کر دیکھا...... قریشہ نے کھانا ختم کرتے ہوئے ایک نیپکن نکال لیا تھا۔ انتہائی سفید خوبصورت نیپکن...... جیسے کوئی سفید طلسماتی چادر ہو، جس کا ذکر اُس نے 'داستانِ امیر حمزہ' جیسی کتابوں میں کبھی پڑھا تھا مگر صلاح الدین کو اُلجھن قریشہ کے اس طرح چونکنے اور پھسپھسانے کے لہجے پر ہو رہی تھی۔ کمبخت...... اِس میں حیرانی کی کون سی بات ہے۔ نیپکن دیکھا نہیں کیا___ جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو___ اب تو وہ گھر بھی لانے لگا ہے___ اور تو اور، دعوت پارٹی کے موقع پر بھی نیپکن کا ہی استعمال کرتا ہے...... مگر یہ نیپکن...... شاہی نیپکن، جس کے ذکر کے ساتھ جنت نشاں کی وہ وادیاں بھی شامل ہیں، جہاں کسی زمانے میں مغلیہ حکومت کی سرگوشیاں بھی اپنا سر نکالتی ہوں___

'سنئے نا...... رکھ لوں...... یادگاری کے طور پر......' ایک اُڑتی نظر امام صاحب کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے قریشہ، صلاح الدین کے کان کے پاس پھسپھسا رہی تھی......

'کیوں۔ ہاتھ دھونا ہے کیا۔ یہ لیجئے نا......' امام نے اشارہ کیا۔ چاندی کے خوبصورت کٹورے میں لیموں کے ٹکڑے کے ساتھ گرم پانی بھی موجود تھا۔

'جی...... میں کہہ رہی تھی...... نیپکن......' ڈرتے ڈرتے قریشہ نے اِس بار صلاح الدین کی طرف بغیر دیکھے اپنے دل کی بات کہہ دی......'نشانی کے طور پر رکھ لوں......؟'

'ارے...... ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں...... ضرور___' امام صاحب ہنس رہے تھے۔ 'رکھ لیجئے نا...... نشانیاں......' وہ تھوڑا مسکرائے تھے...... 'قومیں اپنی نشانیوں کے ساتھ بھی جانی جاتی ہیں......'

ایک لمحے کو چونک گئے تھے صلاح الدین...... برسوں پہلے ابّا نے بھی تو یہی کہا تھا...... دلّی میں آٹھ سو برسوں کی نشانیاں دھندلی اور ختم ہونے لگی تھیں...... اب ایک نشانی نیپکن کے طور پر...... ہونٹوں پر دھیمی سی مسکراہٹ لہرائی۔ صلاح الدین نے دیکھا، قریشہ اپنے پرس میں شاہی نیپکن کو حفاظت کے ساتھ رکھ رہی ہے۔

نیپکن کا سفر ابھی جاری تھا۔ اِس واقعہ کے کچھ ہی دن بعد دلّی سے فتوحہ پہنچنے پر اِسی نیپکن نے سیاست کی ایک نئی بساط بچھائی تھی۔

6

ہوا کچھ یوں کہ قریش منچ کے چمک جانے کے بعد سے ہی سدانند بابو اُس پر ڈورے ڈالتے رہے تھے۔ بہار میں برسوں سے حزب مخالف کا رول نبھانے والے سدانند بابو ایم ایل اے کے چناؤ میں کئی بار ہار چکے تھے۔ چھوٹے شہر میں ملنا ملانا تو ہو ہی جاتا ہے، لیکن وہ ایک ایسی پارٹی سے منسلک تھے جہاں ملنے ملانے کے جرم میں اپنے ہی لوگوں کے ذریعے وہ تنقید کے شکار بھی ہو سکتے تھے ـــــ فتوحہ جیسے شہر میں تنگ نظر مذہبی پارٹی والے نیتاؤں سے ملنے ملانے کو یوں بھی اچھا تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ دس بیس برسوں میں فرقہ پرستی کے اندھڑ نے اُسے سدانند بابو سے دور رکھا تھا جبکہ قاعدے سے دیکھیں تو دونوں ایک ہی عمر کے تھے ـــــ صلاح الدین اور سدانند دونوں نے ایک ساتھ ہی اسکول اور کالج کا سفر طے کیا تھا ـــــ لیکن جن سنگھ والی ذہنیت سے جڑا سدانند کبھی بھی مسلمانوں کے درمیان اپنی جگہ نہیں بنا پایا ـــــ لگا تار چلنے والے سیاسی اُٹھا پٹخ کے درمیان اِدھر صلاح الدین سیاست کے نئے باب پڑھنے لگے تو اُدھر سدانند، صلاح الدین کے سہارے مسلمانوں کے درمیان اپنی ساکھ بنانے کو بے چین تھے۔ بچپن کا کلاس میٹ ـــــ مانے گا کیسے نہیں۔ راجنیتی میں کوئی دھرم ایمان ہوتا ہے ـــــ ہوتا ہے ووٹ بینک ـــــ اصل تو یہی ہے۔ قریش منچ کے دفتر میں صلاح الدین سے ملنے آنے والے سدانند بابو نے چلتے وقت ایک شگوفہ اور جڑ دیا۔

'کل بھابھی کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھاؤں گا...... کھلاؤ گے نا؟ نان ویج۔ بہت دن ہو گئے یار......'

'کیوں نہیں......' دلّی سے لوٹے صلاح الدین کو سدانند کی تجویز میں سیاست سے جڑی کوئی بات نظر نہیں آئی۔

صلاح الدین مطمئن تھے ـــــ قریش منچ کے بڑھتے اثر کو کیش کرنے کے لئے دوسری پارٹیاں بھی اُن کے پاس آئیں گی ـــــ سیاست میں مستقبل کے بیج تو ایسے ہی پھوٹتے ہیں۔ اب چاہے امام ہوں یا سدانند ـــــ ملنا تو سب سے ہی پڑے گا۔ تبھی اپنا راستہ چننے میں اُسے آسانی ہوگی۔

اور یہ دوسرے دن کا قصہ ہے۔ جب نیپکن ایک 'زندہ اور سلگتا ہوا مسئلہ' بن کر ایک بار

پھر اُس کے سامنے آیا تھا۔

قریشہ صبح سے ہی کھانا بنانے میں جٹی تھی۔ پلاؤ، قورمہ۔ بہار میں عام طور پر بریانی کا رواج نہیں ہے۔ فتوحہ میں تو بالکل بھی نہیں مگر بھلا ہو ٹی وی چینلوں کا، جس نے بریانی، حیدرآبادی بریانی کا نام لے کر منہ کا ذائقہ بڑھا دیا تھا۔ کئی لوگوں سے قریشہ نے بریانی بنانے کا طریقہ پوچھا۔ ایک دو بار، اچھا بُرا بنانے کی پریکٹس بھی کی۔ آہستہ آہستہ کامیابی ملی تو گھر میں بریانی بننے کا رواج شروع ہو گیا۔ ہاں، یہ الگ بات تھی کہ صلاح الدین کو بریانی کا حساب پسند نہیں تھا۔ وہ کہتا بھی تھا۔ چاول میں گوشت ڈال دو۔ یہ گوشت کے ساتھ انصاف نہیں ہے ــــــ بریانی بن گئی۔ گوشت کے اور آئیٹم بھی تیار ہو گئے۔

رات 9 بجے سدانند 'پارٹی جیپ' پر آیا ــــــ اکیلے ــــــ پہلے وہ قریش منچ کے پیچھے والے دفتر میں بیٹھا صلاح الدین کو اپنی پارٹی کا منتر پلاتا رہا ــــــ یہ بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ اب پارٹی میں 'بھید بھاؤ' کا دور ختم ہو چکا ہے ــــــ اب تو اُس کی پارٹی میں مسلم جوان نیتا بھی شامل ہیں ــــــ اُس نے یہ بھی کہا، آئندہ آنے والے چناؤ میں اُس کی پارٹی کا مستقبل روشن ہے۔ قریش منچ چاہے تو آسانی سے مسلم ووٹوں کے بٹوارے کو روکا جا سکتا ہے...... سیاست میں ہم گھوڑے ہوتے ہیں۔ گھوڑا گھاس سے یاری کرے گا تو کھائے گا کیا...... ہو...... ہو...... ہو......'

تیز ٹھہاکے، قہقہوں کے درمیان کھانے کا دور چلا اور یہیں وہ حادثہ ہو گیا، جس کے بارے میں صلاح الدین انجان تھے ــــــ قورمہ، بریانی، نان پر ہاتھ صاف کرنے کے بعد جب سدانند نے نیپکن کہا، تو وہ آہستہ سے بولے...... چلئے بیسن پر ہاتھ دھو لیں......

'ارے یار...... یہ دلّی والوں نے اب عادت خراب کر دی ہے۔ نیپکن ہی بڑھانا۔ رکھتے ہو نا؟' سدانند بابو نے پھر ٹھہاکا لگایا ــــــ رکھتے ہو یا ابھی بھی فتوحہ کے فتوحہ ہو......'

اپنی طرف سے مطمئن صلاح الدین آگے بڑھے۔ چلمن کے اُس پار قریشہ کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ پہلے سوچا، آواز دے کر بلا لیں۔ پھر اتنا 'ماڈرن' بننا اچھا نہیں لگا صلاح الدین کو۔ چلمن کے پار کھڑی قریشہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔

'نیپکن تو نہیں ہے۔'

'نہیں ہے۔ ابھی تو لایا تھا'

'ختم ہوگئی۔'

'دیکھو شاید کہیں کوئی ٹکڑا۔'

'دیکھ لیا، نہیں ہے......' کہتے کہتے اچانک قریشہ کو یاد آ گیا......ارے ہاں ہے......'

'ہے تو پھر لاتی کیوں نہیں......'

'وہ پرس میں......قریشہ نے یاد دلانے کی کوشش کی ــــ 'بھول گئے۔ دلّی میں......
امام صاحب کے ہی یہاں......'

'اب کیا کریں ــــ وہی دے دو ــــ '

سدانند بابو امام صاحب کی نیپکن میں ہاتھ پونچھتے ہوئے اب بھی ہنس رہے تھے ــــ

'کھانا مزیدار تھا......لیکن ہماری تجویز کے بارے میں سوچئے گا ضرور۔'

نشانیاں دھندلی ہوگئی تھیں۔

سدانند کی جھوٹی رکابی میں مڑا تڑا شاہی نیپکن، گوشت کی چوسی گئی، بڑی چھوٹی ہڈیوں کے درمیان چھپ گیا تھا ــــ

●❖●

ڈراکیولا

مصنف کا بیان

''میں ہر بار تمہارے گھر کی الگنی پر گیلے کپڑے کی طرح 'ٹنگی' رہی۔ تم میرے لئے مٹھی مٹھی بھر دھوپ لاتے تھے۔ اور میں تھی، برف جیسی یخ ___ دھوپ تمہاری مٹھیوں سے جھر جھر جاتی تھی..... سوکھتی کیسے میں.....؟ تمہارے ہی گھر کی الگنی پر ٹنگی رہی۔ دُکھ دینے کے لئے تمہیں۔''

وہ کچھ ایسا ہی سوچتی تھی۔ اپنے بارے میں ___ وہ یعنی، صوفیہ مشتاق احمد۔ اُسے اپنے بارے میں کچھ بھی سوچنے کا حق حاصل تھا۔ جیسے یہ کہ راتیں کیوں ہوتی ہیں — ؟ جیسے یہ، کہ آسمان پر ٹمٹماتے تاروں میں، اُس کی بھولی بسری عمر کیسے سما جاتی ہے — ؟ جیسے یہ کہ صبح کیوں ہوتی ہے۔ سورج کیوں نکلتا ہے۔ دھوپ سے زندگی کا کیسا رشتہ ہوتا ہے ___ ؟

قارئین! مجھے احساس ہے کہ میں نے کہانی غلط جگہ سے شروع کر دی۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ایسا میرے ساتھ اکثر ہوا ہے۔ مگر پیارے قارئین، مجھے اس بات کا اعتراف کر لینے دیجئے کہ مجھے اس کہانی کو لکھنے کا کوئی حق نہیں تھا اور یقین جانیے، اس کہانی کے کرداروں سے، ملنے سے قبل تک مجھے اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ زندگی سے وابستہ بے حد معمولی سچائیاں اتنی تلخ، اتنی سنگین بھی ہو سکتی ہیں ___ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ آج کے عہد میں، جس کے بارے میں یہاں تک کہا جاتا ہے کہ اس سے زیادہ مہذب ترین دنیا کا کوئی تصور جارج بش کے پاس بھی نہیں ہے ___ اور نیوکلیائی ہتھیاروں کی، انسانوں کے قتل عام کی اس سے بدصورت مثال شاید تاریخ کے بے رحم صفحوں پر بھی مشکل سے ہی ملے گی ___ مجھے احساس ہے کہ انسانی بم،

جینوم، کلوننگ اور نیوٹکنالوجی کے اس عہد میں میں آپ کو ایک ایسی کہانی سنانے جارہا ہوں، جس پر چوتھی دنیا کے مہذب ترین لوگ شاید ہی بھروسہ کرسکیں ___ انسانوں کو غلام بنانے والی کہانیاں اور غلاموں سے کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ بدترین سلوک کی فنتاسیاں، معاف کیجئے گا، لوگ بھولے نہیں ہیں ___ تاریخ کے صفحات اذیت اور جبر کی مثالوں سے بھرے پڑے ہیں ___ لیکن یقین جانئے، میں ایسی کوئی رس بھری، لذیذ داستان آپ کے سامنے رکھنے نہیں آیا ___ اور آپ ہنسیں گے، یقیناً آپ کو ہنسنا چاہئے ___ کہ خود کو مہذب ثابت کرنے کی ریس میں اگر آپ کو کوئی ایسا قصہ سنایا جائے کہ عظیم طاقتوں میں سے ایک بننے جارہے ملک ہندوستان میں، سنہ 2005 میں، ایک مسلمان لڑکی اپنی شادی کے لئے، 'شاہزادوں' کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی اور اچانک ایک دن اُس نے ایک تنہا، اُداس کمرے میں ___ آسیبی داستانوں کے مشہور زمانہ کردار ڈراکیولا کو دیکھ لیا ___ تو چونکئے گا مت ___

اور یقین جانیے، ہماری اس کہانی کی کردار صوفیہ مشتاق احمد کے ساتھ یہی ہوا ___

●

آدھی رات کا گجر بج چکا تھا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ باہر خوفناک آندھیاں چل رہی تھیں۔ پتے سرسرا رہے تھے۔ باہر کوئی جنگل نہیں تھا۔ پھر بھی چمگادڑوں، بھیڑیوں، الو اور طرح طرح کی خوفناک آوازیں رات کے پُراسرار سناٹے کو اور بھی زیادہ خوفناک بنارہی تھیں اور یقیناً یہ دستک کی آواز تھی ___ نہیں۔ کوئی تھا، جو دیواروں پر رینگ رہا تھا ___ کیا ویمپائر ___ ؟ اُف، خوفناک آوازوں کا ریلا جسم میں دہشت کا طوفان برپا کرنے کے لئے کافی تھا۔ سہمی ہوئی سی وہ اٹھی۔ بدن میں کاٹو تو خون نہیں ___ وہ اٹھی، اور تھرتھراتی، کانپتی کھڑکی کی طرف بڑھی۔ لڑکھڑاتے کانپتے ہاتھوں سے کھلی کھڑکی کے پٹ بند کرنے چاہے تو ایک دم سے چونک پڑی ___ کوئی تھا جو دیواروں پر چھپکلی کی طرح رینگ رہا تھا۔ اُف۔ اُس نے خوفزدہ ہو کر دیکھا۔ یقیناً یہ ڈراکیولا تھا، ہونٹ انسانی خون سے تر ___ دانت، لمبے، بڑے اور سرخ ___ وہ اپنے 'کوفن' سے باہر آیا تھا۔ صبح کی سپیدی تک اپنے ہونے کا جشن منانے یا پھر انسانی خون کا ذائقہ تلاش کرنے...... وہ یکبارگی پھر خوف سے نہاگئی۔ کسی اسپائیڈر مین کی طرح ڈراکیولا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دیوار پر آرام سے چھپکلی کی طرح ___ پنجوں پر اُس کی گرفت مضبوط

تھی۔ وہ اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اُس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر...... رینگتا ہوا، ڈراکیولا، ایکدم، دوسرے ہی لمحے اُس کے کمرے میں تھا___ اُس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی...... اور اُس کے نوکیلے دانت اُس کی نازک ملائم گردن کی طرف بڑھ رہے تھے...... اُس کی آنکھوں میں نیم بے ہوشی کی دھند چھارہی تھی___

مصنف سے صوفیہ مشتاق احمد کی بات چیت

'اُف، ڈراؤنا خواب، لیکن اس صدی میں ڈراکیولا___ آپ کتابیں بہت پڑھتی ہیں، ڈراؤنی کتابیں؟'

'نہیں پڑھتی۔'

'پھر یہ خواب۔'

'نہیں، یہ خواب نہیں ہے۔ دیکھئے......'

مصنف کے لئے یہ صبر آزما لمحہ تھا۔ یقیناً اُس کی گردن کی ملائم جلد کے پاس کئی داغ تھے___ لیکن کیا یہ ڈراکیولا کے نوکیلے دانتوں کے نشان تھے، یا...... مصنف اِن اذیت ناک لمحوں کے سفر سے، پھیکی ہنسی ہنستا ہوا اپنے آپ کو باہر نکالنے کا خواہشمند تھا___

'یقیناً یہ داغ...... آپ سمجھ رہے ہیں نا، ایک صبح ہم اٹھتے ہیں۔ اور کیڑے نے...... کیڑا...... آپ سمجھ رہے ہیں نا......؟'

صوفیہ مشتاق احمد کا چہرہ اس وقت، لیونا ڈوی ونچی کی پینٹنگ مونالزا کی طرح ہو رہا تھا، جس کے تاثر کو آپ لفظوں کا لباس پہنا ہی نہیں سکتے۔ یقیناً...... وہ کیڑا ہی تھا۔ نوکیلے دانتوں والا ایک خوفناک کیڑا...... اور آپ سے زیادہ بہتر کون جانے گا کہ اس صدی میں انسان سے زیادہ خوفناک کیڑا...... دوسرا کون ہوسکتا ہے......'

ہے...... ہے...... ہے......، مصنف پھیکی ہنسی ہنسنے پر مجبور تھا...... 'یہ سب تو دانشوری، دانشمندی کی باتیں ہیں۔ ہے...... ہے......'

مصنف کے الفاظ کھو گئے تھے...... لیکن وہم وگمان کی ایک بے نام سی کہانی یہ بھی تھی کہ مصنف نے وہ داغ دیکھے...... اور یقیناً وہ داغ اُس کی گردن پر موجود تھے......

لیکن اس کہانی کے ساتھ اس بے معنی گفتگو، ڈراکیولا، صوفیہ مشتاق احمد کی گردن میں

پڑے ڈراکیولا کے نوکیلے دانتوں کے نشان کا کوئی رشتہ نہیں ہے ___ لیکن یقیناً اس گفتگو کے بعد ہی اس کہانی کی بنیاد پڑی تھی، اور یقیناً ___ اب جو کچھ میں سنانے جارہا ہوں، وہ بیان کی شکل میں ہے اور اس بیان میں، میں شامل ضرور ہوں، لیکن یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ اس کہانی میں، اپنی طرف سے میں نے کوئی اضافہ یا الٹ پھیر نہیں کیا ہے...... اس سے پہلے کہ الگ الگ بیانات کا سلسلہ شروع ہو، مختصراً اس کہانی کے کرداروں سے آپ کا تعارف کرادوں۔ دلی جمنا پار رہائشی علاقے میں ایک چھوٹی سی مڈل کلاس فیملی ___ بڑی بہن ثریا مشتاق احمد۔ عمر پینتیس سال۔ ثریا کے شوہر اشرف علی ___ عمر چالیس سال۔ نادر مشتاق احمد، ثریا کا بھائی۔ عمر 30 سال۔ اور ہماری اس کہانی کی ہیروئن (نہیں معاف کیجئے گا، بڑھتی عمر کے احساس کے ساتھ ایک ڈری سہمی سی لڑکی ہماری کہانی کی ہیروئن کیسے ہوسکتی ہے) ___ صوفیہ مشتاق احمد، عمر 25 سال۔

تو اس کہانی کا آغاز جنوری مہینہ کی 8 تاریخ سے ہوتا ہے۔ سردی اپنے شباب پر تھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ دانت سردلہری سے کٹکٹا رہے تھے۔ لیکن جمنا پار، پریہ درشنی وہار، فلیٹ نمبر بی 302 میں ایک ناخوشگوار حادثہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔

کوئی تھا، جو تیزی سے نکلا ___ پہلے لڑکھڑایا، پھر باہر والے دروازہ کی چٹخنی کھولی اور تیز تیز، سرد رات اور کہاسوں کے درمیان، سیڑھیوں سے اُترتا ہوا، بھوت کی طرح غائب ہوگیا ___

'وہ چلا گیا......' یہ جیجو تھا۔ صوفیہ مشتاق احمد کا جیجو، آنکھوں میں خوف اور الجھن کے آثار ___ وہ چلا گیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ___'

نادر مشتاق احمد نے نظریں اٹھائیں۔ منظر کچھ ایسا تھا جیسے ویتنام اور ناگاساکی، ایٹم بم دھماکے کے بعد ندیوں سے اٹھتے ہوئے آگ کے شعلے آسمان چھو گئے ہوں ___ 'کیا ہوا، اُسی سے پوچھتے ہیں۔'

'لیکن، کیا پوچھیں گے آپ ___؟ ثریا ججو کی طرف مڑی ___ پھر ایک لمحے کو نظر اٹھا کر اُس نے نادر کی طرف دیکھا ___ 'جذبات پر قابو رکھو، اُف، دیکھو...... وہ کیا کر رہی ہے......'

'شاید وہ آرہی ہے......' جیجو نے ہونٹوں پر انگلی رکھی ___

'کوئی اُس سے کچھ بھی نہیں پوچھے گا ___' یہ ثریا تھی ___

'تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو باجی۔ کوئی اُس سے بھلا کیا پوچھ سکتا ہے۔ وہ بھی اس

ماحول...... اور ایسے عالم میں۔ لیکن...... کچھ......'

'کچھ نہیں ہوگا۔'

'ہم نے فیصلہ کرنے میں......'

ثریا مشتاق احمد کچھ کہتے کہتے ٹھہر گئی — آواز ڈوبتی چلی گئی ___ 'کہہ نہیں سکتی...... مگر ___ اُس نے اپنے شوہر اور نادر مشتاق احمد کی طرف ایک گہری نظر ڈالی ___ ''ہم نے آپس میں بات کی تھی۔ اس کے سوا ہمارے پاس دوسرا راستہ ہی کیا تھا۔''

'وہ آرہی ہے اور اب ہمیں خاموش ہو جانا چاہئے ___ اور یقیناً ہمارے تاثرات ایسے نہیں ہونے چاہئیں کہ اُسے کسی بات کا شک ہو کہ ہم اُس کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں ___ اور یقیناً ہمیں اُس کی نفسیات کو بھی سمجھنا ہوگا۔'

یہ سچ تھا ___

باہر کہاسا زمین پر گر رہا تھا۔ رات برف سے زیادہ ٹھنڈ ہوگئی تھی ___ دروازہ چرچرانے کی آواز ہوئی۔ برف پگھلی۔ دھند چھٹی۔ سامنے صوفیہ کھڑی تھی۔ صوفیہ مشتاق احمد۔ ایک لمحے کو وہ ان کے پاس آکر ٹھہری۔ لیکن رُکی نہیں ___ دوسرے ہی لمحے، وہ اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئی ___

پہلا بیان: ثریا مشتاق احمد

میں ثریا مشتاق احمد۔ پیدا ہوئی اتر پردیش کے بلند شہر میں۔ محلّہ شیخاواں۔ مسلمانوں کا محلّہ۔ زیادہ تر شیخ برادری کے مسلمان ___ پاس میں مسجد تھی۔ پاپا مشتاق احمد کی چھوٹی سی دکان تھی۔ اسٹیشن روڈ پر۔ پنج گانہ نمازی ___ پیشانی پر سجدے کے داغ۔ چہرہ ایسا نورانی اور معصوم کہ میں نے زندگی میں آج تک نہیں دیکھا اور ممی تو جیسے گائے تھیں۔ نادر چھوٹا بھائی تھا۔ اُس سے پانچ سال چھوٹا اور صوفیہ مجھ سے دس سال چھوٹی تھی ___ بچپن میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں مٹکاتی تو شرارت سے سارا گھر خوشی سے جھوم جایا کرتا۔

کالج میں داخلے سے قبل ہی اشرف زندگی میں آگئے تھے ___ کیسے ___؟ یہ لمبی کہانی ہے۔ چھوٹے سے شہر میں ایسی کہانیوں کے پر لگ جاتے ہیں۔ پھر کبوتر کی طرح پرواز کرتی یہ کہانیاں شیخاواں کے ایک گھر سے دوسرے گھر میں گونجنے لگی تھیں ___

ممّا کو ہائپر ٹینشن تھا___

پپا جلد گھر آجاتے تھے، طبیعت کی خراب کا بہانہ بنا کر___ پڑوس والی مسجد سے نماز کی صدا بلند ہوتے ہی، وہ تیز تیز لپکتے مسجد پہنچ جایا کرتے۔ وہاں سے آتے، تو لفظوں کے تیر سے اُداس اور گھائل ہوتے___ ممی اور وہ گھنٹوں اشرف کے بارے میں باتیں کرتے رہتے___ مثلاً کیوں آتا ہے۔ کیا کام ہے___ خاندان تو اچھا ہے نا___ یہ لڑکی ناک تو نہیں کٹائے گی۔ صوفیہ تو کافی چھوٹی ہے___

نادر نے صرف ایک بار جلتی آنکھوں سے میری کی آنکھوں میں دیکھا تھا___ بجیا، یہ کیا تماشہ ہے۔ چاروں طرف تم دونوں کے ہی ریڈیو بج رہے ہیں۔

'تو بجنے دو نا......'

تب گول گول آنکھیں نکال کر صوفیہ نے میری طرف دیکھا تھا۔

'ایک ریڈیو میرے لئے بھی لا دو نا......'

'پاگل، ایک ریڈیو نے ہی طوفان مچا دیا ہے......' نادر ناگواری سے بولا۔

لیکن میں یہ کہانی کیوں سنا رہی ہوں۔ میری اور اشرف کی کہانی میں اگر کچھ دلچسپ ہے تو صرف یہ، کہ ہم نے لو میرج کی تھی۔ پھر اشرف دلّی آ گئے۔ اور میں بھی دلّی آ گئی___ اور جیسا کہ مہانگروں میں ہوتا ہے ایک دن خبر آئی۔ پپا نہیں رہے۔ دوسرے سال خبر آئی۔ ممی نہیں رہیں— شیخاواں اُجڑ گیا۔ گھر ویران ہو گیا۔ بلند شہر سے رشتہ ٹوٹ گیا___ نادر اور صوفیہ دونوں دلّی آ گئے۔ کبھی کبھی احساس ہوتا، اشرف ان دونوں کی موجودگی سے پریشان تو نہیں ہیں۔ لو میرج کا یہ بھی ایک فائدہ تھا کہ اشرف کسی بھی بات پر بولتے یا ٹوکتے نہیں تھے۔ مگر دل میں کچھ گانٹھیں تو پڑ ہی جاتی ہیں___ کبھی جب اشرف کو، اُن کی اپنی دنیا میں قید اور اُداس دیکھتی تو دل کی بات ہونٹوں پر آ جاتی......

'وہ...... ایک دن پرواز کر جائیں گے......'

'ہاں......'

'کون جانتا تھا، ممی پاپا اس طرح ہمیں ذمے داریوں سے باندھ کر......'

اشرف کہیں اور دیکھ رہے ہوتے___

'تم ان دونوں کی موجودگی کو لے کر...... نہیں میرا مطلب ہے......'

اشرف گہری سانس کھینچ کر کہتے ___ 'بچے ہیں...... لیکن...... پرائیویسی کے یہی دن ہیں۔ یہ دن واپس نہیں آتے...... یہ دن چلے گئے تو......'

نہیں ___ مجھے احساس تھا، اشرف کی رومانی دنیا میں نئی نئی فنتاسی اور خوبصورت کہانیوں کی ایک بڑی دنیا آباد ہے...... وہ اکثر اس کا ذکر بھی کیا کرتے...... مثلاً ہنسی ہنسی میں...... 'ثریا، یہ لباس کیوں بنایا گیا...... شادی کے بعد گھر میں میاں بیوی کو لباس نہیں پہننا چاہئے...... نیچرل ڈریس...... آخر ہم قدرتی لباس میں کیوں نہیں رہ سکتے......؟ بس یہی تو چار دن ہوتے ہیں۔ ایک ساتھ سوئمنگ...... ایک ساتھ......'

اشرف جب دن میں مجھے لے کر کمرہ بند کرنے کی کوشش کرتے تو وحشت سی ہوتی ___ صوفیہ کیا سوچے گی۔ بڑی ہو رہی ہے۔ پھر جیسے کمرے کے بند سناٹے میں کوئی کیڑا چپکے سے منہ نکالتا ___ اشرف ایکدم سے بوکھلا کر اُس سے الگ ہو جاتے۔ خود ہی آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیتے......

'جاؤ۔ تمہیں آزاد کرتا ہوں۔'

مصنف سے ثریا مشتاق احمد کی مختصر سی گفتگو کے کچھ حصے

''تو گویا تم سمجھ رہی تھی...... کہ کیڑے......'

'ہاں......'

'یقیناً یہ کیڑے صوفیہ نے بھی دیکھے تھے......؟'

'ہاں ___'

'اور نادر نے بھی......'

'ہاں ___'

'پھر؟'

'نادر کو اپنی خودداری کا احساس تھا ___ وہ ایک بوجھ کی طرح اس گھر میں رہنے کے خلاف تھا اور اسی لئے اپنے لئے ایک چھوٹی سی نوکری کا بندوبست کرتے ہی......'

'اُس نے یہیں تمہارے قریب ایک فلیٹ لے لیا۔'

'ہاں۔ اور پھر صوفیہ کو بھی لے گیا......'

'نہیں۔شروع میں نہیں لے گیا۔اُسے اپنی مجبوریوں کا احساس تھا۔مگر......صوفیہ چپ چاپ رہنے لگی ___ سارا سارا دن گم صم ___ اپنے آپ میں کھوئی۔کسی سے بولنا چالنا تک نہیں۔ بس جی چاہا تو کبھی کبھی ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی۔اُس کا بس چلتا تو سارا سارا دن بستر پر سوئی رہتی ___ مگر جیجو اور پرائے کے گھر میں رہنے کا احساس...... اور اچانک اُس دن...... وہی کیڑا......

'کیڑا......؟'

ثریا مشتاق احمد اپنے بیان میں گم ہوگئی تھیں۔

ثریا مشتاق احمد کے بیان کا دوسرا حصہ

مٹیا مارفوسس۔آپ نے یقیناً یہ کہانی پڑھی ہوگی۔نہیں، میں کیڑے میں، یا کیڑا مجھ میں تبدیل ہوگیا، ایسی کوئی بات نہیں۔مگر وہ تھا، یہیں ___ کمرے میں ___ صبح، سورج نکلنے سے پہلے ہی، بستر چھوڑتے ہوئے، میں نے اُسے اشرف کی آنکھوں کے پاس رینگتے ہوئے صاف دیکھا تھا۔نہیں، مجھے کہیں سے کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔یقیناً وہ تھا۔اور میرے بھگانے سے پہلے ہی......

اُس دن ارم کا برتھ ڈے تھا۔اِرم کون۔میری بیٹی۔اشرف کی آنکھوں کا تارا۔پانچ برس کی ارم کو لے کر اشرف کی آنکھوں میں خوابوں کے اتنے جھومر اور فانوس دیکھے کہ ڈر ڈر جاتی...... وہ ایک خوبصورت شیشے کا ایکوریم تھا، جو اشرف اُس کے لئے خصوصی طور پر لے کر آئے تھے ___ شیشے کی رنگین دنیا میں تیرتی سنہلی مچھلیاں...... 'یہ سون مچھریاں ہیں......' اشرف نے کہا تھا ___ ایک دن میری بٹیا اس سے بھی خوبصورت ایک سون مچھلی بن جائے گی ___ انسانی سون مچھلی۔پھر اپنی ہی بات پر وہ زور سے ٹھہا کہ لگا کر ہنسے تھے۔گھر سے باہر نکلتے ہوئے شام کی پارٹی کے بارے میں وہ کچھ تفصیلات بتا کر گئے تھے۔بچوں کی فہرست بن گئی تھی۔ڈرائنگ روم خوبصورت ڈھنگ سے سجانے کے لئے کہہ گئے تھے...... 'کیڑا'...... ایک بار پھر اشرف کے دروازہ کے باہر نکلتے ہی میں نے کیڑے کی جھلک دیکھی تھی۔کیڑا...... میں چیختے چیختے رہ گئی ___ تب تک اشرف باہر نکل چکے تھے...... چار بجے شام میں وہ واپس آئے تو ڈرائنگ روم کو ویسے کا ویسا پا کر وہ چیخ اٹھے۔

'صوفیہ کہاں ہے......'

'وہ......سو رہی ہے......'

'کیا— ؟ سات بجے تک محلے ٹولے کے بچے آجائیں گے اور ابھی تک وہ سو رہی ہے۔ اتنے سارے لوگوں کو پالنے کا ٹھیکا لے لیا ہے تم نے۔ یہ سونے کا وقت ہے......اور تم......تم کیا کرتی رہی......'

اشرف غصے سے بول رہے تھے...... کیڑا اُن کی آنکھوں کی پتلیوں پر چپ چاپ بیٹھا تھا— کمرے سے باہر نکل کر دیوار سے سٹی ہوئی، تھر تھر کانپ رہی صوفیہ کو میں نے پہلی بار دیکھا۔ شاید اشرف نے بھی صوفیہ کا یہ رنگ دیکھ لیا تھا— ایک لمحے کو وہ ٹھہرے۔ پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ زور سے بند کر لیا___

نادر مشتاق احمد کا بیان

نہیں۔ میں اشرف بھائی کو قصوروار نہیں مانتا۔ یقیناً ہم نے اُن کی زندگی میں سیندھ لگائی تھی— تقدیر کی مجبوری اپنی جگہ، لیکن اپنے اپنے فیوچر کے لئے کسی کی زندگی میں جبر کے طور پر داخل ہونے کا ہمیں کیا حق تھا___ صوفیہ اُس دن کافی روئی تھی۔ مجھے احساس تھا۔ شاید جان لیوا تنہائی کے اُداس مکالمے اُسے بار بار پریشان کر رہے تھے۔ مجھے اُسے ایک بھائی کی سطح پر، اس سناٹے سے باہر نکالنا تھا۔ اور میں نے اُسے نکالا۔ دوسرے دن، یعنی اس ناخوشگوار حادثے کے دوسرے دن میں اُسے اپنے گھر لے گیا اور ایک دو ماہ بعد اُس کا داخلہ کمپیوٹر میں کرا دیا۔ شاید اُسے اپنی تنہائیوں کو بانٹنے کا موقع مل جائے۔ میں جانتا تھا۔ وہ کوئی دوست نہیں بنا سکتی۔ بوائے فرینڈ تو بالکل نہیں— لیکن بڑی ہوتی صوفیہ کی ذمے داری سے آزاد ہونے کا خیال مجھے زیادہ ستائے جا رہا تھا۔ کیونکہ مجھے امریکہ جانا تھا۔ میرے خواب امریکہ میں بستے تھے اور پھر شروع ہوا آنکھ مچولی کا کھیل___ نہیں صاحب۔ پہلی بار احساس ہوا، کہ بجیا نے خود لڑکا پسند کر کے کتنی قابلیت دکھائی تھی___ رشتہ دار، عزیز، جان پہچان والے، رشتہ گھر، شادی ڈاٹ کام، مہندی ڈاٹ کام.. لڑکا دیکھنے کا سفر شروع ہوا تو جیسے ایک نئے بازار کو دیکھنے کا موقع ملا— نہیں صاحب۔ مجھے معاف کیجئے۔ یقیناً اس لفظ سے بہتر کوئی لفظ میرے پاس نہیں ہے— بازار___ ہر کسی نے اپنے اپنے جانور کو پال پوس کر تیار کیا تھا۔ بقرعید کے موقع پر فروخت کرنے کے لئے___ قیمتیں

آسمان چھو رہی تھیں۔ اُس پر گھر گھرانہ، شجرہ نسب کی تفصیل ___ یہ بازار میرے لئے اور بجیا کے لئے نیا تھا۔ صوفیہ ہمیں گاڑی میں آتے جاتے ہوئے دیکھتی۔ بجیا کو فون پر باتیں کرتے ہوئے سنتی۔ پھر واپس آکر ہمارے خاموش چہرے پر اپنی ادھ کھلی آنکھیں رکھ کر، واپس اپنے کمرے میں لوٹ جاتی ___ بجیا کو کبھی کبھی غصہ آجاتا......

'سب کے رشتے ہوجاتے ہیں۔ مگر یہاں......'

جیجو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہے...... 'فکر کیوں کرتی ہو، آسمان سے ایک دن......'

وہ صوفیہ کے کمرے میں جاتے۔ اُسے بانہوں کے سہارے واپس لے کر آتے ___

''کیا کمی ہے اس میں...... اور ابھی عمر کون سی عمر نکلی جارہی ہے......' وہ ایک بار پھر ٹھنڈی سانس بھرتے۔ ہر چیز کا وقت مقرر ہے۔ کیوں صوفیہ۔ ایک دن چپکے سے ایک شاہزادہ آئے گا اور ہوا کے رتھ پر بیٹھا کر......''

'نہیں۔ کوئی نہیں آئے گا — 'صوفیہ مسکرانے کی کوشش کرتی۔

'آئے گا......' جیجو میری طرف مڑتے۔ 'نادر، اس قدر پریشان ہونے ضرورت نہیں ہے۔ صوفیہ سے زیادہ خوبصورت لڑکی میں نے کم ہی دیکھی ہے، اس کا اعتراف کرتا ہوں۔ مگر کمی کیا ہے صوفیہ میں ___ 'جیجو ہنستے۔ بس ایک کمی ہے۔ خوبصورت کے ساتھ خوب سیرت بھی ہے۔ اور خوب سیرت لڑکیوں کے بازار ذرا ٹھنڈے ہیں......'

'میں کیا خوب سیرت نہیں تھی......' ثریا آنکھیں تریرنے کی کوشش کرتی تو جیجو فلک شگاف قہقہہ بلند کرتے ___ 'خود پر کیوں لیتی ہو۔ صوفیہ مختلف ہے۔ اور ایک دن......

میں سوچتا تھا۔ ایک دن...... ایک دن کیا ہوگا ___ کوئی معجزہ ہو جائے گا ___ چمتکار — ؟ امریکہ بار بار خوابوں میں منڈراتا ہے۔ نہیں ہنسیے مت ___ پریتی زنٹا، منموہن سنگھ اور ہمارے نیتاؤں سے زیادہ کلنٹن، بش اور کیری مجھے اپنے لگتے تھے۔ جینفر لوپیز کے خیالوں میں، میں زیادہ ڈوبا رہتا تھا ___ ہاں، یاد آیا — ایک لڑکا اور آیا تھا۔ فریاد عارف۔ لدھیانہ کا۔ قد پانچ فٹ دس انچ۔ عمر چالیس سال۔ باہر رہنے کا، دس برس کا تجربہ تھا۔ عمر زیادہ تھی تو کیا ہوا۔ یہ رشتہ ہمیں نیٹ سے ملا تھا۔ صوفیہ کی تصویر اور بایوڈاٹا لڑکے کو پسند آیا تھا۔ اُس کی تصویر بھی نیٹ سے ہم نے نکال لی تھی۔ شکل اچھی نہیں تھی۔ لیکن کیا شکل ہی سب کچھ ہوتی ہے...... ہاں، اُس کے ہونٹوں کے پاس ایک داغ تھا...... پتہ نہیں، کس چیز کا داغ تھا۔ جلے کا یا...... مگر داغ تھا ___ ڈرتے

ڈرتے ہم نے تصویر صوفیہ کے حوالے کی۔ مگر تصویر دیتے ہوئے یقیناً ہمارے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ نظر جھکی ہوئی تھی۔

صوفیہ مشتاق احمد کا بیان

تصویر میں ہاتھ میں لیتے ہی ہنس پڑی تھی۔ یہ پاپا کے کوئی دوست ہیں کیا......؟ نہیں، کم از کم جیجو مجھ سے اتنا بڑا انداق نہیں کر سکتے— جیجو کے کمرے سے باہر آنے کے بعد بھی میں جیجو کے لئے ذرا بھی خفا نہیں تھی۔ یقیناً وہ سب سے زیادہ مجھے پہچانتے تھے۔ اور یقیناً میرے لئے سب سے زیادہ جنگ بھی، وہی لڑتے تھے— اور خاص کر ایسے موقع پر، جب کمرے میں یکا یک کالی کالی بدلیاں چھا جاتیں...... پھر جیسے تیز تیز آندھیوں کا چلنا شروع ہو جاتا۔ نہیں، میں نے تصویر دوبارہ دیکھی...... اور اچانک چہرے کا طواف کرتی آنکھیں داغ کے نشان کے پاس آکر ٹھہر گئیں۔ ہونٹ کے نیچے کا حصہ...... تصور اور خیالوں کی وادیوں میں، بوسے کے لئے سب سے خوبصورت جگہ۔ میں تو اس جگہ کا بوسہ بھی نہیں لے سکتی۔ میں ہنس رہی تھی۔ پاگلوں کی طرح ہنس رہی تھی۔ کمرے میں دھند بڑھ رہی تھی۔ شاید باہر جیجو، بجیا اور نادر بھائی نے میرے ہنسنے کی آوازیں سن لی تھیں......

'صوفیہ۔'

دروازے پر تھاپ پڑ رہی تھی۔

نادر غصے میں تھے...... 'دروازہ کیوں بند کر لیتی ہو۔'

بجیا کی آنکھوں میں ایک لمحے کو ناگواری کے بادل لہرائے...... 'ہم نے ابھی رشتہ منظور کہاں کیا ہے۔ صرف تم سے رائے پوچھی ہے......

'نہیں۔ وہ...... کیڑا۔'

دروازہ کھولتے ہوئے میری آنکھیں وحشت میں ڈوبی تھیں___ جیجو نے سہارا دیا___ صوفے تک لائے___ کچھ ہی دیر میں مکالمے بدل گئے۔

'مگر کیڑا......؟'

نادر نے بجیا کی طرف دیکھا___ 'کیڑے بڑھ گئے ہیں۔ کیوں—؟ رات بھر کاٹتے رہتے ہیں۔ دوا کا چھڑکاؤ کرو۔ یا گڈ نائٹ لگاؤ۔ مگر کیڑے نہیں بھاگتے......'

بجیا یعنی ثریا مشتاق احمد نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ہونٹوں پر ایک طنز بھری مسکان تھی۔

''آپ یقین جانیے، کوئی تھا۔ جو دیواروں پر رینگ رہا تھا۔ ایک دم سے کمرے کی دھوپ اُتر گئی۔ تاریکی چھا گئی...... کمرے میں کہاسے بھر گئے اور...... میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی مگر...... میں نے دیکھا...... جیجو آہستہ آہستہ میری طرف دیکھ رہے تھے ___ پھر اُن کے ہونٹوں پر ایک مصنوعی مسکراہٹ داخل ہوئی ___

'ایک ستارا آئے گا......'

''ستارے آسمان سے آتے آتے لوٹ گئے......'' یہ بجیا تھی۔

''ہاں، لیکن گھبراؤ مت، ایک ستارہ آئے گا اور یوں اچھل کر تمہاری جھولی میں جا گرے گا......' یہ جیجو تھے ___ ہونٹوں پر ہنسی۔ پھر وہ تمہاری آنکھوں میں، کبھی ہونٹوں پر آ کر چیخے گا...... یہ میں ہوں۔ پاگل۔ پہچانا نہیں مجھے۔ تمہاری قسمت کا ستارہ......

'اُس کے چہرے پر دھوپ بہت تھی۔ تم نے دیکھا نا ___ بھائی نظر نیچی کیے بہن کو ٹٹول رہا تھا۔

''میں جگنو تلاش کرنے گئی تھی۔ راستہ بھٹک گئی ___ 'یہ وہ تھی۔ اُس کی آواز اندر کے روشن دان سے بلند ہوئی ___ اور اندر ہی اندر گھٹ گئی۔

جیجو کا بیان

دراصل اُس 40 سال کے ادھیڑ مرد کی تصویر دیکھ کر مجھے خود بہت غصہ آیا تھا ___ نادر اور ثریا، رشتہ کے لئے مجھے کم ہی لے جاتے تھے۔ دراصل وہ اس 'مہرے' کو آخری وقت کے لئے بچا کر رکھنا چاہتے تھے اور کسی خاص موقع پر ہی خرچ کرنا چاہتے تھے۔ یہ سب میرے لئے بھی نیا تھا۔ کیونکہ ہر برس بدلتے کلینڈر کے ساتھ ہی، میں صوفیہ کو دیکھ کر اُداس اور پریشان ہوا جا رہا تھا اور آپ سمجھ سکتے ہیں، خود صوفیہ کی کیا حالت ہوگی ___ میرے لئے یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ مسلمانوں کے یہاں، ایک خوبصورت جوان لڑکی کی شادی کو لے کر اتنی ساری الجھنیں سامنے آ سکتی ہیں ___ گھر، گھرانہ اچھا۔ خاندان سیّد۔ مگر کسی کو لڑکی کا قد کچھ کم لگتا، کسی کو عمر کچھ زیادہ۔ کبھی کبھی جی چاہتا کہ پوچھنے والوں کا گریبان پکڑ کر کہوں، کہ اٹھارہ سال سے رشتہ تلاش کرتے

ہوئے تم لوگوں نے اسے 23 سال کا کر دیا ہے اور اب ___ شاید میرے اسی غصّے کی وجہ سے نادر اور ثریا مجھے کبھی اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ مگر...... کبھی کبھی اپنی بڑی ہوتی ارم کو دیکھ کر گہری سوچ میں گرفتار ہو جاتا۔ کیا میرے ساتھ بھی ___ اور ہوا یوں، کہ اچانک اُس دن ارم کو دیکھا تو ایکدم سے چونک گیا ___ ارم غائب تھی۔ ارم میں صوفیہ آ گئی تھی ___

مصنف کا بیان

قارئین، ایک بار پھر مداخلت کے لئے معافی چاہوں گا۔ کہانی شروع ہوئی تو سوچ کے دائرے پھیلتے چلے گئے۔ یہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کیا یہ بھی کوئی کہانی ہو سکتی ہے۔ ایک مسلمان لڑکی کو لڑکے کی تلاش ہے۔ عمر 23 سال، خوبصورت، تعلیم یافتہ ___ تہذیب کی اتنی صدیاں پار کرنے کے بعد بھی، چوتھی دنیا کے، ہتھیاروں کی ریس میں آگے نکلنے والے ایک بڑے ملک میں، یہ مسئلہ ایک کہانی کا جزو بن سکتا ہے، میں نے کبھی سوچا نہیں تھا ___

اُس دن، میں دوبارہ نادر مشتاق احمد کے گھر گیا۔ دروازہ کے پاس پہنچ کر بیل پر اُنگلی رکھی۔ دروازہ کھولنے والی وہی تھی۔

'آیئے۔'

'نادر؟'

'وہ باہر گئے ہیں۔'

صوفیہ، صوفے پر دھنس گئی۔ کچھ لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی ___

'چائے بناؤں؟'

'نہیں۔ ابھی رہنے دو۔'

میں آہستہ آہستہ آنکھیں گھماتا کمرے کی ویرانی کا جائزہ لے رہا تھا۔ دیوار پر قطار میں اُڑتی چار چڑیائیں کچھ اور ہی کہانی بیان کر رہی تھیں۔ تیسری والی چڑیا کی قطار ٹوٹ گئی تھی۔ تیسری چڑیا کیل سے جھول رہی تھی۔ پتہ نہیں کب سے۔ دیوار پر کنارے مشتاق احمد کی تصویر لگی تھی۔ تصویر پر ذرا بھی گرد نہیں تھی۔ جیسے ابھی ابھی گرد صاف کی گئی ہو۔ لیکن کمرے کی باقی چیزیں......

'اندھیرا ہے ___' میں آہستہ سے بولا۔ جبکہ دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ کھڑکی کے پاس پردہ پڑا تھا۔

'اس گھر میں ہمیشہ اندھیرا رہتا ہے......'صوفیہ آہستہ سے بولی۔
'اور وہ ڈراکیولا......'
میں آہستہ آہستہ کھڑکی کے پاس بڑھا___
'نہیں، یہاں نہیں۔.....' یہاں میرے ساتھ آیئے۔ میرے کمرے میں......'
وہ تیزی سے اٹھی___ مجھے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی___ سنگل بیڈ کا دیوان پڑا تھا___ چادر کئی دنوں سے بدلی نہیں گئی تھی___ کمرہ بے رونق تھا اور یقیناً اس کمرے میں کھڑکی کے راستے گھنے کہرے، داخل ہو جاتے ہوں گے___
'یہاں..... یہاں سے۔ یہ دیوار جو ہے..... آپ دیکھ رہے ہیں نا......'
'مگر یہاں تو کوئی قبرستان نہیں ہے۔'
'آہ! نہیں ہے......' صوفیہ اپنے بستر پر بیٹھ گئی___ 'میں نے کب کہا، کہ یہاں قبرستان ہے۔ مگر بن جاتا ہے۔ رات کے وقت۔ اپنے آپ بن جاتا ہے___ دھند میں ڈوبا ہوا ایک قبرستان___ ڈھیر ساری قبریں ہوتی ہیں۔ ایک کھلا ہوا 'کوفن' ہوتا ہے۔ وہ یہاں..... یہاں دیواروں پر رینگتا ہوا، کھڑکی سے اچانک میرے کمرے میں کود جاتا ہے......'
'یقیناً، وہم..... اور وہم کا تعلق تو......'
'مجھے پتہ ہے۔ وہم ہے میرا۔ مگر کیا کروں۔ وہ رات میں، آپ یقین کریں میرے کمرے میں ہوتا ہے......'
'کیوں؟'
'اب یہ بھی بتانا پڑے گا بھلا۔ خون پیتا ہے..... یقین نہیں ہو، تو یہ داغ دیکھئے۔' اُس نے اپنی گردن دکھائی۔ گردن پر یقیناً نیلے داغ موجود تھے۔
'کوئی یقین نہیں کرتا۔ میں بھی مانتی ہوں، وہم ہے مگر۔ وہ ہے۔ وہ آتا ہے..... اور......'
میں نے کہانی بدل دی___ 'اوہ..... تم نے بتایا تھا۔ تم بار بار مرتی تھی___'
'کون نہیں مرے گا ایسے___ جب آپ بار بار اُسے سجا کر باہر لے جاتے ہوں۔ یا کبھی کبھی سج دھج کر گھر میں ہی نمائش یا میلہ لگا دیتے ہوں۔ ایک حد ہوتی ہے۔ کوئی بھی کتنی بار مرتا ہے۔ کتنی بار مر سکتا ہے کوئی۔ میں تو ہر بار، ہر پل......'

صوفیہ کہتے کہتے رُک گئی تھی___

'مگر اُس دن نہیں مری۔ اُس دن۔ میں نے سوچ لیا تھا اور مطمئن تھی۔'

'اُس دن......'

'ارے وہی۔ اِن ڈسنٹ پروپوزل— ' وہ کہتے کہتے رُکی___ ایک ہنسی چہرے پر شعلے کی طرح کوندی— پروپوزل، کبھی بھی ان ڈسنٹ نہیں ہوتا۔ مگر بجیا اور بھیا کسی ساتویں عجوبے کی طرح اُس پروپوزل کو لے رہے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میں پہلی بار کمرے میں کھکھلا کر ہنسی تھی— 'اب مزہ آئے گا۔' وہ ٹھہری___ پھر بولی۔ اب کسی کو کیا پتہ۔ میرے جسم میں کتنے انگارے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ اب تو شاید سرد بھی ہونے لگے ہوں یہ انگارے___ نہیں، سرد نہیں۔ بڑھتے بڑھتے پورے جسم میں پھیل گئے ہیں۔ پھیلتے پھیلتے......آپ نہیں سمجھیں گے۔' اُس نے گہرا سانس بھری۔

'لیکن پروپوزل۔؟'

''وہ بھی نیٹ سے برآمد ہوا تھا۔ صوفیہ کے ہونٹوں پر ہنسی تھی___ 'عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ تھکے ہارے لوگوں کے لئے یہ بھی ہاتھ آیا ایک موقع تھا مگر___ جس وقت بجیا اور بھائی اُس سے ملنے ہوٹل گئے، وہ ہوٹل کی لابی میں بیٹھا سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا' یہ بجیا نے ہی بتایا۔

اِن ڈسنٹ پروپوزل

ہوٹل کی لابی میں اس وقت زیادہ لوگ نہیں تھے۔ نادر اور صوفیہ اُس کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا۔ ظاہر ہے، وہ لڑکی کی تصویر دیکھ چکا تھا۔ لیکن اُس نے ملنے کا تجسس نہیں دکھایا تھا۔ سگریٹ کے گول گول مرغولے کے درمیان اُس کے چہرے کے تاثر کو پرکھا نہیں جا سکتا تھا___

نادر نے گلہ کھکھارتے ہوئے اُسے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس کی اُنگلیوں میں، مہنگی سونے کی انگوٹھیاں تھیں۔ عام طور پر مسلمانوں مردوں میں سونا پہننے کا رواج نہیں ہے۔ گلے میں بھی سونے کا ایک چین پڑا تھا۔ یقیناً اُس کی منشا یہ تھی کہ سامنے والا اُسے کسی رئیس سے کم نہ سمجھے۔

ثریا نے پہلو بدلا اور ناگوار آنکھوں سے نادر کو دیکھا___ اُس نے سگریٹ آرام سے ختم کیا۔ ایش ٹرے میں سگریٹ کے باقی ٹکڑے کو مسلا۔ پھر مسکرایا___

'معاف کیجئے گا۔ سگریٹ میری مجبوری ہے۔'

'کیوں نہ ہم معاملے کی بات کریں۔' نادر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

وہ ایک بار پھر مسکرایا___ 'مجھے بھی جانے کی جلدی ہے۔ دراصل میں سوچ رہا تھا___ نہیں، جانے دیجئے۔ کسی بھی چیز کو تاڑ کی طرح کھینچنے میں میری دلچسپی نہیں ہے۔ بھاگتی دوڑتی دنیا میں الجبرے کے فارمولے کی طرح میں نے زندگی گزاری ہے۔ دو پلس دو برابر چار___ سمجھ گئے نا۔ میرا پرپوزل ہوسکتا ہے، آپ کو پسند نہیں آئے۔ مگر سوچئے گا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ نہیں پسند آئے تو آپ جاسکتے ہیں۔ کوئی جہیز لیتا ہے۔ کسی کی کوئی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ کسی کی کوئی___ میرے پاس سب کچھ ہے۔ خود سے حاصل کیا ہوا___ اس لئے مجھے کچھ نہیں چاہئے۔' وہ ایک لمحے کو ٹھہرا اور دوسرے ہی لمحے جیسے نشانہ سادھ کر اُس نے گولی داغ دی......

''ایک دوسرے کو اچھی طرح سے سمجھنے کے لئے بہتر ہے کہ ہم ایک رات ساتھ ساتھ گزاریں۔''

اُس نے ہمارے تاثرات کی پروا نہیں کی۔ جملہ ختم کرتے ہی اٹھا اور دوسری طرف منہ کر کے دوسرا سگریٹ سلگالیا۔ لائٹر کی خوبصورت ٹیون کے ساتھ ایک شعلہ لپکا تھا، جس کی طرف پلٹ کر دیکھنے کی ہم نے ضرورت محسوس نہیں کی___

صوفیہ کا جواب

واپس گھر لوٹنے تک جیسے یہ دنیا ایک چھوٹے سے سیپ میں بند ہوچکی تھی۔ صوفے پر برسوں کی بیمار کی طرح ثریا دھنس گئی۔ دوسرے صوفے پر نادر نے اپنے آپ کو ڈال دیا۔ آنکھیں بند کرلیں۔ دل و دماغ پر پتھراؤ چل رہے تھے___ کب کس وقت صوفیہ آکر قریب میں بیٹھ گئی، پتہ بھی نہیں چلا۔ مگر جیسے ساری دنیا الٹ پلٹ ہوچکی تھی___ سیپ کے منہ کھل گئے تھے۔ یا سیپ، لہروں کی مسلسل اُچھال کے بعد ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئی تھی۔

'کیوں، کیا ہوا......؟'

یہ صوفیہ تھی۔ معمول کے خلاف اُس کے ہونٹوں پر ایک ہنسی بکھری ہوئی تھی___ جیسے وہ یقیناً اس موسم کی عادی ہو چکی ہو......!

جیجو پاس میں آ کر بیٹھ گئے۔ صوفیہ نے جیجو کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

'یہ آتش بازی بھی پھس ہوگئی۔ کیوں جیجو......؟'

لیکن یہ سچ نہیں تھا۔ نادر مشتاق احمد اور ثریا مشتاق احمد کی آنکھوں میں حساب کتاب کا سلسلہ جاری تھا___

'بتا دوں؟' یہ نادر مشتاق احمد تھا۔

'نہیں___ جیجو نے درد کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں___

'بتانے میں حرج ہی کیا ہے......' ثریا کی آواز دبی دبی تھی......

'نہیں۔ مجھے بتایئے۔' صوفیہ اور قریب آ گئی___ میں جانتی ہوں مجھے کوئی پسند نہیں کر سکتا۔ میں کتنی بار آپ لوگوں سے کہہ بھی چکی ہوں۔ مگر___ اللہ کے واسطے بتایئے ہوا کیا ہے......'

اور پھر، جیسے ایک کے بعد ایک آتش بازی چھوٹتی چلی گئی۔ آتش بازیوں کا کھیل رُکا تو دوسرا بم کا گولہ صوفیہ نے داغ دیا۔

'میں تیار ہوں۔ اُسے آنے دیجئے۔ کب بلایا ہے___؟' ثریا کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے، اُس نے اپنا فیصلہ سنا دیا___ میں تھک گئی ہوں۔ اب حوصلہ نہیں ہے، اب یہ کھیل ختم ہو جانے دیجئے۔ اب ایک آخری کھیل___ ہم سب کے فائدے کے لئے___ وہ پھر رُکی نہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئی___

ایک خوفناک کہانی کا انت

قارئین۔ کوئی دنیا اس سے زیادہ خوبصورت اور کوئی دنیا اس سے زیادہ بدصورت نہیں ہو سکتی۔ یہ میرا ماننا ہے۔ اور شاید اسی لئے بطور مصنف میں اس کہانی کا گواہ رہا___ بطور مصنف میں نے اپنے آپ کو بھی اس کہانی میں شامل کیا___ مجھے نہیں معلوم، ثریا اور نادر نے صوفیہ کی رضامندی کو اپنی منظوری کی ہری جھنڈی کیسے دے دی۔ یا پھر صوفیہ اس پروپوزل کے لئے مان

کیسے گئی۔ اس ترقی یافتہ ملک میں شادی کے اس بھیانک بازار کا تصور میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ شاید اسی لئے اس خوفناک کہانی کا انت سنانے کا حوصلہ مجھ میں نہیں ہے اور اسی لئے اب میں آپ کے درمیان سے رخصت ہوتا ہوں ___ جنوری ماہ کی بھیانک ٹھنڈک اپنے عروج پر تھی۔ اُس دن کی صبح عام صبح جیسی نہیں تھی۔ مگر صوفیہ مطمئن تھی۔ وہ شان سے گانا گنگناتی ہوئی اٹھی ___ دوپہر تک سردلہری میں اضافہ ہو چکا تھا ___

گھڑی کی تیزی سے بڑھتی سوئیاں ایک نئی تاریخ لکھنے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔

•

ڈرائنگ روم میں ایک دوسرے کو گھیر کر سب بیٹھ گئے تھے۔ جسے کسی میت میں بیٹھے ہوں۔ جنازہ اٹھنے میں دیر ہو ___ ایک ایک لمحہ برسوں کے برابر ہو۔ پھر جیسے ہونٹوں پر جمی برف، بھاپ بن کر پگھلی ___

'آہ! یہ نہیں ہونا چاہئے تھے......' یہ جیجو تھا۔

'کیا ہوگا؟' ثریا کی آنکھوں میں اُڑ کر وہی کیڑا آ گیا تھا ___

نادر نے بات جھٹکی ___ 'رات میں یہ کیڑے پریشان کر دیتے ہیں۔'

'شی...... وہ آرہی ہے......' جیجو نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی...... 'اور جان لو، وہ کوئی کیڑا نہیں ہے۔'

اور جیسے وقت تھم گیا ___ صوفیہ ایک لمحے کو اُن کے سامنے آکر رُکی ___

'آپ لوگ...... آپ لوگ اتنے پریشان کیوں ہیں۔'

نہیں۔ یہ وہ لڑکی تھی ہی نہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ڈر جانے والی ___ پتوں کی طرح بکھر جانے والی ___ اُس کی ساری تیاریاں مکمل تھیں ___

وقت آہستہ آہستہ قریب آرہا تھا۔

اُس نے پلٹ کر جیجو کی طرف دیکھا ___ نہیں یہ جیجو نہیں تھے۔ جیجو کی جگہ کوئی لاش تھی۔ چہرے پر، کاٹو تو خون کا نشان نہیں۔ آنکھیں بے حرکت......

اُس نے پلٹ کر بھائی کی طرف دیکھا۔ بھائی ہمیشہ کی طرح نظریں نیچی کیے، اپنے آپ سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا ___

بہن نے چہرہ گھما لیا تھا۔ اس لئے وہ بہن کے جذبات کو نہیں دیکھ سکی ___

پھر جیسے کمرے میں ایٹم بم کا دھماکہ ہوا___

'پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں بس، وہ آتا ہوگا___ میں کمرے میں ہوں۔ آپ اُسے کمرے میں ہی بھیج دیجئے گا۔'

اُس کی آواز نپی تلی تھی۔

پھر وہ وہاں ٹھہری نہیں۔ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی___

اور انت میں کہانی

کوئی امتحان ایسا بھی ہوسکتا ہے، اُس نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ بچپن سے لے کر آج تک اپنی خاموشی کے ریگستان میں چپ چپ سلگتی رہی۔ کسی نے بھی اُس کے اندر کی آواز کو کب سنا تھا۔ کسی نے بھی اُس کے اندر کی لڑکی کو کب دیکھا تھا۔ خود اُس نے بھی نہیں۔ نہیں۔ یہ سچ ہے۔ ایک عرصہ سے وہ اپنے آپ سے نہیں ملی۔ کمپیوٹر کو چنگ سے گھر اور گھر سے اپنے اُداس کمرے کا حصہ بنتے ہوئے بس وہ خلاء میں ڈوبتے ابھرتے بھنور کو دیکھنے میں ہی صبح سے شام کر دیتی___ کمرے کے آسیب چپ چپ اُسے گھیر کر بیٹھ جاتے___ اُسے سمجھنے والا کون تھا۔ اُسے پڑھنے والا کون تھا___ وہ عشق نہیں کرسکتی تھی۔ وہ اپنے لئے کوئی لڑکا پسند نہیں کرسکتی تھی۔ انٹرنیٹ پر چیٹنگ کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ کانپتے تھے۔ کسی لڑکے سے دو منٹ چیٹنگ کے بعد ہی اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چلنی شروع ہو جاتی۔ بدن کانپنے لگتا۔ سائبر کیفے کی ایک ایک شئے گھومتی ہوئی نظر آتی۔ وہ بدحواس پریشان سی گھر آتی تو......'

لیکن گھر کہاں تھا۔ ماں باپ ہوتے تو گھر ہوتا۔ بہن اور جیجو کا گھر، گھر کہاں ہوتا ہے۔ بھائی کا گھر، گھر کہاں ہوتا ہے۔ گھر میں تو سپنے رہتے ہیں۔ سپنوں کے ڈھیر سارے ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار___ یہ چھوٹے چھوٹے تارے تو ہتھیلیوں سے چھوٹ چھوٹ کر گرتے رہے۔ اندھیرے کمرے میں آسیبی مکالمے رہ گئے تھے___

'کھانا بنایا___؟'

نہیں۔

'کیوں؟'

خواہش نہیں ہوئی___

'خواہش یا......؟'

ہونٹوں پر ایک ناگوار سا تاثر اُبھرا___ کیا بس اِسی کام کے لئے رہ گئی ہوں___

''ہوسکتا ہے۔ بھائی نے یہی سوچا ہو۔''

'نہیں۔ بھائی اُس محبت کرتا ہے۔

'سارے بھائی محبت کرتے ہیں مگر......'

'میرا بھائی'......وہ کہتے کہتے رُک جاتی......

تمہارا بھائی ہر لحہ، تمہارے اندر رہتا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟۔

'نہیں'۔

'اُس کے پاس سپنے ہیں......'

'تو......؟'

'وہ اُڑنا چاہتا ہے۔ اُڑ کر اپنے لئے بھی سپنے دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر تم۔ افسوس۔ تم نے اُس کے سپنوں کو راچھس کے ان دیکھے قلعے میں نظر بند کر رکھا ہے۔ وہ تم سے چھٹکارا چاہتا ہے___'

'نہیں۔' ایک جھٹکے سے اُٹھ کر وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوگئی___ 'جھوٹ بولتے ہو تم۔ کوئی چھٹکارا نہیں چاہتا۔ سب پیار کرتے ہیں مجھ سے۔ ہاں، بس، عمر کے پنکھ پرانے پڑ رہے ہیں۔ پنکھ پرانے ہو جائیں تو کمزور ہو جاتے ہیں۔ میں ایک بے ارادہ سڑک بن گئی ہوں۔ کوئی گزرنا ہی نہیں چاہتا۔'

'نہیں ڈرومت۔'

کمرے کے آسیب اُسے گھیر رہے ہیں۔ خود سے باتیں کرتے ہوئے سارا دن گزار لیتی ہو۔ پتہ ہے، بہن کیا کہتی ہے؟

'نہیں'۔

'بھائی پر ناراض ہوتی ہے۔ اسی لئے تو تمہیں وہاں سے نکالا گیا۔ تم کوئی کام ہی نہیں کرتی تھی۔ بس سوتی رہتی تھی'۔

'سوتی کہاں تھی۔ میں تو خود میں رہتی تھی۔ خود سے لڑتی تھی'۔

'کیا ملا۔ بہن نے بھائی کے یہاں بھیج دیا'۔

'بھیجا نہیں۔ میں خود آئی......' کہتے کہتے ایک لمحے کو وہ پھر رُک گئی......

'دراصل تم ٹیبل ٹینس کی بال ہو...... سمجھ رہی ہو نا، چھوٹی سی ٹن ٹن...... بجنے والی بال...... لیکن اس بال کو راستہ نہیں مل رہا ہے......

'کیا کروں میں......'

'افسوس، تم ابھی کچھ نہیں کر سکتی___ تم صرف آگ جمع کرتی رہو۔ سن رہی ہو نا۔ آگ...... اپنے آپ کو برف کی طرح سرد مت پڑنے دو۔ سرد پڑ گئی تو...... لاش کو اپنے گھر کون رکھتا ہے۔ وہ بھی بدبودیتی لاش......'

●

ٹیبل ٹینس بال کی طرح ادھر اُدھر لڑھکنے کا سلسلہ جاری رہا___ پتہ نہیں، وہ کتنی بار مری۔ پتہ نہیں وہ کتنی بار زندہ ہوئی۔ بہن اور بھائی کے ہزاروں سوالوں سے لاتعلق، اپنے ہی آسیب سے لڑتی لڑتی تھک گئی تو اُس 'ان ڈسنٹ پروپوزل' کے ئے اُس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اور یہ حیرت کرنے والی بات تھی___ پہلی بار اُسے لگا۔ کمرے میں آسیب اکٹھا نہیں ہوئے ہوں۔ پہلی بار لگا، اُس کے اَن کہے مکالموں کی بھاپ سے کمرے میں 'کہاسے' نہیں جمع ہوئے ہوں___ کمرے میں خوف کی چادر ہی نہیں تنی ہو___ کمرے میں ڈھیر سارے چمگادڑ نہیں اکٹھا ہوئے ہوں۔ جیسے بہن، دھیرے سے ہنستی ہوئی ایک دن بھائی سے بولی تھی___ آسیب، وہاں آسیب رہتے ہیں سمجھاؤ اُسے۔ کمرے کو اپنی خاموشی سے اُس نے آسیب زدہ بنا دیا ہے اور یقیناً اُسے بھائی کا چہرہ یاد نہیں۔ بھائی نے ہمیشہ کی طرح نظریں جھکا کر کچھ دھیرے دھیرے کہنے کی کوشش کی ہوگی۔

مگر آج___

آوازوں کے تیر غائب تھے۔ شب خونی ہوا کا پتھراؤ گم تھا___ آئینہ میں وہ پاگل لڑکی موجود نہیں تھی۔ جسے بار بار بہن کی پھٹکار سننی پڑتی تھی۔ نہیں لڑکی۔ ایسے نہیں۔ مانگ ایسے نکالو۔ لباس، کپڑے کیا ایسے پہنے جاتے ہیں۔ زلفیں کیا ایسے سنواری جاتی ہیں۔

وہ دھیرے سے ہنسی___

آئینہ والی لڑکی بھی ہنسی۔

پھر وہ تیز تیز ہنستی چلی گئی___

●

کمرے کی دیوار گھڑی پر ایک اُچٹتی نظر ڈال کر وہ کمرے سے ملحق باتھ روم میں چلی گئی۔ کمرے کا دروازہ اُس نے 'اڈ گا' کر رکھا تھا، تا کہ اُس کی 'آہٹ کی اطلاع اُسے باتھ روم میں مل سکے۔ باتھ روم کا ٹائلس ذرا سا گندہ ہو رہا تھا۔ اُس نے شاور کے نیچے کے دونوں نل کھول لیے۔ گیزر چلا دیا۔ گرم گرم پانی جب تلووں سے ہو کر بہنے لگا تو وہ ٹائلس کو اپنے بے حد ملائم گورے ہاتھوں سے تیز تیز رگڑنے لگی۔ ٹائلس کے چاروں طرف صابن کے جھاگ پھیل گئے تھے۔ اُس نے اپنے لئے ایک بے حد خوبصورت اور سینسیشنل نائیٹی کا انتخاب کیا تھا۔ یہ نائیٹی سیاہ رنگ کی تھی۔ جو اُس کے گورے 'جھنجھناتے' بدن سے بے پناہ میچ کھاتی تھی۔ نائیٹی اُس نے باتھ روم کے ہینگر میں ٹانگ دیا۔ صابن کے گرم گرم جھاگ اور فواروں سے، وہ کچھ دیر تک اپنے ننگے پاؤں سے کھیلتی رہی ___ پھر مدہوشی کے عالم میں ٹوٹتے بنتے جھاگوں کے درمیان بیٹھ گئی ___ ایک لمحے کو آنکھیں بند کیں۔ دوسرے ہی لمحے کپڑے اُس کے بدن سے آزاد ہو کر اُڑتے چلے گئے۔ اُس نے نل بند کیا۔ جسم میں مچلتے طوفان کا جائزہ لیا ___ صابن کے جھاگوں کو ہاتھوں سے اُڑایا ___ پھر اپنے ننگے بدن کے ساتھ وہیں لیٹ گئی ___

کمرے کا دروازہ چڑ مڑایا تو اچانک وہ، جیسے خواب کی وادیوں سے لوٹی ___ منہ سے بے ساختہ آواز بلند ہوئی ___

''آپ انتظار کیجئے ___ آرہی ہوں۔''

ایک لمحے کو وہ حیران رہ گئی ___ کیا یہ اُس کی آواز تھی ___ ؟ صوفیہ کی آواز ___ جس کے بارے میں مشہور تھا کہ صوفیہ کے تو منہ میں زبان ہی نہیں۔ کیا یہ وہ تھی...... آج سارے موسم جیسے بدل گئے تھے ___ وہ بدل گئی تھی ___

ایک لمحے کو باتھ روم کی کنڈی پر ہاتھ رکھ کر وہ ٹھٹھکی ___ ، دروازہ بند کروں یا ___ نہیں ___ بند نہیں کروں گی ___ بند کرنے سے کیا ہوگا ___ آئینہ کے سامنے برقع پہننے سے کیا حاصل۔ شرط رکھنے والے کو تو سب کچھ دیکھنا ہے۔ اُسے پورا پورا۔ ایک وقت آتا ہے، جب مانگیں جسم سے آگے نکل جاتی ہیں۔ جسم کی ساری حدود توڑ کر۔ آگے۔ بہت آگے...... اُس نے ہلکی سی انگڑائی لی۔ بیسن کے آئینہ میں اپنے عکس کو ٹٹولا...... نہیں وہ ہے۔ ایک مدہوش کر دینے والی 'صفت' کے ساتھ...... نہیں، یقیناً، وہ کسی بیوٹی کنٹسٹ میں شامل نہیں ہے۔ مگر وہ...... ایک لمحے کو اُس نے

پلکیں جھپکائیں___ آئینہ میں گیزر چل رہا تھا۔نہیں یہ گیزر نہیں تھا۔ یہ تو وہ تھی۔ مجسم، سرتا پا آگ......

اُس نے گیزر بند کر دیا۔ٹھنڈے پانی کا شاور کھول دیا......شاور کی بوندیں آگ میں گرتی ہوئی دھواں دھواں منظر پیش کر رہی تھیں۔ چاروں طرف سے آگ کی جھاس اُٹھ رہی تھی۔ ٹائلس سے___ برہنہ دیواروں سے___ آئینہ سے___ اور___ وہ ایک دم سے چونکی۔ کمرے میں کوئی انتظار کر رہا ہے___ آگے بڑھ کر اُس نے ٹوول کھینچا___ ہینگر سے نائیٹی کھینچی۔ آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی۔ آئینہ میں بھاپ جم گئی تھی۔ تولیہ سے بھاپ صاف کرنے لگی۔ پھر ایک بار اپنے آپ کو ٹٹولا......اور دوسرے ہی لمحے دھڑاک سے اُس نے باتھ روم کا دروازہ کھول دیا___

کمرے میں، یعنی وہ جو بھی تھا، دیوار کے اُس طرف منہ کئے کسی سوچ میں گم تھا۔ دروازہ بھڑاک سے کھلتے ہی وہ یکا یک چونکا۔ اُس کی طرف مڑا اور یکا یک ٹھہر گیا___

سلیولیس نائیٹی میں صوفیہ کا جسم کسی کمان کی طرح تن گیا___ 'آئی ایم صوفیہ مشتاق احمد۔ ڈاٹر آف حاجی مشتاق احمد۔ عمر پچیس سال۔ پچیس سے زیادہ لوگ تم سے پہلے مجھے دیکھ کر جا چکے ہیں___ تمہارا نمبر؟'

'مجھے اس سے زیادہ مطلب نہیں......' یہ لڑکا تھا۔ مگر آواز میں کنپکپی برقرار___ جیسے پہلی بار جرم کرنے والوں کے ہاتھ کانپ رہے ہوتے ہیں......

'بیٹھیے۔' وہ آہستہ سے بولی۔

لڑکا بیٹھ گیا۔ اُس نے لڑکے کے چہرے پر اپنی نظریں گڑا دیں۔ چہرہ کوئی خاص نہیں۔ گیہواں رنگ۔ ناک تھوڑی موٹی تھی۔ بدن دبلا تھا۔ قد بھی پانچ فٹ سات انچ سے زیادہ نہیں ہوگا۔ وہ آسمانی جینس اور میرون کلر کی ٹی شرٹ پہنے تھا۔ میٹل سفاری شوز اُس کے پاؤں میں بالکل نہیں جچ رہے تھے___ لڑکا اُس سے آنکھیں ملانے کی کوشش میں پہلی ہی پائیدان پر چاروں خانے چت گرا تھا۔

'دیکھو مجھے......' وہ آہستہ سے بولی۔

'دیکھ رہا ہوں......' لڑکے نے اپنی آواز کو مضبوط بنانے کی ناکام سی کوشش کی۔

'نہیں تم دیکھ نہیں رہے ہو، دیکھو مجھے___ نائیٹی کیسی لگ رہی ہے......؟'

اس بار لڑکے نے ایک بار پھر اپنی مضبوطی کا جوا کھیلا تھا___ 'اچھی ہے......'
'اچھی نہیں۔ بہت اچھی ہے......' وہ مسکرائی ___ کیسی لگ رہی ہوں میں......'
لڑکا ایک لمحے کو سکپکایا___ وہ دھیرے سے ہنسی ...... نظر جھکانے کی ضرورت نہیں ہے...... دیکھنے پر ٹیکس نہیں ہے۔ اور تم تو...... کسی بازار میں نہیں، اچھے گھر میں آئے ہو...... یقین مانو۔ ایک دن تو یہ ہونا ہی تھا۔ اسی لئے تمہاری شرط کے بارے میں سن کر مجھے تعجب نہیں ہوا___ تمہارے لئے یہی بہت ہے کہ تم مرد ہو___ مرد ہو، اس لئے تمہارے اندر کا غرور بڑھا جا رہا تھا۔ پہلے تم نے جہیز کا سہارا لیا۔ رقم بڑھائی___ رقم دگنی تگنی کی اور پھر...... یقین مانو، میرے گھر والوں نے سوچا تھا کہ یہ موم کی مورت تو بُرا مان جائے گی۔ مگر میں نے ہی آگے بڑھ کر کہا...... بہت ہو گیا...... آخری تماشہ بھی کر ڈالو......'

باہر رات گر رہی تھی۔ نہیں، رات جم گئی تھی۔ جنوری ماہ کی ٹھنڈ لہریں جسم میں تیزاب برپا کر رہی تھیں۔ لیکن وہ جیسے ہر طرح کے سرد و گرم سے بے نیاز ہو کر ٹک ٹکی باندھے اُسے دیکھ رہی تھی۔

'بستر پر چلوں یا......'
'اتنی جلد...... اتنی جلدی کیا ہے......' لڑکے کی آواز گڑبڑائی تو وہ پوری قوت لگا کر چیخ پڑی___
'جلدی ہے۔ تمہیں نہیں۔ لیکن مجھے ہے___ تم سے زیادہ بھوکی ہوں میں___ کتنے بھوکے ہو تم___ پتہ ہے یہاں آ کر، اس کمرے میں آ کر مجھ سے نظریں ملاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے تمہیں___ بس اتنے بھوکے ہو۔ نہیں۔ باہر...... باہر والوں کی پرواہ مت کرو۔ وہاں ایک بھائی ہے، جب تک میں باہر نہیں نکلوں گی۔ تیر کی طرح زمین میں گڑا، اپنے ناکارہ ہونے کے احساس سے مرتا رہے گا___ سہمی سہمی سی ایک بہن ہوگی اور سہمے سہمے سے سوال ہوں گے___ نہیں اُن سوالوں کی پرواہ مت کرو___ میں کرتی تو اس وقت نائیٹی پہن کر تمہارے سامنے نہیں ہوتی___ اُنہیں بس یہی پڑی تھی کہ میری شادی ہو جائے___ پھر تم ملے۔ تم مجھے بستر پر آزما کر، میرے بدن کو منظوری دینے والے تھے۔ سچ، ایک بات بولنا۔ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے یا میرے بدن سے......'
'وقت___' لڑکے نے پھر مضبوط لفظوں کا سہارا لیا___ 'وقت بدل رہا ہے۔'

'وقت'___ وہ زور سے ہنسی ___ 'بدل رہا ہے نہیں۔ بدل گیا ہے۔ لیکن تم کیوں کانپ رہے ہو۔ دیدار کرو میرا، دیکھو مجھے۔'

کمرے میں نور کا جھماکا ہوا___

ایک لمحے کو اُس کے ہاتھ پیچھے کی طرف گئے ___ نائیٹی کے ہک کھلے اور نائیٹی ہوا میں اُڑتی ہوئی بستر پر پڑی تھی___

لڑکا بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ اُس کی پلکوں پر جیسے انگارے رکھ دیئے گئے تھے___ نہیں، انگارے نہیں___ برف کی پوری سِل___ وہ جیسے پلک جھپکانا بھول گیا تھا___ ہوش اُڑ چکے تھے۔ آنکھیں ساکت و جامد تھیں...... ایک دھند تھی جو روشندان چیرتی ہوئی کمرے میں پھیل گئی تھی۔

'دیکھو مجھے......'

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئینہ کے قریب آگئی___ ''دیکھو مجھے۔ میں نے کہا تھا، نا۔ تم سے زیادہ بھوکی ہوں___ پچیس لوگ تم سے پہلے بھی مجھے دیکھے بغیر واپس لوٹ چکے ہیں___ سمجھ سکتے ہو۔ پچیس بار تو یونہی مری ہوں گی___ شادی کے ہر احساس کے ساتھ بدن میں انگارے پلتے تھے___ جانتے ہونا، فرائیڈ نے کہا تھا، عورت مرد سے زیادہ اپنے بدن میں انگارے رکھتی ہے___ اور میں تو بڑی ہوئی تب سے انگارے جمع کرتی رہی تھی...... فلم سے سیریل، ٹی وی، دوست سہیلیوں کی شادی___ مجھ سے بے حد کم عمر لڑکیوں کے ہاتھ پیلے ہونے کے قصے...... ہر بار انگاروں کی تعداد بڑھ جاتی۔ میں ہر بار انگارے چھپا لیتی...... وہ زور سے چیخی___ رنڈی نہیں ہوں میں۔ بازار میں نہیں بیٹھی ہوں۔ تم نے سودا نہیں کیا ہے میرا۔ میں نے بھی تسلی کی تھی کہ اگر تم میرے شوہر ہوئے تو تمہیں تو پورا پورا مجھے دیکھنا ہی ہے___ اور پھر...... میرے گھر والے یوں بھی تھک گئے ہیں۔''

اُس نے بے حد مغرور انداز میں آئینہ میں اپنی ایک جھلک دیکھی۔ جیسے قلوپطرہ نے شانِ بے نیازی سے اپنی ایک جھلک دیکھی ہو اور فاتحانہ انداز میں سر اٹھا کر اپنے ملازموں سے کہا ہو___ یہ آئینہ لے جاؤ___ اس کا عکس بھی مجھ سے کم تر ہے۔ کوئی ایسا آئینہ خانہ لاؤ جو میری طرح دکھ سکے۔

وہ مغرور اداؤں کے ساتھ مڑی۔ بستر سے نائیٹی کو اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے نائیٹی کے

'بدن' میں داخل ہو گئی ___

لڑکا ابھی بھی تھر تھر کانپ رہا تھا......

'یہ کوٹھا نہیں تھا اور اتنا طے ہے کہ تم آج تک کسی کوٹھے پر نہیں گئے ___ دیکھو...... تم کانپ رہے ہو۔ نہیں، ادھر آؤ۔ اُس نے بے جھجک اُس کا ہاتھ پکڑا۔ مرر کے سامنے لے آئی۔ یو نو— تم کیسے لگ رہے ہو۔ جونا تھن سوئفٹ کے گھوڑے ___ لیکن نہیں۔ تم گھوڑے بھی نہیں ہو...... تم ایک ڈرپوک مرد ہو جو ایک خوبصورت بدن کو آنکھ اُٹھا کر غور سے دیکھ بھی نہیں سکتا ___ '

لڑکا بے حس و حرکت تھا۔ ساکت و جامد۔ لاش کی طرح سرد ___

صوفیہ مشتاق احمد کی آنکھوں میں برسوں کی ذلت چنگاری بن کر دوڑ گئی ___ بھوک، نفرت پر غالب آ گئی ___ 'دیکھتے کیا ہو ___ میں پوچھتی ہوں۔ اب بھی تم اس کمرے میں کھڑے کیسے ہو۔ تم تو شرط کا بوجھ اٹھانے کے قابل بھی نہیں ہو۔ نامرد کیڑے۔ نہیں۔ وہیں کھڑے رہو اور جانے سے پہلے میری ایک بات اور سن لو۔ میں نے کہا تھا نا تم سے زیادہ بھوکی ہوں میں— مگر رنڈی نہیں تھی۔ ارے، تمہاری جگہ میں ہوتی— میں نے شرط رکھی ہوتی تو کم از کم یہاں آنے کی جرأت کے بعد، میں نے نہیں کم از کم تمہیں چھوا ضرور ہوتا۔ دھیرے سے، تمہارے ہاتھوں کو...... کہ بدن کیسے بولتا ہے ___ کیسے آگ اُگلتا ہے۔ لیکن تم...... تم تو بند کمرے میں، اپنی ہی شرط کے باوجود، چھونا تو دور، اسے دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کر سکے......' ایک لمحے کو جیسے اُس کے اندر برقی لہر دوڑ گئی۔ بے حد نفرت کی آگ میں سلگتے ہوئے صوفیہ احمد نے اُسے زور کا دھکا دیا...... 'گیٹ لاسٹ۔'

لڑکا پہلے ہڑبڑایا۔ پھر سرعت کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ایک لمحہ کو صوفیہ مشتاق احمد مسکرائی۔ اپنا عکس آئینہ میں دیکھا ___ نہیں۔ اب اُسے مضبوط ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اُس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ باہر کہاسے گر رہے تھے۔ سرد ہوا تیز ہو گئی تھیں۔ کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ اُف، اس درمیان وہ جیسے وہ دنیا و مافیا سے بالکل بے خبر ہو گئی تھی۔ تیز، جسم میں طوفان برپا کرنے والی سردی کو بھی ___ اُس نے اپنے ہی دانتوں کے کٹکٹانے کی آواز سنی اور اچانک ایک لمحے کو وہ ٹھہر گئی۔ وہی جانی پہچانی دستک ___ خوفناک آوازوں کا شور۔ جیسے دیواروں پر کوئی رینگ رہا ہو۔ کیا ویمپائر......؟ ڈراکیولا......؟ باہر یقیناً اس پُر اسرار تماشے کا حال جاننے کے لئے اُس کے گھر والے موجود ہوں گے ___ اور اُس کا بے چینی سے انتظار بھی کر رہے ہوں

گے ___

مگر ...... یہ دستک ......خوفناک آوازیں ...... دیواروں پر رینگنے کی آواز ___ جیسے ہزاروں کی تعداد میں چمگادڑیں اُڑ رہی ہوں۔ پیڑوں پر اُلو بول رہے ہوں۔ شہرخموشاں سے بھیڑیوں کی چیخ سنائی دے رہی ہو ___ وہی رینگنے کی آواز ___ برفیلی، تیز ہوا سے کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے......وہ تیزی سے آگے، کھڑکی کی طرف بڑھی ___

گہری دھند کے باوجود شہرخموشاں کا منظر سامنے تھا اور وہاں دیوار پر چھپکلی کی طرح رینگتا ڈراکیولا، اس باراُسے بے حد کمزور سا لگا ___ شاید وہ شہرخموشاں میں واپس اپنے 'کوفن' میں لیٹنے جا رہا تھا۔

جبکہ صبح کی سپیدی چھانے میں ابھی کافی دیر تھی ___

پیرامڈ

(۱)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کمرے میں موت جیسا سناٹا پسرا تھا۔ موت جیسا نہیں۔ کمرے میں چپکے سے ایک 'موت' آکر گزر گئی تھی۔ جیسے تیز ہوا چلتی ہے...... سائیں سائیں...... جیسے لوہ یا جھکڑ چلتے ہیں...... جیسے ریگستانوں میں ریت کی آندھی بہتی ہے......اور اس آندھی کے پاگل کر دینے والی شور وجود میں وحشت اور دہشت کے گھنگھرو باندھ دیتے ہیں اور شروع ہو جاتا ہے تانڈو......

ڈم......ڈرم......ڈم......ڈرم......ڈرم......

باہر کتے بھی چپ ہیں...... رات نے اپنی پر اسرار خاموشی میں، موت کے جان لیوا احساس کو زندہ کر دیا ہے......

وہ ہے......

نہیں...... وہ نہیں ہے......

نہیں وہ ہے...... ابھی یہیں تھی...... پلکوں سے قریب...... آنکھوں سے، ذرا سے فاصلے پر، اس کے پاؤں سے پاؤں ملا کر چلی......اور اُس کے ہونٹوں پر چپ سی آکر بیٹھ گئی___

نہیں...... وہ نہیں ہے......

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی...... 'وہ نہیں ہے' کا احساس گرمی کی اُمس سے کہیں زیادہ بڑھ چکا تھا___ وہ ہے، اس کمرے میں ہے۔ اُس کی آنکھوں کی بے چین پتلیوں کے سامنے......

در، دروازے، کھڑکیاں، سب خاموش......

وہ پاؤں دابے چل رہا ہے ___ پراسرار رات کے بدن کو روندتا ہوا ___ چپ چپ اپنی لائبریری کے کمرے میں آگیا ہے ___ اس کمرے میں برسوں سے نہیں آیا ___ کتابیں در کتابیں...... دھول اور گرد و غبار میں ڈوبی کتابیں ___ ریک میں ، ایک قطار سے سجی ہوئی کتابیں ___ الماری کے کھلے پٹ سے جھانکتی کتابیں ___ جیسے سلیپ واکر ہوتے ہیں۔ نیند میں چلنے والے......

وہ سلیپ واکر بن گیا ہے...... چپ چپ ان کتابوں کے درمیان گھوم رہا ہے۔ پھر ایک بڑی سی موٹی سی کتاب کھول کر بیٹھ گیا ہے۔

گول سی انگریزوں کے زمانے کی میز ہے۔ میز پر برٹش راج کے وقت کی ایک اونچی سی سیاہ کرسی ہے ___ وہ اس کرسی پر بیٹھ گیا ہے۔ کتاب کھل گئی ہے...... آنکھیں وحشت زدہ سی کتاب کے صفحوں پر دوڑ رہی ہیں...... پیرانڈ...... وقت کی سوئی چلتے چلتے ٹھہر گئی ہے۔ حال، ماضی بن گیا ہے ___ ماضی حال ___ وہ وقت کی گردش سے دور نکلنے کی کوشش کر رہا ہے ___

پیرانڈ ___

زندگی سو رہی ہے اور اندھیرے میں پیرانڈ جاگ گئے ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں پیرانڈ......

اُس کی آنکھیں نشہ میں ڈوبی لگ رہی ہیں...... ایک عجب سی بے اطمینانی اُس کے وجود پر حاوی ہے ___ کسی بڑے مفکر کی طرح وہ کتاب پر جھک گیا ہے ___ آنکھیں بند ہیں...... ہونٹ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہے ہیں...... نیل ہے...... نیل ہے...... نیل کہیں جا ہی نہیں سکتی...... نیل ہے...... یہیں آس پاس...... وہ اسے محسوس کر سکتا ہے...... اُسے چھو سکتا ہے...... چھو سکتا ہے......

تم کہاں ہو

کہاں ہو نیل......

کہاں چھپ گئی ہو......؟

پھر جیسے معصوم ہنسی کی 'جھڑی' لگ گئی ___

___ لو آ گئی ___

کہاں تھی نیل؟

یہیں تو تھی......

یہاں......؟

ہاں، تمہاری کتابوں میں......

کتابوں سے باہر نکلو ___ باہر نکلو نیل...... میرا ہاتھ تھامو...... چلو...... چلنے کی پریکٹس کرو...... پریکٹس کرو نیل......

پھر وہی معصوم ہنسی...... 'میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔ چلوں گی نہیں۔ پہچانوں گی نہیں...... اٹھوں گی نہیں۔ بیٹھوں گی نہیں۔ بس تمہاری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دوں گی ___ آنکھیں نہیں...... پوری پوری خود کو ڈال دوں گی...... پتلیوں کے جھولے میں جھولہ، جھولوں گی...... جھولہ ٹوٹ گیا تو......؟'

کمرے میں اڑتی ہوئی ایک چمگادڑ آ گئی تھی...... بلب کی مدھم روشنی...... بے رونق دیواریں...... دھول سے بھری المیرا......

فادر تھامسن سر پر کیپ برابر کرتے ہیں۔ سینے پر کراس کے نشان بناتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں ___ یہ سب کیوں جاننا چاہتے ہو اسلم شیرازی ___ دُنیا ایک دھند ہے۔ جو اس دھند سے باہر نکل گیا، اسے بھول جاؤ ___

ایک لمبی سانس ___ آپ مجھے پیرامڈ کے بارے میں بتا رہے تھے......

'قدیم داستانیں ___ فادر تھامسن کے چہرے پر بل پڑ گئے ہیں ___ ہاں، کیا بتا رہا تھا ___ ہاں— وہاں گیا تھا میں۔ اسفنکس کے جنوب میں۔ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ ۲۰ سے ۲۵ ہزار مزدوروں پر مشتمل ___ (قہقہہ)...... بستی نہیں، مزدوروں کا قبرستان کہو۔ قبرستان......

'سب مردے تھے......؟'

'نہیں۔ ہاں ___ مردے...... ہم کون سے مردے نہیں ہیں اسلم شیرازی...... سب مردے ہیں...... وہ مرے ہوؤں کے لیے کام کرتے تھے...... جیسے گورکن ہوتے ہیں تمہارے ہاں۔'

'گورکن قبر تیار کرتے ہیں۔'

ایک ہی بات ہے ___

فادر ہنستے ہیں ___ گورکن زندہ رکھنے کا راز نہیں جانتے۔ قدیم ممیاں...... ان ممیوں کو

صدیاں دینے والے مزدور جانتے تھے کہ مرنے کے بعد بھی انسان کو زندہ کیسے رکھا جا سکتا ہے......
تمہیں یقین نہیں آئے گا اسلم شیزاری مگر میں ایسے کچھ مزدوروں سے ملا ہوں۔ وہ بتاتے ہیں۔ انہوں نے رات کے وقت ایسے کئی ممیوں کی کھلی آنکھیں دیکھی ہیں۔ان سے گفتگو کی ہے۔ نا قابل یقین مگر سچ ___

فادر ایک بار پھر کراس چومتے ہیں ___

نیل بن رہی ہے

نہیں پیارے قارئین، یہ کہانی وہاں سے شروع نہیں ہوسکتی، جہاں سے آپ چاہتے ہیں___ اس کہانی کے لیے ۵۷۔۵۸ برسوں کا ایک ملک ہے، جہاں مسلسل ایمانداری اور وفاداری کی دہائیاں دینے کے بعد بھی اسلم شیرازی گھٹتا ہی رہتا ہے___ گھٹتے گھٹتے ضدی اور چڑچڑا ہو گیا ہے۔غصور اور بد دماغ بھی___ وہ اپنا تمام تر غصہ، اپنی بیوی فاطمہ پر نکالتا ہے___

'جہنم میں جائیں مسلمان......'

کیوں؟

'کیونکہ وہ جہنم میں جانے کے لیے ہی بنے ہیں۔'

ایسا کیا کر دیا مسلمانوں نے؟

کیا کر دیا___؟ اسلم شیزاری غصے سے چیخ مارتا ہے۔' کیا نہیں کر دیا۔ پاکستان سے افغان تک......بابری مسجد سے لے کر......'

وہ ایک لمحے کو رکتا ہے___ ہم چپ کیوں نہیں رہ سکتے۔اقلیت میں ہیں اس لیے......

فاطمہ اس جملے کو دہراتی ہے___ جو اقلیت میں ہیں، انہیں چپ رہنا چاہئے۔ کیوں؟ مر جانا چاہیے___'

'نہیں مر جانا نہیں۔ بس چپ رہنا چاہیے۔'

تب نیل نہیں بنی تھی۔ نیل نہیں آئی تھی۔ نیل کا جنم نہیں ہوا تھا___ اسلم شیرازی عمر کی چالیس پائدان پر کھڑا، آزادی کے بعد ہونے والے واقعات کے دھوئیں میں پلا بڑھا صرف اور صرف غصہ کرنے کے لیے پیدا ہوا تھا۔ایک بے حد حساس اور جذباتی آدمی___

فادر اسمتھ پڑوس میں ہیں۔ کبھی کیتھولک چرچ میں ہوا کرتے تھے۔اب نہیں۔ چرچ

کی آپسی سیاست سے گھبرا کر استعفیٰ دے کر چلے آئے۔ آنکھوں پر خوبصورت سا گولڈن فریم کا چشمہ ___ بڑی سی داڑھی ___ گیہواں رنگ ___ وہ اسلم شیرازی کے غصے پر بار بار ہنس دیتے ہیں ___

'اقلیتوں نے اس ملک پر بہت ظلم ڈھائے ہیں۔ ناراض کیوں ہوتے ہو ___'

'میں نے تو نہیں ڈھائے ___'

تم نے — تم نے ہی نام بدل کر ڈھائے ہیں۔ میں نے بھی ___ 'فادر تھامسن زور زور سے ہنستے ہیں ___ غلطی یہ ہے کہ یہ اتہاس نہیں بھول سکتے۔ اس لیے اتہاس بدل دینا چاہتے ہیں۔ دیکھو اسلم شیرازی۔ ہم دونوں اسی لیے دوست ہیں کہ ہم دونوں اقلیت میں ہیں ___'

'اقلیت میں ہونا جرم ہے!'

'ہاں۔ جرم ہے ___ سچی بات تو یہ ہے کہ اس ملک میں اقلیت میں ہونا سب سے بڑا جرم ہے ___ اُنہیں اکثریت میں ہونے کے فائدے نہیں ملیں گے تو وہ یہ جرم کریں گے۔ بار بار کریں گے ___ کیونکہ بیچارے ایک سرکار تک اپنی نہیں بنا سکتے ___ بناتے بھی ہیں تو کئی وچار دھاراؤں کا سہیوگ مانگنا پڑتا ہے ___''

اسلم شیرازی کو ڈر لگتا ہے۔ وہ مکمل طور پر آگئے تو......؟'

'اتنا کیوں سوچتے ہو۔ تب کیا ہوگا ___ ہمارا جینا مشکل ہو جائے گا۔ مگر......' فادر ہنستے ہیں۔ اس وقت ہم نہیں ہوں گے۔ ہمارے بچے ہوں گے۔ فکر کیوں کرتے ہو ___ بچے سمجھیں گے ___'

'بچے آتو جائیں پہلے......' اسلم شیرازی نے سر جھکا لیا۔ 'فاطمہ کہتی ہے کہ......'

ہو...... ہوءءء فادر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا ___ تمہیں لڑکی ہوگی ___ دیکھ لینا۔ ایک اقلیت لڑکی ___ تمہاری، اقلیتوں کی آبادی میں ایک لڑکی کا اضافہ ___

تب نیل نہیں بنی تھی......

●

ممکن ہے، بہت ساری باتوں کا اس کہانی کے ساتھ کوئی لینا دینا نہ ہو، مگر اسلم شیرازی ___ ہوش سنبھالنے سے اب تک، یعنی فاطمہ کے زندگی میں آنے اور نیل کے بننے تک،

دن اور تاریخ کے حساب سے چھوٹی سے چھوٹی بات کا گواہ رہا ہے۔ مثلاً اُس کے گھر والے بتاتے تھے کہ جب وہ پیدا ہوا، شہر میں کرفیو لگا ہوا تھا ___ جس دن اُس کا عقیقہ ہوا، اس دن گھر پر مشکل سے چند لوگ آئے تھے۔ کسی کو بھی اس موقع پر نہ آنے کے لیے کوئی سا بھی بہانہ بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ شہر کی فضا اچھی نہیں تھی۔ اور کئی علاقوں سے توڑ پھوڑ کی خبریں بھی موصول ہوتی رہی تھیں۔ جس دن گھر کے پاس والے مدرسہ میں اُس کا نام لکھایا جانا طے ہوا تھا، اس دن نام اس لیے نہیں لکھا جاسکا کہ محلے کی مسجد کے پاس کسی نے سور کے گوشت کی ہڈی ڈال دی تھی ___ یہاں جان بوجھ کر صرف وہی معاملے درج کیے جا رہے ہیں، جو اسلم شیرازی کے ساتھ گزرے ___ جب کہ انگلیوں پر گنے جانے والے وہ دن اور تاریخ بھی یاد ہیں کہ بدیع ماموں کے نکاح کے دن کیا ہوا۔ ریشمہ آپی کی شادی کے روز کہاں بم چھوٹا ___ یوسف بھائی نے جس دن پہلی بار اپنی دکان کھولی، اس دن محلے میں ہوئے ہنگامے میں کافی دکانیں لوٹ لی گئیں اور......

بچپن سے آنکھ مچولی کے اس کھیل میں بڑے ہونے تک، آسمان میں پھیلتے منڈراتے دھویں رہ گئے تھے، جس کو سہما سہما سا دیکھتا ہوا اسلم شیرازی اپنی تقدیر کا ماتم کرنے پر مجبور تھا۔

تب نیل نہیں آئی تھی ___

ہاں، چپکے سے، کھلے روشندان سے آتی روشنی کی طرح، فاطمہ نے اس کی زندگی میں دستک دی تھی ___

'اب اتنا اندھیرا بھی نہیں ہے، جتنا تم سوچتے ہو......'

'پتہ نہیں......'

'سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہے۔ کیا یہ غنیمت نہیں کہ ہم ہنس سکتے ہیں۔ پڑھ سکتے ہیں...... خوش ہو سکتے ہیں ___ اور...... پیار کر سکتے ہیں ___ '

'پیار...... ایک ڈراؤنے ماحول میں......'

'ڈراؤنے ماحول میں......؟ فاطمہ نے چونک کر اسکی طرف دیکھا ___ کہاں ہے، ڈراؤنا ماحول ___ ؟ چلو مجھے دکھاؤ...... اس کی کانپتی انگلیاں، اس کی ہتھیلیوں پر ناچ رہی تھیں۔

'پاگل پن ہے تمہارا ___ سب جگہ ایسا ہی ہے۔ پڑوسی ملکوں کی بات چھوڑو، یوروپ میں دیکھ لو۔ وہاں کیا ہو رہا ہے......'

'لیکن جہاں کہیں بھی ہو رہا ہے، ہونے والی ہر دہشت گردی مسلمانوں سے جوڑ دی

جاتی ہے......'

'جوڑا اس لیے دی جاتی ہے...... کہ تم کر رہے ہو۔ میرا مطلب ہے......' فاطمہ نے اس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے تھام لیا___ 'مسلمان ایسا کیوں کر رہے ہیں آخر۔ کشمیر میں یا باہری ملکوں میں___ جان لینے والوں کو قاتل یا ہتھیارا کہنے کی مہم کیوں شروع نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کو پکڑو اور شوٹ کر دو___ مسلمان کریں گے تو مسلمان ہی بدنام ہوں گے، نا......'

فاطمہ کی آنکھوں کا رنگ یکا یک بدلا تھا...... 'زندگی میں جنگ اور خوف سے الگ بھی ایک راستہ ہوتا ہے۔ اس راستہ کو سمجھو۔ ہمیں اسی راستے پر چلنا ہے...... دور تک...... ایک ساتھ......'

اُس نے سر جھکا لیا۔ ہونٹ لرز رہے تھے...... پتہ نہیں کیوں۔ ہاں، پتہ نہیں کیوں، بار بار ڈر جاتا ہوں۔ اب تو جیسے ڈر جانے کی عادت پڑ جانی چاہئے تھی۔ ذرا سا آسمان صاف ہوتا ہے، دل میں جمی گرد کے ہٹنے کا خیال آتا ہے کہ پھر وہی دھند۔ اس دھند میں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ پھر سے وہی خوف کے خیمے......'

'اس خوف سے باہر کیوں نہیں نکلتے......'

'کیسے نکلوں...... نکلنا چاہتا ہوں مگر...... 'مجھے یقین ہے—' اُس کی آواز پھنسی پھنسی اور ڈری ڈری تھی......

'نہیں تمہیں نکلنا ہوگا۔ آہ تم اس بات کو بھی بھول گئے کہ...... فاطمہ نے آگے بڑھ کر اس کا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے پھولے ہوئے پیٹ پر رکھا...... یہاں دیکھو...... میرے لیے نہیں تو کم از کم...... ایک خوش رنگ تتلی تمہارے آنگن میں کھیلنے کے لیے آنے والی ہے— سمجھ رہے ہونا......'

'ایک خوش رنگ تتلی'...... اسلم شیرازی نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔ فاطمہ کو پلٹ کر دیکھا۔ وہ جیسے اعتقاد بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ماں بننے کا ایک مقدس احساس اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ اسلم شیرازی کو لگا، وہ پہلے سے کچھ زیادہ مضبوط ہو گئی ہے اور اس مضبوطی میں پیٹ میں تیرنے والے، ہولے ہولے چلنے والے اس نئے انسان کا بھی ہاتھ ہو...... جسے وہ محض 'خوف' کی شکلوں میں دیکھ رہا تھا۔ آہ اپنے ہی بچے کے لیے یہ احساس کتنا ڈراؤنا تھا...... بال...... خوف جیسے...... ایک دوسرے میں گتھے، الجھے ہوئے...... جیسے پتلے دبلے رینگتے ہوئے سانپ ہوتے ہیں۔ آنکھیں خوف زدہ...... ہاتھ ٹیڑھے میڑھے...... جسے خوف اور

وحشت نے مل کر ایک 'لنج پنج' سی شکل دے ڈالی ہو......اور جسم......تھرتھراتا، ہلتا ہوا سا___ جیسے پارکنسنز ڈیزیز کے مارے ہوئے، عمر دراز لوگ ہوتے ہیں۔ ہلتے ہوئے___ مسلسل ہلتے ہوئے...... دماغ سے کمزور...... دونوں پاؤں پاس پاس دابے، چلنے کی آزمائش سے گزرتے ہوئے...... ہونٹ، آنکھیں، چہرہ...... جسم...... جیسے اندر مسلسل ہلتے ہوئے، اس نئے انسان کو خوف کی علامت بنا کر اس دنیا میں بھیج دیا گیا ہو......

جیسے کوئی ڈراؤنا سپنا ہوتا ہے......نیل کے دنیا میں قدم رکھنے تک بار بار اسلم شیرازی اس سپنے سے زخمی ہوتا رہا......

نہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے......

'مائی ڈیر......ایسا ہوتا ہے......ہوتا ہے......' فادر تھامسن اُس کے ساتھ صبح کی چائے پی رہے تھے۔ دھوپ چاروں طرف کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ کبوتروں کے جھنڈ آسمان پر تیرتے ہوئے ایک طرف سے دوسری جانب پرواز کر رہے تھے۔ اُسے احساس ہوا۔ فادر کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں اتر آئی ہیں......

'ہیرالڈ___ تم نے پھر کوئی بھیانک سپنا دیکھا کیا......؟'

'آہ، نہیں فادر......' اُس کے لہجے میں تھرتھراہٹ تھی......آپ تو سب کچھ پڑھ لیتے ہیں......'

'ایک اقلیت کا آدمی، اپنے ہی جیسے آدمی کا درد سمجھتا ہے___ فادر مسکرائے___ 'ہیرالڈ میں نیا کچھ بھی نہیں مائی ڈیر۔ بس، کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی یہ قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے کہ وہ مر چکے ہیں۔ اس لیے وہ اپنی زندگی میں ہی مرنے کے بعد کے جشن کی تیاری کر چکے ہوتے ہیں۔ قیمتی سامان۔ آنکھیں کھلنے کے بعد پتہ نہیں کس چیز کی ضرورت محسوس ہو۔ کچھ لوگ تو اپنے نوکر، کنیزوں کو بھی مرنے کے بعد آس پاس سلائے جانے کی وصیت کر جاتے تھے تاکہ آنکھیں کھلتے ہی وہ اپنے نوکروں کو آواز دے کر جگا سکیں......'

'تو کیا کبھی کسی کی آنکھیں کھلیں؟ میرا مطلب ہے......'

'ارے نہیں......' فادر تھامسن ہنسے۔ 'مرنے کے بعد کوئی زندہ ہوتا ہے کیا؟ ہنستے ہنستے وہ چپ ہوتے ہیں___ 'تم اسے تہذیب کی اس نہ ختم ہونے والی کہانی سے جوڑ سکتے ہو، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ایک دن سب کچھ فنا ہو جانا ہے۔ سمجھ رہے ہو نا___ پتھروں پر لکھی تحریریں

انہیں ہم تک پہنچاتی ہیں ___ اڑتی ہوئی ریت، تیز چلتی ہوئی ہوا، آسمان پر روشن سورج ہر بار ان مٹ گئی تہذیبوں کے لیے ہمارے اندر ایک نہ ختم ہونے والا تجسس پیدا کرتا ہے...... یہ موت اور موت کے بعد بھی زندگی کو بچائے رکھنے کا وہ 'اسرار' ہے، جسے انسان کھونا نہیں چاہتا۔ اونچی سے اونچی عمارتیں بنانے والا اور دنیا میں حکومت کے خواب دیکھنے والا بھی یہ جانتا ہے کہ ایک دن...... ایک دن وہ مرجائے گا۔ مگر آہ! ___ وہ مرنے کے بعد پھر زندہ رہنا چاہتا ہے......' فادر تھامسن مسکرائے...... جیسے تمہارے اندر کا خوف۔ تم نے برسوں سے کسی فرعون یا شہنشاہ کی طرح اپنے اندر کے خوف کو، اپنے دل کی ممی میں سلا دیا ہے۔ مگر آہ!...... یہاں الٹا ہے مائی فرینڈ...... وہ خوف جاگ گیا ہے اور دیکھو تو سہی — جیسے جیسے تمہارے یہاں ولادت کا دن قریب آتا جارہا ہے، وہ خوف مسلسل تمہارے چہرے سے عیاں ہورہا ہے۔ مگر کیوں مائی ڈیر فرینڈ ___

●

حقیقت یہ ہے کہ اسلم شیرازی اس راز سے خود بھی واقف نہیں تھا۔ اپنے خوف کو وہ الگ الگ شکلوں میں دیکھتا اور محسوس کرتا تھا۔ مثلاً جس بستر پر وہ سو رہا ہے — اس کے ٹھیک اُوپر گرمی کے موسم میں اپنی پتلیوں کے ساتھ ناچتا ہوا پنکھا اُس پر گرسکتا ہے — گھر سے باہر نکلتے ہی گھر کا کوئی بھی فرد انجانے حادثے کا شکار ہوسکتا ہے...... اگر ٹرین سے کہیں باہر کا سفر ہے تو ممکن ہے آگے ریل کی پٹریاں ٹوٹی ہوئی ہوں اور چیختی چنگھارتی ٹرین کسی حادثے کا شکار ہوسکتی ہو ___ اسلم شیرازی گھر سے باہر ہوتا تو فاطمہ میں دل الجھا ہوا ہوتا۔ پتہ نہیں گیس کھلا نہ چھوڑ دیا ہو ___ ٹائلس کی زمین کتنی چکنی ہوتی ہے، کہیں پاؤں نہ پھسل گیا ہو...... پھر فادر تھامسن کی آواز اُس پر حاوی ہوجاتی...... تم نے اپنے دل کے نہاں خانے میں ایک پیرامڈ بنالیا ہے۔ اس میں تمہارا خوف سو رہا ہے مگر افسوس ___ اس خوف کی آنکھیں بار بار کھل جاتی ہیں......

کبھی کبھی زور زور سے چلانے کی خواہش ہوتی...... مجھے اس پیرامڈ سے مکتی دے دو۔

میں اس خوف سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔

'مگر کیسے......؟'

'اگر میں سوچ لوں کہ آسمان پر چمکتا ہوا سورج پہلے سے کہیں زیادہ چمکیلا ہوگیا ہے......'

تم نہیں سوچ سکتے......

''اگر میں سوچ لوں کہ......آسمان پر چمکتی تاروں کی بارات، میری اپنی زندگی میں اُتر آئی ہے......

وہم ہے تمہارا......

اگر میں سوچ لوں کہ......آہ، تم کچھ بھی نہیں سوچ سکتے۔ اس لیے کہ تم صرف اور صرف خوف کے سائے میں جیتے رہے ہو......شاید آزادی کے ان ۵۸ برسوں میں صرف اور صرف ایک اقلیت ہونے کا احساس تمہارے اندر رہ گیا تھا، جو ہر قدم پر تم کو ڈرانے، دھمکانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ نہیں، اس طرف مت جاؤ۔ خطرہ ہے۔ وہ تمہارے کلیگ نہیں ہیں، دوسرے مذہب کے ہیں۔ ترشول دھاری___ مذہب کی اپنی راہیں اپنے قانون ہوتے ہیں___ اُن کے قانون تمہارے قانون، سے اور ان کی راہیں تمہارے راستہ سے مختلف ہیں۔ اسلم شیرازی نہیں جانتا تھا کہ ایسا صرف وہی سوچ رہا ہے یا ایسا وہ دوسرے بھی سوچ رہے تھے جو اُس کی طرح ایک اقلیت گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے آتش بازی یا پٹاخہ کی آوازیں اس کے اندر خوف ہی خوف بھرنے کا کام کیا کرتی تھیں___

تو یہ اُنہی دنوں کا قصہ ہے جب پیرا نڈ بار بار اسلم شیرازی کے خوابوں میں آرہا تھا اور بقول فاطمہ، نیل بن رہی تھی___ اور یہ اُسی لہولہو شام کا واقعہ ہے جب شہر سے پانچ کیلومیٹر دور پانچ پیر کی مزار کے پاس ایک مردے کی آخری رسومات کو لے کر دو فرقے کے لوگ آپس میں لڑ گئے تھے۔ اُس دن وہ دفتر میں تھا۔ شام کے پانچ بجے تک جب یہ خبر اس تک پہنچی تو اس نے پہلا کام یہ کیا، بغیر کسی کو بتائے دفتر چھوڑ دیا___ باہر آیا، تو سنہرے آسمان کا رنگ مختلف نظر آیا___

شاید ایک فاختہ تھی، جو اس کے باہر آتے ہی آسمان پر دور تک اڑتی چلی گئی تھی۔ نہیں وہ گدھ تھا۔ اور یقیناً یہ اس کی نظروں کا دھوکہ نہیں تھا۔ اسلم شیرازی نے گدھ کی تیز آنکھوں میں ایسی چمک محسوس کر لی تھی، جو کسی مردے کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہیں___ شہر کی دکانوں پر شٹر گر رہے تھے۔ لوگ جلد بازی میں نظر آرہے تھے......

یہ وہی لمحہ تھا، جب حواس باختہ، گھر کے اندر داخل ہونے پر اُس کی تیز تیز چلتی ہوئی سانسوں اور چہرے کے اڑے ہوئے رنگ کی پروا کیے بغیر فاطمہ نے دوٹوک انداز میں آج کے دن کے سب سے بڑے واقعہ کی روداد سنائی___

'اپنا ڈرا سہا چہرہ واش بیسن کے حوالے کردو اور ہاں سنو— میری طبیعت خراب لگ رہی ہے۔ ممکن ہے...... ممکن ہے...... ، اس نے سنبھل کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی......

''ممکن ہے، نیل کے آنے کا وقت ہو گیا ہو......''

'اوہ یقیناً!'

واش بیسن پر اپنا چہرہ دھوتے ہوئے وہ پُر امید تھا— یقیناً، نیل نے اپنے لیے ایک ایسے موسم کا انتخاب کیا ہے، جیسا کہ اس نے سوچا تھا۔ ایک جلتی ہوئی شام۔ آسمان پر منڈراتا گدھ___ اور شہر کی خطرناک فضا۔

آدھی رات ہوتے ہوتے شہر کے مختلف علاقوں سے لوٹ پاٹ کی خبریں موصول ہو چکی تھیں۔ اور یہی وہ وقت تھا جب نیل نے اُس کی دنیا میں آنے کے لیے اپنے ننھے منّے ہاتھ پاؤں نکالے تھے— مگر کہاں۔ نیل کہاں تھی......؟

اس سے پہلے کہ وہ چیخنے کی کوشش کرتا، ڈاکٹر نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی......

'نہیں۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے...... وہ ہے___ مگر بننے کے عمل میں ہے...... اور...... کیا کیجئے گا۔ کچھ بچے...... ہوتے ہی ایسے ہیں...... دل چھوٹا مت کیجئے۔ ابھی بچے کو نگرانی کی سخت ضرورت ہے۔

نیل کے بننے کے بعد

آرمینیا آرٹ سینٹر بلڈنگ کے دوسرے مالے پر اس کا کمرہ تھا۔ این. جی اوز کی طرف سے چلائی جانے والی اس ایفروایشیائی تنظیم کا مقصد تھا، 'ہم اپنی قدیم تہذیب کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شروع کے بے روزگاری کے دنوں میں جب فاطمہ زندگی میں نہیں آئی تھی، تبھی سے وہ اس تنظیم میں شامل ہو گیا تھا۔ اس وقت کم پیسے ملتے تھے۔ دفتر بھی کسی چھوٹی جگہ کے ایک کمرے میں تھا۔ بہت ممکن ہے، اس وقت تک تہذیب کو بچانے کی مہم نے زور نہیں پکڑا ہو۔ پھر جیسے جیسے این. جی اوز پر گاڈ کی مہربانی ہونے لگی، پیسے برسنے لگے۔ کام بڑھ گئے۔ آرمینیا آرٹ سینٹر بلڈنگ کرائے پر لے لی گئی۔ 'سیو اور سویلائزیشن' سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا کام اس کے ذمے تھا۔ انٹرنیٹ، پبلک سروس، ایفروایشیائی سروے کے بعد اُس کے ساتھ جڑے ہوئے لوگ اپنی

اپنی رپورٹ تیار کرتے تھے۔ این جی اوز کی طرف سے پابندی سے، ہر ماہ ایک میگزین بھی شایع ہوتی تھی۔ اس کا اسٹاف الگ سے تھا۔ یہاں سے بہت چھوٹی چھوٹی معلوماتیں جمع کرکے اس کی رپورٹ ہیڈ کوارٹر بھجوائی جاتی تھیں۔ مثلاً اجودھیا کی مٹی میں پراچین سبھیتا تلاش کرنے کا مسئلہ ہو۔ ایک ایسی مٹی جو زمانۂ قدیم میں راجہ دشرتھ کے وقت کی مٹی سے میل کھا سکتی ہو۔ سینکڑوں فٹ نیچے کی زمین سے، آثار قدیمہ کے طور پر کچھ بھی پالینے کا تجسس، تہذیبوں پر ریسرچ کرنے والوں کی آنکھوں میں ایک انوکھی چمک بھر دیتا تھا ___ حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایسی چمک کے پیچھے ہر بار اپنے لیے نفرت کے رنگوں کو ہی محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ لکھیا سنگھ کا بچہ......

یقینی طور پر کہہ سکتا ہوں کہ آپ لکھیا سنگھ کو نہیں جانتے۔ اُسے جاننا ایسا کوئی ضروری بھی نہیں ہے۔ مگر لکھیا سنگھ ان لوگوں میں سے ایک ہے، جو ہر بار اسلم شیرازی جیسے لوگوں کے راستہ میں اپنی زہریلی باتوں کا دھواں بچھا دیتے ہیں۔ جیسے اس دن..... لکھیا سنگھ کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

'مان لو۔ کھدائی سے ایسا کچھ برامد ہو جاتا ہے میاں، جو تمہارے لیے تصدیق دے، کہ وہاں ہم ہی ہم تھے تو پھر ___ بوریا اٹھاؤ گے۔ پاکستان جاؤ گے......؟'

'کیوں؟'

'نا ___ تمہیں تو نہ چٹ منظور نہ پٹ......'

اُسے احساس تھا، لکھیا جیسے لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس 'تہذیب بچاؤ' جیسی مہم میں بھی، ایسے لوگوں کی شمولیت بڑھتی جائے گی، اُسے اس کا اندازہ نہیں تھا۔ آرمینیا آرٹ سینٹر کے اس کشادہ ایرکنڈیشن کمرے میں اسلم شیرازی پر جو ذمے داریاں ڈالی گئی تھیں وہ عام طور پر پراچین گرنتھوں، سنسکرتی یا کسی ایسے سروے سے متعلق ہوتیں، جہاں پراچین بھارت کو لے کر کسی نئی معلومات کو دوسروں تک پہنچانا ہوتا تھا۔ عام طور پر کسی نئی رپورٹ کو بناتے ہوئے لکھیا سنگھ ایسے طنز بھرے جملے اُس کی طرف ضرور اچھالتے ___ دیکھا۔ تمہارا اسلام یہاں بھی نہیں ہے ___ ارے تمہاری پونچھ عرب میں تھی تو یہاں کیسے نظر آئے گی......'

لکھیا سنگھ سنجیدہ ہو جاتا ___ تمہاری جڑ، تمہاری تہذیبیں یہاں نہیں ملیں گی شیرازی۔ مغلوں کی یادگار بھی کھود ڈالو تو ہماری ہی ہڈیاں اور نشانیاں ملیں گی۔ کیوں؟ ہماری مردہ ہڈیوں پر بھی تم عمارتیں بنانے سے نہیں چوکے......

واپس اپنی میز تک لوٹنے تک لکھیا سنگھ کے زوردار قہقہے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔

آتے جاتے وہ ہر بار اپنی زہریلی گفتگو کا ایک تیر چھوڑ ہی دیتا تھا ___ 'یار شیرازی کیوں پنگا لے رہے ہو ہم سے...... تم لوگ مل کر مندر کیوں نہیں بنوا دیتے......'

'ڈرتے ڈرتے اس نے اپنی زبان کھولی تھی...... پھر تم اور جگہ بھی اپنا حق مانگو گے......'

'تو؟' لکھیا کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوا تھا ___ پھر یکایک وہ قہقہہ لگا کر ہنسا...... ہم اور مانگیں گے تم اور بنوا دینا۔ ہم مانگتے جائیں گے تم بنواتے جانا ___ وہ ایک بار پھر خونخوار چہرے کے ساتھ سامنے ہوتا ___ 'تم کیا سوچتے ہو۔ تم سالے تو باہر سے آئے تھے۔ اور ہم تھے سیدھے سادے لوگ۔ پانی اور پوتر تا کا رشتہ ہی جانتے تھے۔ شدھ بھوجن، شاکاہاری بھوجن، پہننے کو سادا لباس۔ اور اس سے زیادہ کیا تھا ہمارے پاس ___ نہ لڑنا جانتے تھے نہ تمہاری طرح مکاری اور عیاری جانتے تھے۔ یہ سب تو تم نے سکھایا۔ بار بار حملہ کر کے ہمارے مندروں کو لوٹا۔ ہمیں کمزور بنایا ___ اب آہستہ آہستہ سیاست ہم نے بھی سیکھ لی تو ___ ہم وہی کریں گے جو تم نے کیا تھا۔ اہنسا پرمودھرما یا گاندھی جی کے سدھانتوں کا یگ نہیں ہے۔ یہ یگ ہے بدلا لینے کا۔ دھرم کو سر اٹھا کر جینے کا حق دینا ہے، تو دھرم کو راجنیتی سے جوڑنا ہوگا......

●

سچ یہ ہے کہ اسلم شیرازی ہر بار ڈر جاتا تھا ___ ہر بار لکھیا کی آواز اسے خوف میں مبتلا کر دیتی تھی۔ ایک تو پردیس کا معاملہ پھر یہی پردیس جب اپنا دیس بن گیا تو بجائے گھٹنے یا کم ہونے کے، اس کے اندر کے خوف میں بھی مزید اضافہ ہوتا رہا۔ کیونکہ پہلے فاطمہ نہیں آئی تھی۔ پہلے زندگی کا کوئی ساجھی خوشگوار احساس اس کے شامل نہیں تھا۔ شاید ایک زندگی میں دوسرے کو شامل کیے جانے کے احساس کے بعد، مکڑیاں کچھ زیادہ ہی تعداد میں خوف کے جالے بننے کا کام کیا کرتی ہیں۔ مثلاً اس کی کسی بھی بات سے فاطمہ پر کوئی اثر نہ ہو۔ اس کے کسی ری ایکشن سے فاطمہ کی زندگی متاثر نہ ہو۔ اور جو کچھ اس کے پرکھوں، پروجوں نے کیا تھا، اس کا صلہ ایک نہ ایک دن تو ملنا ہی تھا۔ صدیوں کی حکومت، تانا شاہی اور غرور میں ڈوبے ہوئے دن۔ مندروں کو توڑنا، ہندوؤں پر جزیے لگانا، یعنی اتہاس آپ سے پیچھا کہاں چھڑاتا ہے۔ آپ جتنا اتہاس یا تواریخ سے ہاتھ جھٹکنا چاہتے ہیں، تاریخ کے میلے، خون میں ڈوبے ہاتھ آپ کو اتنا ہی جکڑ لیتے ہیں ___ بھاگو مت۔ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے ___ اور پھر غلامی کے اندھیرے دن، جس پر مسلم حکمرانوں

کی کمزوریوں اور عیاشیوں کی مہر لگی ہوئی تھی۔ ذرا آگے بڑھیے تو وبھاجن یا تقسیم کی دردناک کہانی جیسے چیخ چیخ کر اشارہ کرتی ہے کہ دیکھیے یہی مسلمان ہیں، جو بٹوارے کا سبب بنے ___ آنکھیں کھلنے کے بعد سے ہی اسلم شیرازی ملک میں ہونے والے دنگے فساد کے پیچھے، مسلمانوں کے خوفناک اور خونی اتہاس کی کہانیوں سے گزرتا رہا۔ پھر تو جیسے عادت سی پڑ گئی۔ زندگی کے راستے میں جو بھی ملے، زیادہ تر لکھیا سنگھ جیسے لوگ ہی تھے۔ کچھ لوگ یا تو صاف اور بے باک ہوتے تھے۔ اور کچھ پیٹھ پیچھے اتہاس کی کتابوں پر حامی بھرنے والے ___ کل ملا کر اُس کی سمجھ سے زیادہ تر لوگوں کا یقین یہی تھا، کہ اس ملک میں ہر غلط، ناجائز، توڑ پھوڑ اور دہشت گردی کے پیچھے صرف اور صرف مسلمانوں کا ہی قصور رہا ہے۔

نیل کی پیدائش کے دوسرے دن دفتر میں مٹھائیاں بانٹتے ہوئے اچانک ہی لکھیا سنگھ نے اس کے راستہ کو روک دیا تھا ___ کس خوشی میں میاں جی ___ پانچ پیر کی مزار پر دس ہندوؤں کو ٹھوک دیا تم لوگوں نے اس خوشی میں...... یا پھر اپنی جیت کی خوشی میں کہ پولس نے بھی تم لوگوں کا ساتھ دیا ___ '

'' مجھے...... مجھے بچی ہوئی ہے...... '

' کیا ___ ' لکھیا سنگھ بولا۔ ایک دم سے ٹھہر گیا ___ اس کے اندر کا کڑوا 'سینس آف ہیومر' اس کا مذاق اڑانے کے لیے تیار تھا۔

' کھالیتا ہوں میاں جی۔ لڑکا ہوتا تو نہیں کھاتا۔ لڑکی ہے۔ اس لیے کھا لے رہا ہوں۔ ممکن ہے، ہمارے دھرم کا کوئی لڑکا ہی لے جائے...... ہو ہو ہو،، وہ ہنس رہا تھا۔ لیکن سنو شیرازی۔ تمہاری بچی نے آنے کے لیے ٹھیک ٹائم نہیں چنا۔ ارے ہمارے دس جنے مر گئے تھے۔ نہیں مار دیئے گئے تھے۔ تمہارے لوگوں دوارا۔ یہ کوئی شبھ سمئے تھا، پیدا ہونے کے لیے...... '

دھیرے دھیرے لگنے لگا تھا، آرمیا آرٹ سینٹر کا ہر آدمی وہی زبان بولنے لگا ہے، جو لکھیا سنگھ بولتا ہے۔ کئی بار اس کے جی میں آیا کہ باہر ان کی رپورٹ کر کے بھیج دوں۔ صاف صاف لکھ دوں کہ قدیم تہذیب کو بچانے کی صورت میں آپ ہی کے لوگ ہمارے ورتمان اور مشترکہ تہذیبی وراثت کو ختم کرنے میں لگے ہیں۔ پہلے اپنا ورتمان بچا لیجئے۔ قدیم تہذیب کو بچانے کی بات بعد میں سوچئے گا۔ لیکن یہ شکایتیں کس سے کرتا۔ چھ مہینے سال میں باہر سے ڈے لی گیٹ یا ہیڈ کوارٹر سے انکوائری یا دیکھنے کے لیے سی او اور دوسرے ڈائرکٹر وزٹ کیا کرتے۔ وہ بھی یہ

دیکھنے کے لیے کہ فنڈ کا غلط استعمال تو نہیں ہو رہا ہے___ ان سے کچھ بھی بولنے یا کرسی کو 'اونچا' کرنے کی ہمت اس میں نہیں تھی......

●

پیارے قارئین! یقین کریں، آئندہ صفحات میں زندگی اور فنتاسی کے میل سے جو کہانی آپ پڑھیں گے، شاید آپ کو اس پر بالکل یقین نہ آئے۔ لیکن یہ کہانی اسی لمحے پیدا ہوگئی تھی جب لکھیا سنگھ نے اس کا یعنی اسلم شیرازی کا مذاق اڑایا تھا۔ اپنی کرسی پر واپس لوٹنے تک جیسے ہزاروں کی تعداد میں خونی منقار والے گدھ اس کے چاروں طرف چھا چکے تھے۔ جسم میں لرزش تھی___ پاؤں کانپ رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ لکھیا سنگھ کے زہریلے لفظ اُسے ڈس رہے تھے...... 'لڑکا ہوتا تو نہیں کھاتا...... لڑکی ہے اس لیے...... تمہاری بچی نے آنے کے لیے شبھ سمئے نہیں چنا...... یہ کوئی سمئے تھا، پیدا ہونے کا......، اور یہ سچ تھا، فاطمہ کے گھر آجانے کے بعد بھی اُس نے نیل کو پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔ یا اس کے اندر اتنی ہمت ہی نہیں تھی کہ نیل کو دیکھ پانے کی کوشش کرتا۔ کیونکہ ولادت کے وقت اسے دیکھے جانے پر ہی اس پر غشی طاری ہوگئی تھی اور جیسا کہ داستان کے شروع میں، بتایا جا چکا ہے کہ اس نے کہا تھا۔ نیل تو ہے ہی نہیں۔ اور ڈاکٹر نے کہا تھا۔ وہ ہے۔ آپ ذرا دیکھیے تو سہی، وہ بن رہی ہے___ اور قصہ کوتاہ بات یہ تھی کہ وہ سچ مچ بن رہی تھی۔ یعنی جو گوشت پوست کا لوتھڑا نیل کی شکل میں اس کے سامنے تھا، وہ آدھا ادھورا تھا۔ عام پیدا ہونے والے بچے سے اس کا سر کہیں زیادہ چھوٹا تھا۔ منہ کا حصہ ابھی بنا ہی نہیں تھا___ ایک لمحے کو اس کی نگاہ نیل کی طرف چلی گئی اور بڑی مشکل سے وہ اپنی چیخ دبا پانے میں کامیاب ہوا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ کانپ گیا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا، وہ ایک دم اچانک ہوا تھا۔ ننھی نیل کی بند آنکھیں اس سے ٹکرائی تھیں...... اور آپ یقین کریں...... وہ آواز، یقینی طور پر...................... وہ آواز بالکل صاف تھی...... اور وہ آواز یقیناً اس کے لیے تھی...... 'ڈرومت......' -

وہ ادھر اُدھر دیکھنے لگا___

''ادھر اُدھر مت دیکھو پاپا۔ یہ میں ہوں۔ ابھی تم سے بہت باتیں کرنی ہیں۔ مگر خدارا، پہلے یہاں سے مجھے گھر لے چلو۔ اور خدا کے واسطے یہاں ابھی بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ ایسے، حیرانی کے عالم میں چونک چونک کر اپنا مذاق مت اڑواؤ پاپا۔ بس مجھے یہاں سے لے چلنے

کی پہل کرو___'

وہ پسینے پسینے تھا۔

ڈاکٹر کچھ حیرانی کچھ شک سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

'کیا ہوا؟'

'نہیں کچھ نہیں.....'

'آپ کانپ رہے ہیں، آپ کا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا ہے۔'

'نہیں، بس یونہی___'

کھڑکی کے اس پار سورج غروب ہو رہا تھا۔

نیل اور پیرا نڈ کی تاریک دنیا

اس درمیان صرف اتنا ہوا کہ نیل گھر آ گئی۔ فاطمہ جب نیل کو لے کر پہلی بار اپنے بیڈروم میں داخل ہوئی تو اچانک وہ زور سے چلاّ پڑی۔ نیل فاطمہ کی گود میں، کپڑوں سے لپٹی ہوئی، ایک چھوٹی موٹی گٹھری کی شکل میں تھی۔ کمرے میں اڑتی ہوئی ایک چمگادڑ تیزی سے فاطمہ کے کان کے پاس سے اڑتی ہوئی سامنے والی دیوار کے پاس چلی گئی۔ مارے خوف کے فاطمہ نے نیل کو بستر میں ڈال دیا_ دونوں کان بند کر لیے___ چمگادڑ کو کمرے سے باہر جانے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

وہ زور سے چیخا___ کھڑکی کھول دو۔

فاطمہ ابھی تک اپنی آنکھیں اور دونوں کان بند کیے کھڑی تھی۔ بچپن سے چمگادڑ کو لے کر ایک خوف اندر اندر بیٹھ گیا تھا۔ چمگادڑ کان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بچپن میں سنے ہوئے ایسے ہزاروں قصہ تھے___ مگر چمگادڑ کا یہ رقص جلد ہی ختم گیا۔ کھلی کھڑکی سے چمگادڑ کو باہر نکلنے کا موقع مل گیا___ فاطمہ نے اپنی سانسیں برابر کیں۔ پیار سے نیل پر جھک گئی___ نیل سو گئی تھی___ گورا رنگ، سر پر بالوں کا جمگھٹ تھا۔ مگر منہ کا حصہ خالی تھا۔ فاطمہ آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو سہلا رہی تھی۔

'تم نے سنا___ ڈاکٹر نے کہا ہے۔ پلاسٹک سرجری ہو جائے گی۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا___'

اس نے پلٹ کر پیار بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھا___ سب کچھ ٹھیک

ہو جائے گانا......؟

'اس کی آواز میں درد کا اک ایسا راگ چھپا تھا کہ وہ اندر تک لہولہان ہو گیا__

اپنے کمرے میں واپس آنے تک اسلم شیرازی بس اسی خیال سے دوچار رہا کہ کیا اسپتال سے گھر آتے ہوئے سچ مچ اُس نے نیل کی آواز سنی تھی۔ یا اس کا وہم تھا__ نہیں یقیناً اس کے کان بج رہے ہوں گے۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ممکن ہے، خوف کے مسلسل حملے میں، اسے اپنی ہی بات سنائی دی ہو__ اُس دن کئی بار ایسا ہوا جب فاطمہ کسی نہ کسی کام سے اندر باہر کرتی رہی اور وہ تا دیر نیل کے پاس رہا۔ یا تو وہ سوتی رہی۔ یا پھر چیخ چیخ کر رونا شروع کر دیتی۔ لیکن ایک بار بھی اس نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا__

وقت تیزی سے گزرنے لگا تھا۔ ڈاکٹر کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی تھی۔ نیل کو سیزر یا جھٹکے شروع ہو گئے تھے۔ جھٹکے کے دوران اس کا چہرہ بالکل پیلا پڑ جاتا اور اچانک وہ تیز تیز سر کو جھٹکا دینے لگتی۔ ڈاکٹر کے مطابق چھوٹے دماغ والے ایسے بچے، ایب نارمل ہوتے ہیں اور یہ جھٹکے معمولی بات ہیں۔ اور یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر نے پہلے دن سے ہی اس بات کا احساس کرا دیا تھا کہ نیل زیادہ دنوں تک تمہاری دنیا میں رہنے کے لیے نہیں آئی ہے__

فادر کی نظروں میں نیل کی موجودگی کا مقصد صاف تھا۔

'وہ تمہارے خوف کا چہرہ ہے__' فادر اسمتھ سنجیدہ تھے۔ 'اُس سے زیادہ دل مت لگاؤ۔ بس سمجھ لو۔ وہ چند دن کی مہمان ہے، تمہیں اس مہمان کی قدر کرنی ہے__

'وہ مہمان نہیں میری بیٹی ہے فادر......، اُس کے آنسو سارے باندھ توڑ گئے تھے__ ایک بیٹی جس کے بارے میں اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے سپنے دیکھتا تھا۔ ایک بیٹی، جس کے لیے میں سب کچھ بھول گیا تھا......'

'بھولے نہیں تھے۔ تم ایک انجانے خوف کی پرورش کر رہے تھے...... افسوس! ہم اقلیت کے لوگ اس انجانے خوف سے باہر نکل ہی نہیں سکتے۔'

●

ارمینیا آرٹ بلڈنگ کی عمارت میں اس دن ایک بار پھر لکھیا سنگھ نے اس کا نام لے کر پکارا تھا__

قریب جانے پر لکھیا سنجیدہ چہرے کے ساتھ اُس سے مخاطب تھا۔

'کبھی تم نے ایک بات غور کی اسلم شیرازی'

'کون سی بات؟'

'میں نے سمجھا تھا، شاید نہیں پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم خود ہی سمجھ جاؤ گے۔'

میں ابھی بھی نہیں سمجھا ___

لکھیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اچھا بتاؤ، یہاں تمہاری ذات کے کتنے لوگ ہیں؟

'اکیلا میں ہوں۔'

'یہی تو پوچھ رہا ہوں۔' لکھیا ہنس رہا تھا ___ اکیلے کیوں ہو یہاں۔ یہاں سے چلے کیوں نہیں جاتے۔ ذرا سوچو اگر یہاں تم نہیں ہوتے، تو یہاں ہمارا ایک آدمی ہوتا ___ ہمارا یعنی ہمارے دھرم کا...... ایک تم نے ہماری پوری کیمسٹری بگاڑ دی ہے۔' اسے گہرے سناٹے میں چھوڑ کر لکھیا تو چلا گیا لیکن اسلم شیرازی کو اس گہری دھندیا سناٹے سے باہر نکلنے میں کافی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کے جی میں آیا، لکھیا سے کہے۔ اپنے دھرم کے آدمی ہونے پر بھی تمہارا جی نہیں بھرے گا لکھیا سنگھ۔ پھر تم جات برادری لے آؤ گے۔ گوتر کی باتیں کرو گے۔ اس پر بھی بس نہیں چلے گا تو چھیتر یتا اور ونش واد کی دہائیاں دو گے۔ بات یہ ہے کہ تم لوگوں کا ہاضمہ خراب ہے ___ لیکن اسلم شیرازی کی اپنی کمزوریاں اس پر حاوی تھیں۔ وہی کمزوریاں، جس کے ساتھ وہ بڑا ہوا تھا۔ جس کے ساتھ اُس نے پاؤں پاؤں چلنا شروع کیا تھا۔ اسکول سے کالج اور کالج سے اپنی ذمے داریوں کی دنیا میں آنے تک انہی کمزوریوں نے اس کی پوری زندگی کو ایک ڈراؤنے خواب میں تبدیل کر دیا تھا۔

اور اب اس ڈراؤنے خواب کی شکل میں نیل سامنے تھی......

وہ چاہتا تھا کہ نیل آسمان میں اڑتی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے ڈینے ہوتے......

مگر ___ نیل کے ڈینے ٹوٹے ہوئے تھے......

نیل کی سب کچھ اس کی آنکھیں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں، جن آنکھوں میں وہ کوئی بھی سپنا نہیں رکھ سکتا تھا۔

چھوٹے چھوٹے ہاتھ، جن کی انگلیاں مضبوطی سے تھام کر وہ انہیں چلنا نہیں سکھا سکتا تھا......

اور ایک آدھا ادھورا منہ، ایک آدھی ادھوری سی نیل...... اور بڑھتا ہوا وقت کا قافلہ جیسے ہر لمحہ اسے وارننگ دینے کے لیے موجود ہوتا...... نیل جا رہی ہے۔ نیل کی زندگی سے ایک دن اور کم ہو گیا۔ بدنصیبی کی کوئی بھی کہانی، شاید اس سے زیادہ اذیت ناک نہیں ہو سکتی کہ وہ ہر لمحہ نیل کو خود سے دور جاتا ہوا دیکھ رہا تھا اور بے بس تھا۔

حقیقت یہ ہے، کہ وہ نیل کو کسی پیرامڈ میں لے جا کر چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ عین ممکن ہے، آپ اسے کوری فنتاسی، ایک بچکانہ خیال، ایک واہیات اور محض جذباتی ہونے کی دلیل کے ساتھ خارج کر دیں...... مگر یہ بھی سچ ہے کہ اُنہی دنوں اُسے خواب میں پیرامڈ نظر آنے لگے تھے...... ہزاروں کی تعداد میں...... اسلم شیرازی کو اس بات کا احساس تھا کہ ایک دن سونے چاندی اور زندگی کی تمام تر آسائشوں کے ساتھ دفن، پیرامڈ میں آرام کرتے یہ مردے ضرور جاگتے ہوں گے ___ یا ضرور جاگیں۔ پھر آواز دیں گے...... جیسے اس کی نیل...... وہ اسے چپکے سے کسی پیرامڈ میں رکھ آئے...... کیا خبر، چپکے سے نیل جاگ جائے...... چپکے سے اُسے آواز لگائے...... چپکے سے اٹھ کر چلنے کی تیاری کرے...... چپکے سے اٹھ کر ہوا میں تیرتی ہوئی گود میں آ جائے...... اس کی بانہوں میں سما جائے......

پیارے قارئین...... یہاں آپ کو ذرا سا ٹھہرنا پڑے گا۔ کیونکہ جیسا آپ کو شروع میں بتایا گیا۔ یہ کہانی وہاں سے شروع نہیں ہو سکتی، جہاں سے آپ چاہتے ہیں۔ اور یہ اُنہی دنوں کا واقعہ ہے جب عالمی نقشہ پر دہشت پسندی کے ایک کے بعد ایک کئی حادثے نے مسلمانوں کو دہشت پسند قرار دے دیا گیا تھا۔ کشمیر سے کنیا کماری اور امریکہ سے برطانیہ ہر جگہ داڑھی والا مسلمان شک کے دائرے میں تھا۔ اور یہاں ڈاکٹروں کے مطابق نیل کے سیزر اس قدر بڑھ چکے تھے کہ اب اس کی زندگی کے سارے راستے مسدود ہو گئے تھے۔ فاطمہ کی آنکھیں ایک ایسی جھیل بن چکی تھیں، جس کا سارا پانی سوکھ چکا ہو ___ نیل کی چیخیں اب اتنی زیادہ دہشت میں مبتلا کرنے والی ہوتیں کہ ربّ سے مانگی جانے والی دعاؤں میں اب اس کے لیے موت کی آرزو ہوتی......

اور یقیناً وہ ایک سرد ترین رات تھی، جب سرد کہاسے نے پورے شہر پر اپنا سایہ ڈال رکھا تھا۔ کمرے میں مرکری روشنی تھی۔ مسلسل کرب کی کیفیت سے گزرتے ہوئے یکایک اسلم شیرازی کی نظر نیل پر چلی گئی۔ اور وہ یکایک چونک پڑا۔

نیل کی روشن چمکتی آنکھیں اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں...... اور یقیناً وہ اس کی

آواز سن سکتا تھا، محسوس کرسکتا تھا۔

'تم اتنا ڈرتے کیوں ہو...... ہاں تمہی سے پوچھ رہا ہوں پاپا...... کیوں ڈرتے ہو......'

'میں......'

'یہاں اور کون ہے۔ تمہارے اور ممی کے سوا...... مجھے تمہارا ڈرنا پسند نہیں ہے......'

'پسند نہیں ہے؟'

'اور کیا...... تم ڈر ڈر کر بڑے ہوئے۔ ڈر ڈر کر زندگی شروع کی...... ڈر ڈر کر مجھے پیدا کیا...... اور دیکھو تو......'

'کیا دیکھوں......'

'مجھے اور کسے۔ تم نے اپنا ڈر ممی کو دے دیا۔ ممی میرے روپ میں اس ڈر کی پرورش کرتی رہیں۔ اور دیکھو تو...... میں تمہاری زندگی میں آئی بھی اور نہیں بھی آئی۔ کیا ملا تمہیں ڈرنے سے ___ اور اب میں جارہی ہوں_ لیکن میں تمہیں خوفزدہ نہیں دیکھ سکتی پاپا۔ سمجھ لو، میں تمہاری خوف کی شکل ہوں۔ اور اب میں جارہی ہوں، تو تمہیں خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے......'

نیل کی آنکھوں میں چمک تھی...... ایسی چمک جو اسلم شیرازی نے اپنی اب تک کی زندگی میں شاید ہی کبھی دیکھی یا محسوس کی ہو......

'اور جان لو پاپا...... میں جارہی ہوں...... میں کبھی لوٹ کر تمہاری دنیا میں واپس نہیں آؤں گی۔ مگر مجھے یاد کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے پاپا...... تم ڈرو گے نہیں۔ کیوں کہ ڈرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے تمہارے پاس......'

نیل نے مسکراتے ہوئے اُس کی طرف دیکھا اور پلٹ کر آنکھیں بند کرلیں ___ جیسے اب اس کی ضرورت نہیں رہ گئی ہو......

جیسے اس نے اپنا کام مکمل کرلیا ہو......

اور آخر میں

کہتے ہیں، دنیا کے آٹھ عجوبوں میں سے ایک پیرامڈ تک پہنچنا کوئی سہل کام نہیں۔ جہاں روشنی اور ہوا کا گزر نہیں۔ ایک نہ ختم ہونے والی اندھیری سرنگ ___ نہ ختم ہونے والی سیڑھیوں کی قطار اور بھول بھلیاں ___ ایک پر اسرار دنیا اور پتھروں سے پھوٹتی ہوئی خاموشی ___ ایک

بھیانک فنتاسی اور خوف کے گہرے کہرے سے باہر نکلنے تک، گو یہ کافی مشکل اور دشوار کن مرحلہ تھا، لیکن اسلم شیرازی نے اس دھند اور تاریکی میں زندگی کی ایک موہوم سی کرن ڈھونڈ لی تھی۔

نیل جا چکی تھی ___

نیل کے جانے کا بھیانک سناٹا زندگی کے راستہ میں حائل ضرور تھا، تاہم اسی سناٹے سے اسلم شیرازی اپنی زندگی کا نیا باب شروع کرنا چاہتا تھا۔ اور جیسا کہ اس دن آرمینیا آرٹ سینٹر کی بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اچانک ہی اس نے لکھیا سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اس سے پہلے کہ لکھیا سنگھ حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا، اسلم شیرازی نے برسوں سے اندر دبے ہوئے لاوے کو ایک ہی جھٹکے میں نکال دیا۔

'سنو لکھیا سنگھ۔ برسوں سے تم کہتے رہے۔ میں سنتا رہا۔ لیکن کچھ باتیں ایسی ہیں جو تمہیں بتانا ضروری ہے۔'

مثلاً؟ لکھیا سنگھ کی آنکھوں کا رنگ بدلا تھا۔

'مثلاً یہ کہ اب مجھے اپنے آپ کو اور تمہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ جن لوگوں نے ملک کا بٹوارہ کرایا۔ وہ میں نہیں تھا۔ اس لیے اس حادثے کی سزا تم کم از کم مجھے نہیں دے سکتے۔ جس نے بابری مسجد بنایا، وہ بھی میں نہیں تھا، جس نے گودھرا کیا، وہ بھی میں نہیں تھا ___ دنیا کے ایسے کسی بھی حادثے میں میری شرکت نہیں رہی ہے لکھیا سنگھ، تمہاری رہی ہو تو میں نہیں جانتا ___ اس لیے جو کام میں نے کیے ہی نہیں، تم بار بار اس کام کے لیے مجھے ذلیل کرنا چاہو گے تو میں برداشت نہیں کروں گا۔ اور ہاں، کیمسٹری میری موجودگی سے نہیں تمہاری موجودگی سے خراب ہوئی ہے...... اگر اس سینٹر سے کسی ایک آدمی کو جانا ہوگا تو وہ تم ہو گے لکھیا سنگھ......'

گھر واپس آنے پر آج پہلی بار وہ محلے کے سونا حلوائی کی دکان سے چھنی ہوئی تازہ جلیبیاں لے کر گھر پہنچا تھا۔ یقینی طور پر یہ فاطمہ کے لیے چونکنے کی بات تھی......

'تمہیں تو آج تک کوئی بھی اچھی بری چیز گھر لانے کی توفیق نہیں ہوئی ___ یہ جلیبی لے کر کیسے آ گئے ___'

'پتہ نہیں۔'

اس کی آواز جیسے پراسرار پیرامڈ کی تنگ و تاریک دنیا میں گم ہو گئی تھی ___

●❖●

بے حد نفرتوں کے دنوں میں

(26/11 کے نام—)

(**نوٹ**: خدا کو حاضر و ناظر جان کر، کہ جو کچھ یہاں بیان کیا جا رہا ہے، اس کا ایک ایک لفظ سچ پر مبنی ہے۔ ممکن ہے پہلی بار میں آپ کو یقین نہ آئے یا ممکن ہے، سارے واقعات، جو اس کہانی میں پیش آئے ہیں، آپ کو بے حد ڈرامائی نظر آئیں— اور آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں— کہ یہ کہانی تو بہت فلمی ہے دوست، لیکن اس کے باوجود— یقین کیجئے، اس کہانی کا جھوٹ سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ یا پھر...... جیسے یہ کہا جائے کہ دھندلے دھندلے سے بادلوں سے ڈھکے چاند کے درمیان ایک بڑھیا رہتی ہے...... یا پھر — جانے دیجئے — اگر آپ 9/11 یا 26/11 جیسے ناقابل فراموش حادثوں پر، دل پر پتھر رکھتے ہوئے یقین کرسکتے ہیں تو ان واقعات پر بھی یقین کیجئے جو بے حد ڈرامائی انداز یا ماحول میں اس کہانی میں واقع ہوئے ہیں......)

''بے حد نفرت کرنے والے کیڑے بھی۔
یہیں کہیں آس پاس ہوتے ہیں۔
جہاں محبت کی لہریں اپنی پوری رفتار میں بہہ رہی ہوتی ہیں۔''

●

شاید کوئی دکھ اتنا گہرا نہیں ہوسکتا، جیسا کہ میں اس وقت محسوس کر رہا ہوں۔ آنکھوں کے آگے دھند کی چادر میں غیر واضح مکالمے یا آہٹیں جمع ہو رہی ہیں۔ لیکن جیسا، بھیانک سردی کے دنوں میں اکثر ہوتا ہے، آپ کے کان سن...... سے ہو جاتے ہیں۔ پھر چہرے پر صرف برف کی ایک گیلی ٹھنڈی چادر رہ جاتی ہے، جو دماغ سے لے کر آپ کے سارے جسم کو سلا دیتی ہے۔ اس کنکنپا دینے والی سردی میں نفرت کے ان مکالموں کو سن رہا ہوں، جو موت یا سنامی سے زیادہ بے رحم ہیں میرے لیے— جہاں تیزی سے پھیلتی جنگل کی آگ کی طرح صرف وہ شور رہ گئے ہیں جو اس وقت بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں— تیز تیز ڈرم بجنے کی آوازوں کے درمیان خنزیر کے گوشت بھوننے کی بدبو پھیل رہی ہے، اور تہذیب و تمدن سے بے نیاز انسانوں کے ہڑدنگ......

لا......لا......لا...... ہے...... ہو...... ہو...... ہو...... ڈرم...... ڈرم......

شاید انسان ہونے کے احساس سے جانور ہونے کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں— اندر ہی کہیں باہر نکلنے کی تیاری میں بیٹھا ہوتا ہے ایک جنگلی جانور، جو ایک ہی جھٹکے میں محبت کے احساس کو پنجے سے مار کر، باہر آ کر ٹھٹھا کر ہنستا ہے— صرف ایک جھٹکے میں— جیسے ذبح کیے ہوئے جانور ہوتے ہیں...... یا عام طور پر ہماری فلموں کے ایسے اداکار جو مینٹل ڈس آرڈر یا ملٹی پل ڈس آرڈر کے شکار ہو کر ایک ہی وقت میں دلکش اور بے حد بدصورت جنگلی شکل دکھا کر ناظرین سے واہ واہی لوٹ لیے جاتے ہیں......

وہ ہنس رہے ہیں۔ قہقہہ لگا رہے ہیں۔ انہیں ایک منچ دیا گیا ہے۔ کسی بھی بڑے ٹی وی چینل کا ایک بڑا منچ— وہ ناچ رہے ہیں۔ گا رہے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں ہمارا دل بہلا رہے ہیں— اینکر سے لے کر معزز ججوں کو بھی وہ پسند ہیں۔ وہ مسلسل ہنسا رہے ہیں۔ پھر وہ ہمارے ہی خاندان کے ممبر ہو جاتے ہیں کہ ہم ان کا انتظار کرنے لگتے ہیں— ایک عام خاندان

کے ممبر کی طرح، جہاں نہ دشمنی ہے نہ دیواریں — نہ سرحد، نہ باڑ کے کنٹیلے تار۔ جیسے منظر بدلتا ہے۔ وہ اچانک کنٹیلے تار کے، اس پار کے دشمن بن جاتے ہیں — ایک بھیانک دشمن۔ کسی بجرنگ دل، کسی سنگھ کا شخص اچانک سیٹ پر آتا ہے اور اس کے گلے پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ آج وہ ناچ نہیں رہا ہے۔ ہنسا نہیں رہا ہے، رو نہیں رہا ہے، آج وہ سارا رول بھول کر ایک عام آدمی یا سہما ہوا جانور بن گیا ہے — جہاں اس پر وہی، اسے عزت سے نوازنے والے چیخ رہے ہیں...... 'یہ ہمارے روزگار تک چھین کر لے جاتے ہیں......'

اداکار نہیں، صرف ایک غیر محفوظ شخص رہ گیا ہے — جنگ کی پیشن گوئیوں کے درمیان — جنگلوں سے گزرتی فوجی ٹکڑیاں — آسمان پر منڈراتے ہیلی کاپٹر — سیاستدانوں کے بیان اور جنگ کے شعلے......

میں شاید اس گھنے کہرے یا جنوری کی اس کنکپا دینے والی بھیانک سردی کا ایک حصہ بن گیا ہوں۔ اور جیسا کہ بچپن کے کسی لمحے بابو جی کی آنکھوں میں اس جنگ کے شعلوں کو پڑھنے کی ہمت کی تھی میں نے......

''جنگ کبھی نہیں ختم ہوتی...... جاری رہتی ہے......''

''لیکن کیسے......؟''

''بس یہ ہماری بھول ہوتی ہے، جو سمجھتے ہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہم خیریت سے ہیں۔ لیکن دراصل ایسا نہیں ہوتا......''

''پھر۔''

''ایک جنگ سے نکل کر ہم آہستہ آہستہ صفر میں دوسرے بڑے اور بھیانک جنگ کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔ چین کی جنگ ختم ہوئی کیا — ؟ 62 کو گزرے تو جیسے ایک صدی گزر گئی۔ لیکن کیا چین سے ہماری نفرت مٹی — ؟ یہ نفرت ہی جنگ ہے۔ جو تھوڑی دیر کے لیے جنگ پر روک یا سیز فائر لگا دیتی ہے۔ لیکن جنگ نہ ہونے، نہ دکھنے پر بھی جاری رہتی ہے — پاکستان سے جنگ ختم ہوئی کیا......؟ بابو جی اس وقت اپنے 'سنگھی' لہجے میں بول رہے تھے — ''وہ یہاں موجود ہے۔ یہاں...... وہ اپنے دل کے پاس اشارہ کر رہے تھے — 'اپنی ہر لمحے تیز ہوتی نفرتوں میں — جبکہ یہ جنگ تو 66 یا 71 میں ہی ختم ہو گئی تھی۔ لیکن کیا اصل میں ختم ہوئی......؟ جنگ ایک بار شروع ہو جائے تو ختم نہیں ہوتی۔ وہ یہیں کہیں رہ جاتی ہے۔ کبھی ہمارے بدبودار کپڑوں میں

کبھی پورے جسم میں......''

جیسے میزائلوں کا رقص جاری ہو......!
جیسے جنگی ٹینک، بارودی شعلے اگل رہے ہوں۔ آسمان پر دور تک دھوئیں کی چادر......
آہستہ آہستہ اس نہ ختم ہونے والے دھوئیں میں ایک سہما سا معصوم چہرہ ابھرتا ہے۔
'جو پوچھوں سچ بتانا...... بتاؤ گے نا......؟'
'ہاں...... پہلے پوچھو تو......'
'دیکھو جھوٹ بالکل نہیں......'
'ارے بابا...... بکو تو......'
'اچھا سوچنے دو...... چلو سوچ لیا......' اس کی بے حد حسین آنکھوں میں، پیار کی گہرائی کے ساتھ ایک خوف بھی شامل تھا۔
'دوسروں کی طرح کہیں تم بھی ہم سے نفرت تو نہیں کرتے......؟'
جیسے پورے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ایک لمحہ کو لگا، جنگ کے دھماکے کو میرے چہرے پر آرام سے پڑھا جا سکتا ہے۔ یقینی طور پر دوسری طرف 'کیمرے میں، میرے چہرے پر آئی کنکپکپی کو وہ شاید پڑھ رہی تھی......
'سچ بتانا...... جھوٹ بالکل نہیں......'
'ہاں تم سے پہلے نفرت کرتا تھا......'
ایک لمحہ کو محسوس ہوا، جیسے اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہو — دوسرے ہی لمحے وہ اپنے خوفزدہ چہرے پر پیار کے بے شمار رنگ اور پھولوں کی ہزار خوشبوؤں کا تحفہ لے کر موجود تھی —
'مجھ سے...... یا میرے ملک سے......؟'
'تمہارے ملک سے......'
اب میری باری تھی — جیسے اندر مندر کی گھنٹیاں یا شنکھ پھونکنے کی جگہ مسلسل پھٹنے والے آر ڈی ایکس یا بم کے دھماکے جاگ گئے ہوں —
'شائستہ، اگر یہی سوال میں تم سے پوچھوں تو......؟'
'شاید...... میں نفرت کر سکتی تھی...... تمہارے یہاں ایک چوہا بھی مرتا ہے تو الزام

میرے لوگوں پر آتا ہے — مگر اپنی کہوں تو میں نفرت نہیں کر سکی......'

'لیکن کیوں؟'

'تاریخ کی کتابوں نے تمہارے ملک کے لیے اتنی نفرتیں لکھیں کہ یہ نفرت آہستہ آہستہ پیار میں بدل گئی۔ پھر تم مل گئے۔'

کمرے میں گھنے کہرے کے بادل چھا گئے ہیں۔ میں اس گھنے کہرے سے باہر بھی نکلنا چاہوں تو شاید یہ ممکن نہیں ہے۔ کیا سیاست صرف جنگ کے آر یا جنگ کے پار دیکھتی ہے۔ یعنی کہیں کوئی آپشن نہیں — جنگ اکیلا آپشن ہے — شاید ہماری حفاظت ہماری زندگی کے لیے — سب جیسے اندھیرے میں ایک بھیانک تاریخ لکھے جانے کے لیے......شاید اسی لیے کبھی جھوٹی تاریخ سے پیار نہیں ہو سکا مجھے — شاید اسی لیے ایک بار اس نے بے حد ناراضگی سے کہا تھا۔

'تاریخ میں ہم صرف دو، نفرت کرنے والے ملک ہیں جن کے درمیان کبھی بھی امن کی کوششیں ممکن نہیں۔'

ایک کھلکھلاہٹ بھری آواز ابھری تھی......لیکن کتنا عجیب اتفاق ہے۔ دیکھو نا۔ میرا ایک بھائی یہاں کی آرمی میں ہے۔ جانتے ہو، وہ ہم پر اپنا غصہ کیسے نکالتا ہے — 'ایک ہم ہیں جو لڑ رہے ہیں — حملے کے منصوبے بناتے ہیں — اور تم لوگ...... جب دیکھو ان کے ٹی وی سیریل سے چپکے رہتے ہو۔'

وہ ہنسی تو اسی کے سفید دانت موتیوں کی طرح سامنے آ گئے۔

'تمہارے ساس بہو کے ناٹک...... ہمارے یہاں سڑکیں سنسان ہو جاتی ہیں — ٹی وی کو گھیر کر پورا خاندان بیٹھ جاتا ہے۔ اف تمہارے یہاں کی فلمیں...... مجھے تو خان برگیڈ سے زیادہ اچھا لگتا ہے تمہارا اکشے کمار — مجھے ساڑیاں بے حد پسند ہیں۔ بندی بھی......ایک بات بتاؤں...... پائل اور سندور بھی مجھے بے حد پسند ہے......دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر ایک بھیانک سناٹا تھا — لیکن میرے مذہب میں منع ہے......'وہ پوچھ رہی تھی......'' یہ مذہب بنے ہی کیوں ہیں؟ مذہب نہیں ہوتے تو — ؟ تقسیم نہیں ہوتی نا......؟ تقسیم نہیں ہوتی تو......؟'

وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا کر جیسے نیلے آسمان سے گرتی بارش کی بوندوں کو اپنی مٹھیوں میں بھر رہی تھی......

•

مذہب نہیں ہوتے تو؟ بٹوارا نہیں ہوتا تو؟

شاید سوالوں کے بھنور سے ہم باہر ہی نہیں نکل پاتے۔ ایک کے بعد دوسرا سوال...... نفرت نہ ہوتی تو......؟ بابری مسجد یا گودھرا نہ ہوتا تو؟ کشمیر نہ ہوتا تو؟ رنگ نسل بھید نہ ہوتے تو......؟ جیسے خیالوں کی تنگ گلی میں چلتے چلتے میرے پاؤں تھک جاتے ہیں— آنکھیں کھولتے ہی جیسے نفرت کے رنگوں سے ہم خود ہی جڑنے لگتے ہیں...... ارے...... وہ نہاتے نہیں...... گئو ماس کھاتے ہیں۔ گھر میں تلواریں رکھتے ہیں...... کھانے میں تھوک دیتے ہیں۔ ملیچھ...... چار چار شادیاں کرتے ہیں۔ بہنوں میں بھی شادی ہو جاتی ہے...... ارے چچیری، خلیری، ممیری کیا بہنیں نہیں ہوتیں؟ وہ بچپن سے ہی دہشت کی شمشیریں اٹھائے بڑے ہو جاتے ہیں...... ہمارے مندروں کو توڑا...... نادر شاہ سے اورنگ زیب تک ایک سے بڑھ کر ایک گھنونی کہانیاں— جیسے بچپن سے پڑھائی نہیں، ذہن میں بھر دی گئی تھیں۔ کافر...... ہم سب کافر ہیں ان کے لیے— جنہیں مار دیا جانا ہی مذہب ہے۔ ان کے مذہب میں ایک ہی آپشن ہے— سالے مذہب کے نام پر جانوروں کی قربانی دیتے دیتے ہمیں بھی قربانی کا بکرا سمجھ بیٹھے ہیں— مذہبی کتابوں سے ملک کے سیاسی بٹوارے تک وہی ایک نفرت کا باب اگر چاروں طرف سے آپ کو گھیرتا ہو تو......؟ بچپن سے رٹائے گئے لفظ، جوان ہوتے ہی نفرت کے شور اور بے ہنگم آوازوں میں بدل جاتے ہیں— ڈم...... ڈم...... ڈم...... جیسے ہزاروں کی تعداد میں آدم خور جمع ہوں۔ سالوں نے پاکستان بنا لیا، اب یہاں بھی پاکستان بنانے کا سپنا دیکھنے لگے...... آپس میں مرو سالو...... ایران...... افغانستان...... چیچنیا...... فلسطین سے لے کر عراق اور افغانستان کی کہانیوں میں عام چہرے والا مسلمان بھی اسامہ بن لادن ہی نظر آتا ہے۔ ہاں، پھر گھر سے باہر نکلتے ہی معصوم چہرے والے مسلم دوستوں میں شاید یہ نفرت کے رنگ ایکدم سے ایسے چھپ جاتے تھے جیسے بادلوں نے سورج کو اپنے محاصرے میں لے لیا ہو...... لیکن کب تک...... پھر کوئی فساد کوئی فرقہ وارانہ فساد— کشمیر سے کنیا کماری تک 'آتنک واد' اور پاکستان کی آتنک۔ فیکٹری...... جہاں مساد سے طالبان اور لشکر طیبہ تک اپنے خونی بیانوں اور فتووں میں عام مسلمانوں سے ہمیں ایک دوری بنائے رکھنے کی صلاح دیتے تھے— اکشر دھام پر حملے سے سنسد بھون کے گلیاروں تک آنکھوں میں ہر ایک

مسلم چہرے کی ایک درندہ صفت تصویر ہی آنکھوں میں باقی رہتی تھی — مغلوں کا حملہ، حکومت، ہندوؤں سے جزیہ لینے سے لے کر نئے اسلامی دہشت گرد مجاہدین تک — ایسے میں کسی بھی مسلم رہنما یا پاکستان کے ذریعے کیا گیا کوئی بھی تبصرہ ان زہر آلود تیروں کو کمان سے نکالنے کی تیاری کر چکا ہوتا تھا —

اور بے حد سادگی کے ساتھ، مجھے یہ تسلیم کرنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں کہ میں ہی سوچتا تھا اور شاید اسی لیے میں مسلمانوں سے کبھی محبت نہیں کر پایا۔ وہ میرے اندر نفرت بھرے رنگوں کا ایک حصہ ہی رہے۔ لیکن شاید تب تک، جب تک شائستہ نہیں ملی تھی — شائستہ فہیم خاں، پاکستان کی دلّی کہے جانے والے لاہور کے میر قاسم محلے میں رہنے والی — اور جیسا کہ میں نے اسے بتایا، کہ ایک ایسا ہی میر قاسم جان محلہ میری دلّی میں ہے تو اس کی آنکھیں بھی، کبوتروں کے محلے میں...... اڑتے کبوتروں کے درمیان 'دلّی' فلم کی اداکارہ کی طرح مٹک...... مٹک جیسے گیتوں پر تھرکنے لگی تھیں — ٹھیک ویسے ہی جیسے سونم کپور اس گیت میں مردوں کی طرح تال ٹھوکتی، کمر لچکاتی، سر پر کبوتر رکھ کر رقص کرتی اپنی بھرپور اداؤں میں ایک بے حد المست سی لہر بن گئی تھی — ٹھیک یہی گیت سرحد پار بھی گایا جا رہا تھا — اداکارائیں بدل گئی تھیں۔ وہاں بھی کبوتروں کے جھنڈ تھے۔ گلی قاسم جان کی طرح میر قاسم محلے کی تنگ گلیاں تھیں — آدمیوں کے شور وغل سے بھرا بازار تھا...... اور شاید سب کچھ وہی تھا جو ہم دلّی۔ دلّی چھ کی گلیوں میں تلاش کرتے تھے۔ مگر تعجب تھا، شائستہ فہیم خاں سے ملنے سے پہلے تک پاکستان صرف ایک ملک تھا میرے لیے — ایک دشمن ملک — جہاں ہمارے ملک کو تباہ کرنے کے لیے دہشت گرد یا فدائین تیار کئے جاتے تھے — پھر دہشت کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ہمارے ملک میں انہیں اتار دیا جاتا تھا۔ کشمیر سے مالیگاؤں، دلّی سے راجستھان، ایک خونی، کبھی نہ ختم ہونے والی عبارت لکھنے کے لیے......

لیکن شاید ایسی ہی ایک عبارت محبت کے اندھے یقین کی ہوتی ہے، جہاں دماغ نہیں۔ صرف دل کی سلطنت چلتی ہے۔ ہم عام طور پر شاید ایک دوسرے کے بارے میں صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا میڈیا، اور سیاست ہمیں بتاتی ہے — نیٹ پر چیٹنگ کرتے ہوئے ہم دیس بدیس کے کتنے ہی لوگوں کو قریب سے جان پاتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس بے حد اندھیرے وقت میں نیٹ کا ساتھ مجھے غنیمت لگتا تھا — اور بہت سے اپنے دوسرے دوستوں کی طرح میرے اندر

بھی پاکستانی لڑکیوں کی قربت پانے کی ایک چاہت ظاہر ہو چکی تھی — لیکن کیا وہ بات کریں گی؟ وہ بھی کسی ہندوستانی سے؟ کسی ہندو لڑکے سے؟ ایک بابری کے نام پر جہاں ہزاروں مندر منہدم کر دیئے جاتے ہوں۔ پھر اسلامی جمہوریت کے نظام میں جہاں پردے اور بندشوں کی کہانیاں ہم آئے دن کسی نہ کسی بہانے سنتے رہتے تھے۔

نیٹ روشن تھا۔ پاکستان پر کلیک کرتے ہی بہت سارے موجود ناموں میں ایک نام شائستہ کا بھی تھا — آہستہ سے میں نے اس نام پر کلیک کیا۔ میسیج باکس میں آہستہ سے لکھا — ایم 28 انڈیا...... پھر شروع ہوا انتظار کا لمحہ......

میں نے پھر میسیج ٹائپ کیا...... آر یو دیئر......

دوسری طرف سے جواب آیا — ناٹ انٹرسٹیڈ۔

مجھے تعجب نہیں ہوا۔ شاید اب میں لڑنے کے موڈ میں تھا...... میں نے ٹائپ کیا...... بٹ وھائی...... کیونکہ میں انڈین ہوں —؟

'ہاں......'

'انڈین ہونا کوئی جرم ہے؟'

'کیونکہ تم لوگ گندے ہو......'

'ہم گندے ہیں یا تم لوگ......؟'

'تم لوگ۔ ہمارے بارے میں افواہیں پھیلاتے ہو۔ الزام لگاتے ہو......'

'ہم الزام نہیں لگاتے۔ یہ تم ہو، جو ہر بار ہم سے صرف جنگ کی خواہش رکھتے ہو......'

اب میسیج کا سلسلہ چل پڑا تھا — مجھے احساس تھا، اب اس کے چہرے پر بل پڑ گئے ہوں گے...... اس بار میسیج تاخیر سے آیا۔

پوچھا گیا — 'تمہارا نام؟'

'راجندر راٹھور......'

'ہندو ہو......؟'

اچانک میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ناچ گئی — 'میں نے تو نہیں پوچھا کہ تم مسلمان ہو؟'

'ساری......'

'ساری کی ضرورت نہیں۔ لیکن کیا ہندو ہونا جرم ہے؟'

'نہیں؟'

شاید باتیں کرتے ہوئے، ہم ایک بے حد گھنونا ماضی بھول کر مہذب اور لبرل بننے کی کوشش کرتے ہیں......

میں نے ٹائپ کیا— 'تم مسلمان اس لیے ہونا کہ مسلمان کے گھر پیدا ہوئی......'

'ہاں۔ جیسے تم ہندو اس لیے کہ ہندو کے گھر پیدا ہوئے......'

'تم پاکستان میں جنمی۔ اس لیے نفرت کے ماحول میں یہاں کے دروازے تمہارے لیے بند......'

'جیسے تم ہندوستان میں— دشمنی کی سوغات لے کر آؤ گے تو ہم ٹینک کا رخ تمہاری جانب موڑ دیں گے......'

'اتنی نفرت کیوں ہے؟'

'نہیں جانتی......'

'کیا سب سیاست ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے۔'

'شاید نہیں۔ کیونکہ ہم اس سیاست کے شکار، نوالے ہوتے ہیں— جنہیں نگلتے ہوئے سیاستداں ہمارے بارے میں نہیں سوچتے......'

'اچھا تمہارا نام کیا ہے؟'

'شائستہ فہیم خاں۔'

'شائستہ......اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟'

'پولائٹ......ہمبل......جس کے وجود میں ایک سلیقہ ہو......'

'لیکن تم ایسی دکھتی تو نہیں......'

'شٹ اپ......' لیکن ساتھ ہی اس نے جلدی سے ٹائپ کیا تھا— 'مجھے ہندو اچھے لگتے ہیں۔ بہت دنوں سے کسی ہندو سے بات کرنے کی خواہش تھی......'

شاید سرحد کے اس پار ممکن ہے یہ ایک عام سی خواہش ہو، جیسے یہاں کے ماحول میں ایسی ہی ایک خواہش میرے اندر بھی جاگی تھی......

'تم لوگ اتنے گندے کیوں رہتے ہو— بس...... ذرا سے پانی سے نہا لیا اور وہ باریک سا دھاگا......'

'جینؤ......'

'ہاں۔ وہی، باندھ لیا— دھاگا باندھنے سے آدمی کہیں پاک ہوجاتا ہے......؟'

میں نے اپنے سوالوں کو روک لیا تھا۔ اس لیے کہ میں اچانک چونک گیا تھا۔ میں بھی پوچھ سکتا تھا، اچھا جینؤ باندھ کر ہم پاک نہیں ہوسکتے...... مگر جو تم لوگ نماز سے پہلے کرتے ہو...... ذرا سا پانی......؟ ماضی کی کہانیوں میں مسلمانوں کو گندہ اور ملیچھ کہے جانے والے کتنے ہی واقعات گھوم گئے...... تو وہاں بھی ایسی ہی ایک رائے ہمارے بارے میں بھی ہے...... وہاں بھی ایک میر قاسم جان گلی ہے...... 'سونم' کی طرح اپنی شرارتی ادائیں دکھاتی ایک اپسرا سرحد پار بھی ہے— جو ادھر ہے۔ وہی کچھ اُدھر ہے۔ امن سے دہشت، اور خواہشات سے سیاست تک۔

شاید اس دن پہلی ملاقات میں ہی ہم دوست بن گئے تھے— بے حد اچھے دوست— اور دوستی کے لیے سرحدیں، ذات پات، مذہب شاید ساری چیزیں بے معنی ہوجاتی ہیں۔ اس دن شائستہ فہیم خان دیر تک ہندوستان، تاج محل، قطب مینار اور اجمیر کے بارے میں پوچھتی رہی۔ ہمارے دیوی دیوتاؤں کو لے کر اس کے اندر عجیب عجیب سوالوں کی ایک لمبی قطار تھی— کیا رام جی سچ مچ سیتا جی سے بہت پیار کرتے تھے؟ لچھمن ریکھا کیا ہے؟ یہ سونڈ والے بھگوان کیوں ہیں؟ کیا ہنومان جی سچ مچ آدمیوں کی طرح بولتے تھے...... یہ مندر میں گھنٹیاں کیوں بجتی ہیں......؟ شنکھ کیا ہیں؟ پوجا سے پہلے کیوں شنکھ بجائے جاتے ہیں......؟

پوجا...... شنکھ...... مندر کی گھنٹیاں، بھگوان...... رامائین اور مہابھارت سے نکلی کہانیاں...... دوسری طرف اجمیر کی درگاہ، ممبئی کے حاجی علی اور دلّی کے قطب صاحب سے لے کر حضرت نظام الدین...... نیٹ کی روشن دنیا میں نہ جنگ کے بگل بجتے تھے۔ نہ سیاسی توڑ جوڑ...... نہ ٹینک بارود اور توپوں کے شور۔ نہ آر ڈی ایکس اور اے کے 47 کا ذکر۔ مذہب گم تھا۔ شنکھ کی آواز، مندر کی گھنٹیاں اور مسجد سے آتی اذان کی آواز...... جیسے سب ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔ سرحدیں ٹوٹ گئی تھیں...... اور شاید جنگ کی تمام ممکنات کے باوجود محبت اور صرف محبت باقی

رہ جاتی ہے جو جنگ کی بھیانک تباہی کے بعد بھی زخمی دلوں میں مرہم لگانا جانتی ہے......

پھر شائستہ سے مکالمے کے دروازے کھل گئے۔

وہ پاکستان، وہاں کے معاشرے، بندشوں اور گھٹن کے بارے میں بتاتی تھی۔ وہ بتاتی تھی کہ ایک نفرت باقی رہ گئی ہے، تم لوگوں کے لیے — نوجوان لڑکے داڑھیاں بڑھا رہے ہیں۔ نفرت اب چہرے کی گھنی ہوتی داڑھیوں سے بھی جھانک رہی ہے۔ یہاں معاملہ مذہب کا نہیں ہے — اخبار، میڈیا اور سیاست نے جو زہر بھرا ہے، اس سے مورچہ لینا آسان نہیں۔ لیکن اب......

شائستہ کے چہرے پر سلوٹیں پڑ گئی ہیں — پہلے میرے لیے یہ ایک عام سی بات تھی۔ لیکن شاید اب نہیں۔ کیونکہ...... وہاں تم بھی رہتے ہو......

'اور اگر میں نہیں رہتا تو......؟'

'نہیں جانتی......'

'شاید یہی احساس میرا بھی ہے۔ تمہارا وہاں ہونا، میرے اس احساس کو، بہت حد تک کم کر چکا ہے، جہاں تم سے ملنے سے پہلے تک صرف نفرت کا بسیرا تھا......'

'نفرت چند لوگوں کے لیے نہیں۔ ایک پورے ملک کے لیے...... وہ پوچھ رہی تھی...... کیا یہ عجیب نہیں لگتا۔ اس گلوبل ولیج میں، جہاں سب ایک چھوٹے سے آشیانے میں سمٹ آئے ہیں۔ یہ کیسی خوشی ہے کہ ہماری حفاظت کے لیے ایک ملک کو بم اور میزائیلوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے؟'

'کیم' پر اس کی آنکھیں روشن تھیں۔ ایک بے حد حسین چہرے میں — جیسے خود کو پوری طرح سے ظاہر کرنے کی آزادی سمٹ آئی تھی...... کیم پر ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے...... اور...... ایک دوسرے کو سن رہے تھے......

'ہم بھی اڑنا چاہتے ہیں راٹھور۔ جیسے تمہارے ملک کی لڑکیاں اڑتی ہیں — ہواؤں میں۔ اپنی آزادی کے خوبصورت ڈینوں کے ساتھ — لیکن یہاں کے معاشرے میں پیدا ہوتے ہی ہمارے ڈینے کاٹ دیئے جاتے ہیں۔ ہمیں پڑھایا اس لیے جاتا ہے کہ اس ماحول میں پڑھائی بھی ایک اسٹیٹس سمبل ہے بس — لڑکی کہاں پڑھ رہی ہے؟ کس کانوینٹ میں؟ انگریزی کس

ایکسنٹ میں بولتی ہے؟ تاکہ پارٹی اور نمائشی میلوں میں اپنے اسٹیٹس کی بھی نمائش کی جا سکے۔ لیکن ہم کچھ بھی پڑھ لیں راٹھور، سپنے نہیں ہوتے ہمارے پاس— سپنے بڑی خوبصورتی سے ماں باپ کی تحویل میں ہوتے ہیں۔ اور وہ جانتے ہیں، ان سپنوں کا فیصلہ یا حکومت وہ کرے گا، کل جو ہماری زندگی میں آئے گا— ہمیشہ کے لیے اور اس، ہمیشہ کے لیے زندگی میں آنے والے مرد کو بیوی نہیں، گھر سنبھالنے والی ایک مورت چاہئے۔ لیکن میں اڑنا چاہتی ہوں— میں نے ایم بی اے کیا ہے۔ کچھ کرنا چاہتی ہوں زندگی میں...... لیکن......'

آنکھوں میں نمی سی لہرائی— 'ہمارے ملک میں یا تو عورت نمبر ون ہے یا پھر زیرو— یا بے نظیر یا خالدہ ضیاء یا شیخ حسینہ جیسی عورتیں ہیں، لیکن ان عورتوں کا بھی ایک سیاسی بیک گراؤنڈ رہا ہے— انہیں چھوڑ دیں تو یہاں سے بنگلہ دیش تک سیاست میں بھی عورتیں کہیں نہیں ہیں۔ اور اب...... لشکر ہے، طالبان ہے...... اور کتنے ہی لشکر...... کہ کبھی بھی ہمارے پڑھنے یا باہر نکلنے کے خلاف بھی ایک فتویٰ آسکتا ہے۔ پھر ہم دربے میں بند مرغیاں بن جائیں گے...... صرف گردن مروڑنے والے جلاّد کے انتظار میں......'

وہ رو رہی تھی...... 'یہ کوئی زندگی ہے راٹھور...... اس زندگی سے تو مر جانا اچھا لگتا ہے......'

شائستہ سائین آوٹ کرگئی تھی۔ کیم پر اندھیرا چھا گیا تھا...... لیکن اندھیرے میں بھی اس کے لفظ چیخ رہے تھے...... یہ کوئی زندگی ہے راٹھور...... اس زندگی سے مر جانا......

اسی دن شاید اس کیفیت میں، میں دیر تک سو نہیں پایا— کبھی ہم کتنے مجبور اور بے یار و مددگار ہوتے ہیں— دیواریں، سرحد پر خاردار تاروں کی قطار...... ان تاروں کے آر پار صرف بجلی کے جھٹکے ہیں یا نفرت کے—

26/11 کی دہشت

اب تک شاید آپ نے اندازہ کرلیا ہو کہ یہ کہانی بے حد نفرت کے دنوں میں شروع ہوئی— یعنی ایسے موقع پر جب دہشت کی بساط پر کٹر بھگوا تنظیموں نے ہندستانی سیاست میں ایک نیا موڑ لیا تھا— سادھوی پرگیہ اور لیفٹیننٹ کرنل پروہت کی گرفتاری سے، مالیگاؤں سے لے کر ممبئی تک کے دھماکوں کے نئے تار جڑنے لگے تھے— لیکن اس بار اسلامی جہاد یا دہشت گردی کی جگہ

ہندو وادی، کٹر وادی تنظیموں نے لی تھی — یہاں یہ اشارہ صاف تھا کہ مشتعل 'ہندوتو' کو اپنائے بغیر چارا نہیں — اور یہ بھی کہ اسلامی دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے 'ہندو وادی آتنک واد' کے شعلے بھڑکانا ہی سنگھ کا ایک خاص مقصد ہے — میڈیا کے خلاصے نے دہشت گردی کا ایک نیا چہرہ دکھایا تھا۔ شاید اُنہیں دنوں پہلی بار شائستہ کی زندگی میں داخل ہونے کے بعد میرے خیالوں اور کٹر پن میں تھوڑی سی کمی آئی تھی۔ لیکن بابو جی کا لہجہ ویسا ہی تیکھا اور شدت آمیز تھا۔

''سب بکواس۔ ہندوؤں کو بدنام کرنے کے طریقے۔ ہمارے سادھو سنتوں پر لگانے والے الزام بالکل بے بنیاد ہیں۔ دراصل کانگریس اقلیتوں کے ہاتھوں پوری طرح بک گئی ہے۔''

لیکن شاید جنگ کا کوئی راستہ نہیں — لیکن نفرت دور بھگانے کا ایک ہی راستہ پیار ہے — پیار — جو اچانک آپ کو ساری نا امیدی، سیاست، داؤں پیچ سے باہر نکال کر صرف ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا ہے......

بس...... چلتے...... چلو......

شائستہ پوچھ رہی تھی —

''تمہارا میڈیا ہم سے اتنی نفرت کیوں کرتا ہے — ؟ ایک ہی ملک کے تھے ہم، جیسی باتیں اب شاید گزری تاریخ کا حصہ لگتی ہیں۔ اب یہ دو نفرت کرنے والی آنکھیں ہیں۔ ایک دوسرے کو نہیں دیکھنے والی۔''

'یہ تم کہہ رہی ہو۔ اور جو تمہارے ملک کا میڈیا کرتا ہے — '

'ہمارا میڈیا اتنا اسٹرانگ نہیں جتنا تمہارا ہے۔ تمہارے یہاں سے بس زہریلے گیس کی بارش ہوتی ہے۔'

'ہم تو صرف بارش کرتے ہیں اور تم...... ؟ تم اپنے دہشت گرد بھیجتے ہو...... ہندوستان کو ختم کرنے کے لیے۔ کشمیر سے ممبئی تک......'

'کشمیر کا نام مت لو۔ وہ ہمارا ہے......'

'دوبارہ یہ بولنا بھی مت — کیم پر میرے کانپتے چہرے کو یقیناً وہ دیکھ رہی ہوگی۔ مگر جیسے میرا خون کھول گیا تھا — 'ہم جانتے ہیں تمہارا ملک یہ سب کشمیر کے نام پر کر رہا ہے۔ کیونکہ تم کشمیر کو ہمارے ملک کا حصہ ماننے کو تیار نہیں۔ تم ایک سڑے اور بدبودار ماضی میں سانس لیتے ہو اور تمہارا لشکر' کشمیر کو ہتھیانے کے لیے ہندستان کی بربادی کے مہرے بٹھاتا ہے — تمہارے

مدرسے دہشت کی فیکٹری بن جاتے ہیں۔ اور تمہارا مذہب...... بس کافروں کو ماردو اور اسلام راج قائم کرو کے بیہودہ اور ناممکن تجربات میں جٹ جاتا ہے۔'

'بکومت مت......' وہ غصے میں چلّائی تھی — اور تم لوگ وہاں مسلمانوں کو مارتے ہو۔ زندہ جلاتے ہو۔ دنگے کرتے ہو۔ دوئم درجے کا شہری سمجھتے ہو؟ وہ؟ تم گودھرا میں معصوم مسلمانوں کو بھون دیتے ہو۔ اور بابری مسجد توڑ دیتے ہو......'

'ایک بابری مسجد کا جواب، تم لوگ ہزاروں مندر توڑنے سے دے چکے ہو۔ اور ہاں، یہ بھی سن لو۔ جنہوں نے بابری مسجد توڑی، یہ معاملہ ابھی بھی عدالت میں ہے — اسے ملک میں کسی بھی ہندو نے قبول نہیں کیا — لیکن تم؟ تمہاری مسجدوں سے گولیاں چلتی ہیں — تم اردو بولنے والے کو مہاجر کہتے ہو...... جو کچھ تمہارے یہاں لال مسجد میں ہوا —؟ تم بھول جاتی ہو کہ تمہارے دہشت گرد تمہارا اپنا ملک بھی تباہ کر رہے ہیں۔'

وہ ایک لمحہ کو ٹھہری تھی...... ''ہم سیاست لے کر کیوں بیٹھ گئے......؟ ایک آگ یہاں بھی ہے۔ ایک نفرت یہاں بھی بوئی جارہی ہے۔ ایک نفرت وہاں بھی — دہشت کے سوداگر خوف اور وحشت کی زبانیں ہی جانتے ہیں — میں سیاست بھولنا چاہتی ہوں راٹھو ور اس وقت جانتے ہو میں کیا سوچ رہی ہوں۔''

'کبھی ہم ایک تھے...... ایک ملک۔ کتنا نادر اور خوبصورت خیال ہے — جیسے جسم ایک...... ایک روح۔ ایک ملک — فاصلے ہی مٹ جائیں — ایک ہونے کا تصور بھی کتنا عجیب ہے...... ہے نا...... پھر مجھے بلالو نا...... شادی کرلو مجھ سے......'

کیم پر اندھیرا — مائیک آف تھا......

شائستہ نے آہستہ سے ٹائپ کیا...... ٹی سی اینڈ بائی......

لیکن جیسے ابھی ابھی اس کے بولے گئے الفاظ میزائل، راکیٹ لانچرس، اے کے 47، آر ڈی ایکس جیسے گھنونے ہتھیاروں سے الگ میرے پورے وجود میں ایک ایسی کویتا لکھ گئے تھے، شاید جسے سننے کے لیے میں کب سے بے قرار تھا — مگر سب کچھ ایک یوٹوپیا جیسا۔ سرحد کی دیوار سے بھی بڑی ایک مذہب کی دیوار — لیکن خوف اور دہشت کے ماحول میں ہماری نفرت بھری باتوں کے درمیان اس نے خاموشی سے ایک پیار کا پودا لگایا تھا — لیکن میں جانتا تھا، یہ کوئی برلن کی دیوار نہیں ہے جسے آپسی سیاسی سوجھ بوجھ سے توڑ دیا جائے — اس دیوار کے ایک طرف

سنگھ ہے اور دوسری طرف طالبان......

لیکن شائستہ کا آخری لفظ اس بار مجھے حیران کر گیا تھا—

دو دن تک غائب رہی۔ نہ فون آیا۔ نہ نیٹ پر کوئی بات ہوئی۔ شاید یہ میرے لیے بے حد حیران کرنے والے دن تھے— جہاں ایک انجانی سی کسک اور چبھن مجھ میں جاگ چکی تھی۔

تیسرے دن وہ نیٹ پر ملی......

'کیسے ہو......؟'

رسمی بات چیت کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے ٹائپ کیا— 'اس دن جو کچھ تم نے کہا، کیا صرف ایک مذاق تھا؟'

'نہیں۔'

'لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟'

اب کیم روشن تھا— ہم مائیک پر، ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔

''راٹھور...... دو دن تک میں اس پہیلی میں ڈوبی رہی— جو انجانے میں میرے ہونٹوں سے نکل گئی تھی۔ لیکن اب کہہ سکتی ہوں۔ انجانے میں نہیں: شاید تم سے ملاقات کے بعد مسلسل اس موضوع پر سوچتی رہی تھی۔ دیکھو، میں پیار کو کوئی بندھن، کوئی کانٹیکٹ نہیں مانتی کہ پیار کیا ہے تو سامنے والا مل ہی جائے— پیار ان سب سے الگ ایک احساس ہے، جہاں نہ دیکھنا ضروری ہے نہ ملنا— اگر ہم نیٹ پر ایک دوسرے کو نہ دیکھتے، نہ باتیں کرتے تو؟ کیا پیار نہیں ہوتا؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پیار صرف ایک میل آئی ڈی سے بندھا ہے، جس کا پاس ورڈ تمہارے پاس ہے— ایک دن پاس ورڈ بدل دوں گے۔ یا دوسری آئی ڈی بنا دو گے۔ یہ رشتہ بھی ختم ہو جائے گا— لیکن تب بھی تمہارے لیے آخر آخر تک ایک پیار تو رہ ہی جائے گا، میرے پاس—''

کیم پر اس کی آنکھوں میں کشمکش کے آثار تھے— 'لیکن اس دن جو کچھ کہا، بے حد سنجیدگی سے کہا۔ مجھے پائل پسند ہے۔ بندی پسند ہے۔ ساڑی پسند ہے۔ پسند کے معاملے مذہب سے بلند ہوتے ہیں— یہاں مذہب نہیں آتا۔ جیسے تم پسند ہو اور تم میرے مذہب کے نہیں، یہ سوچ کر تمہیں پیار نہ کروں تو یہ ایک طرح کا خود پر ظلم ہوگا— ممکن ہے مجھے تمہارے لباس اور پہناوے پسند ہوں۔ لیکن تمہیں ہمارے لباس یا پہناوے بالکل پسند نہیں ہوں تو کیا ایسی صورت

میں ہمارے پیارے کوخارج کردو گے؟

'نہیں۔'

'جانتی ہوں۔ آہستہ آہستہ ہم ایک دوسرے کے رسم ورواج بھی پہننے لگتے ہیں اور نہ بھی پہنیں تب بھی کوئی بات نہیں۔'

وہ سانس لینے کے لیے ٹھہری— ''ہمالیہ کی چوٹیوں سے پگھلتے گلیشیرس تک ہم اپنی مٹھی میں کرنا جانتے ہیں۔ چاند سے خلاء اور نئی دنیا کی تلاش تک۔ پھر ایک چھوٹا سا چیلنج ہم قبول کیوں نہیں کر سکتے؟ کیا صرف اس لیے کہ کسی بدتر دھماکے سے بھی زیادہ خطرناک ہیں یہ دیواریں، جو مذہب کی ہیں؟'

وہ سنجیدہ تھی— 'چلو'ایک بار پنگا لیتے ہیں......'

'لیکن......؟'

مجھے چاہتے ہو یا نہیں، سوال یہ ہے؟

'ہاں۔'

'تو پنگا لو— 28 سال کے مرد ہو— جاب کرتے ہو— جہاں دنیا میں اتنی بڑی بڑی باتیں ہو رہی ہیں، ہم ایک چھوٹا سا پنگا نہیں لے سکتے؟'

اس دن ایک بار پھر وہ مجھے حیران کر گئی تھی۔

●

وقت کو حاضر و ناظر جان کر کہ یہ سب کچھ انہیں دنوں واقع ہوا، جب 2008 میں بے حد پراسرار یا بدترین حادثوں کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا۔ لوک سبھا میں کھلتے ہوئے بیگ— ممبر پارلیمنٹوں کی خرید وفروخت— رام پور، جے پور، بنگلور، احمد آباد اور دہلی کے بم دھماکے— کشمیر کا امرناتھ تنازعہ— ان سے باہر نکلیں تو بش کی طرف جوتا اچھال کر راتوں رات ہیرو بن جانے والا صحافی— نسل کشی اور فرقہ واریت کا ننگا کھیل۔ الگ الگ ماسٹر مائنڈوں کی تلاش۔ شیئر بازار کے لڑھکنے اور گرنے کا سلسلہ— روزگار چھیننے والی گندی پالسیاں اور— 26/11 کا ننگا ناچ— جس سے پورا ملک کانپ اٹھا تھا۔ جیسے پاکستان نے اچانک ایک بار پھر نفرت اور جنگ کے بگل بجا دیئے تھے۔ چار دن تک چلے اس بھیانک دہشت گردانہ حملے نے جیسے سارے ملک کی

نیند اڑادی تھی۔ لیکن سب سے اہم تھا کہ اگر سرحد پار کے فدائین کا اس پورے معاملے میں کوئی رول ہے، تو ملک کے ہر عوام کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف اس پر اپنی ناراضگی جتائے بلکہ پاکستانی ہونے کے احساس کو بھی نفرت سے دیکھے۔

مجھے لگا، کہانی ختم ہوگئی ہے— شاید ایسی کہانیاں اسی طرح سنامی کی شدت کے ساتھ شروع ہوتی ہیں اور بکھر جاتی ہیں— جیسے نفرت کے اس ماحول میں پاکستان یا اس ملک کے کسی بھی شخص سے محبت کا رشتہ رکھا ہی نہیں جاسکتا۔ اخبار چیخ رہے تھے۔ میڈیا آگ اگل رہا تھا۔ حملے کی وارننگ کے باوجود رات کے اندھیرے میں گیٹ دے آف انڈیا سے ہندوستان کی اقتصادی دار السلطنت میں داخل ہونے والے درندوں نے دہشت کی وہی کہانی لکھی تھی جو امریکہ میں 9/11 کو پیش آیا تھا۔ لیکن امریکہ اپنی دادا گیری کے ساتھ حالات کو بہتر بنانے میں کامیاب رہا تھا۔ لیکن یہ ہندستان ہے، امریکہ نہیں— جہاں لچر غیر محفوظ کپڑوں میں آئی ٹی ایس کے اعلیٰ افسر اپنی جان گنوا بیٹھتے ہیں— وہاں حفاظت کے بڑے ذرائع یا حل سوچنا بھی مشکل لگتا ہے— لیکن حفاظتی دستوں کے ٹکراؤ میں وہ شخص پکڑا گیا تھا، جس سے ثبوت جٹانے کا کام اب بھارت سرکار کر رہی تھی۔ وہی کالے کپڑوں میں ملبوس ایک حیوان چہرہ— دائیں ہاتھ میں بندھی لال پٹی— بائیں میں کالی— دائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا اے کے 47۔ تاج ہوٹل— نریمن ہاؤس اور اوبرائے میں چل رہے موت کے مناظر سارا ملک جیسے سانسیں روک کر دیکھ رہا تھا۔

محبت ہار گئی تھی— آخر یہ ایک دکھ بھری خبر تھی۔ دہشت کی فتح ہوئی تھی......

شائستہ کی آواز ان دھماکوں میں کہیں کھوگئی تھی۔ 'تم ایک پنگا بھی نہیں لے سکتے۔'

یہاں دوبارہ ان خونی کارروائیوں کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جب میری خیریت کے لیے اس حادثہ کے ساتویں دن شائستہ نے فون کیا، تو جیسے ساری نفرت میرے ہونٹوں پر آگئی تھی—

'مر گیا میں۔ راجندر راٹھور۔ دلّی کی پرائیوٹ سی سی ایل کمپنی میں کام کرنے والا ایک آفیسر۔ اس آفیسر کے پاس اپنے بابو جی کو دیئے جانے والے سارے الفاظ چھوٹے پڑ گئے ہیں۔ تم جانتی ہونا......ان کا تعلق سنگھ سے ہے......'

'غصے میں ہو؟'

'ہاں۔ بے حد غصے میں۔ کیا سمجھتے ہو تم لوگ؟ دو بار کی جنگیں کافی نہیں تھیں، جو تیسری بار بھی ہماری شانتی بھنگ کرنے چلے آئے......؟

لیکن راٹھور یہ میں تو نہیں تھی......'

'یہ تم ہی تھی......تم سب ایک ہی ہو۔ پاکستانی — جو اس وقت ہمارے لیے ایک ناسور یا کینسر کے زخم سے زیادہ بدتر ایک ایسا وائرس ہے، جو ہم سے سب کچھ چھین لینا چاہتا ہے۔'

'سیاست کی سزا ہمیں کیوں دے رہے ہو؟'

'سیاست۔ کیا یہ صرف ایک سیاست ہے؟ یعنی میرا ملک اگر اس جنگ کو ٹالتے ہوئے تمہیں ثبوت دے رہا ہے اور تمہارے ان دہشت گردوں کو مانگ بیٹھتا ہے تو یہ سیاست ہو گئی؟'

میں غصے میں ابل رہا تھا— 'شاید وہ تمام رپورٹ میرے سامنے تھی، جو میں اسے بتانا چاہتا تھا— 1998 کے بعد سے اب تک پاک کے ذریعے مارے گئے معصوم لوگوں کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہم صرف گھریلو جنگ لڑ رہے عراق سے تھوڑا پیچھے ہیں— صرف سات برسوں میں احمد آباد، جے پور، گوہاٹی، دہلی، ممبئی، بنگلور، گاندھی نگر، مالیگاؤں اور یہ سب ایک ایسے ملک میں جہاں آزادی کے 61 سال بعد بھی 77 فیصد لوگ آج بھی دس روپے روزانہ پر اپنی زندگی گزار رہے ہیں— ہماری ہمدردی ہماری کمزوری نہیں ہے— اب ہم نے بھی آتنک کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے......'

'بہت غصے میں ہو۔ تمہارا یہ چہرہ پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ مگر اچھا ہے راٹھور۔ میرے ملک سے نفرت کرو۔ لیکن میں؟ کیا ملک میں رہنے والے عوام سے نفرت جائز ہے؟ یہاں کئی لوگ ہیں، جو تمہاری طرح سوچتے ہیں...... ہم اس بے حد نفرت بھرے نظام کی کٹھ پتلی بن جائیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا راٹھور......؟ اس کی آواز بھرا گئی تھی— 'ایک بابری مسجد کے جواب میں جب یہاں ہزاروں مندر توڑے گئے تھے تو بہت سے دلوں میں اس سیاسی نفرت اور نظام کے خلاف غصے کا جذبہ پیدا ہوا تھا۔ نفرت کا حل نفرت نہیں ہے......'

اس کی آواز کانپ رہی تھی...... 'اسی لیے...... مجھے بلالو نا...... دیکھو کم از کم مجھ سے نفرت مت کرو۔ میں تمہاری نفرت کو قبول نہیں کر سکتی...... مجھے بلالو راٹھور......'

فون کٹ گیا تھا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ میرے اندر کے دھماکے رک گئے تھے۔ اب

ایک دوسرا دھماکہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن یہ دھماکا پہلے والے دھماکوں سے زیادہ طاقتور تھا...... کیا ایسا ممکن ہے؟ شائستہ کو بلایا جا سکتا ہے؟ اس دہشت بھرے ماحول میں؟ نفرت بھری فضا میں؟ جب یہاں کا سارا ماحول پاکستان کے خلاف ہے۔ جب ٹی وی چینلس اور بالی وڈ فلموں میں کام کرنے والے اداکار ریبرنگ پاکستان کو واپس کیے جا رہے ہوں۔ جب پاکستانی گلوکاروں کے نغمے، فلموں سے نکالے جا رہے ہوں۔ یعنی موجودہ دہشت کی ایسی فضا میں کیا یہ ممکن ہے......؟

دو دن کے بعد شائستہ دوبارہ نیٹ پر آئی تو جیسے اس کے حوصلوں کو پر لگ چکے تھے۔ میری الجھنوں پر اس کا سیدھا سا جواب تھا۔

'ہاں سب ممکن ہے۔'

'لیکن کیسے؟'

'9/11 ورلڈ ٹاور میں جو کچھ ہوا، کیا یہ ممکن تھا— ؟ تمہارے ملک میں سمندر کے راستے فدائین آئے اور جان کی بازی لگا کر اپنے ناپاک ارادوں کا کھیل، کھیلتے رہے— ان کی دہشت اگر ممکن ہے تو ہم ایک پیار کے لیے اتنا کیوں سوچتے ہیں۔'

شاید وہ صحیح تھی۔ میں ہار گیا تھا— دہشت گرد اپنی جان پر کھیل کر، انسانی بم بنا کر ایک دہشت بھری کارروائی کو انجام دے رہے ہیں۔ یوں چٹکیوں میں۔ اور ہم...... پیار کی ایک چھوٹی سی ندی کو پار نہیں کر سکتے؟'

'راٹھور سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا تم بھی مجھے اسی شدت سے پیار کرتے ہو...... جیسے......'

میں نے اس کی آواز درمیان میں ہی کاٹ دی— ''شاید اس سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ — پیار کوئی پیمانہ نہیں، جہاں اسکیل ڈال کر دیکھنے اور ناپنے کی گنجائش باقی ہو...... لیکن شاید۔ نفرت کے ان شدید حملہ کے باوجود میں ایک لمحہ بھی تم سے دور نہیں رہا...... لیکن جہاں سارا ماحول ہمارے خلاف ہو، وہاں ہم یہ جنگ کیسے جیت سکتے ہیں؟'

'ویسی ہی ہمت، جیسی ان دہشت پسندوں نے ایک ذلیل کارروائی کے لیے دکھائی— اچھا بتاؤ اگر ہم شادی کر لیں گے تو......؟ کیا مجھے اپنے مذہب کو بھولنا ہوگا......؟'

شاید اب تک مجھے پیار کی اس بے پناہ طاقت کا اندازہ نہیں تھا— جہاں ایک سنگھ

پریوار کے زیر سایہ ہوتے ہوئے بھی اچانک میں ایک ایسے راستے پر چل پڑا تھا، جہاں فرقہ واریت سے دور ایک عام سا انسان رہ گیا تھا— ہاں عام انسان۔ مٹھی بھر آسمان اور اپنے پیار کے لیے وقف— ایک متوازن اور لبرل چہرے والا عام انسان۔

'نہیں— پیار میں مذہب کوئی رکاوٹ نہیں ہے جان— مذہب پیار کے درمیان آئے تو پیار، پیار نہیں رہ جاتا۔'

'تسلی ہوئی...... ورنہ میں تو ہر روپ میں تمہاری تھی۔ تم جیسے چاہتے...... لیکن چاہتی یہی تھی، ہم اپنے رنگوں میں ایک دوسرے سے پیار کریں— ایسا پیار جو نہ دیکھا گیا ہو نہ سنا گیا ہو......

کیم روشن تھا— آنکھیں روشن تھیں— آواز جیسے سنامی لہروں جیسی موسیقی پیدا کر رہی تھی......

'میں نے سب سوچ لیا ہے...... تم جانتے ہو نا...... محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے......!'

'ہاں۔'

''مجھے کل لڑکے والے دیکھنے آئے تھے۔ تمہیں بتایا تھا— میرا ایک بھائی آرمی میں ہے— اس نے ہی یہ رشتہ لگایا تھا۔ دوسرا بھائی طالبان سے جڑا ہے۔ مجھ سے ایک سال چھوٹا— ابو بوڑھے ہو گئے ہیں— نماز پڑھنے اور قرآن کی تلاوت کے علاوہ کچھ نہیں کرتے۔ کل میں نے سب کی امیدوں کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نے صاف منع کر دیا۔ میں یہ شادی نہیں کر سکتی۔ اب گھر والوں کو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ میں اسی لمحے کا فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں۔''

'لیکن کیسے؟'

''وہ میں نے سوچ لیا ہے۔ ہم فون پر نکاح کریں گے۔ نکاح مسنونہ۔ میرے جاننے والوں میں ایسا ایک نکاح ہو چکا ہے۔''

''نکاح...... لیکن میں ہندو ہوں......' میری آواز کانپ رہی تھی۔ 'تم جھوٹے نکاح کا مطلب سمجھتی ہو؟ کیا ایک ہندو کے ساتھ تمہارے گھر والے نکاح کو مان جائیں گے......''

'نکاح کے وقت تم اور تمہارا خاندان مسلمان ہوگا— مسلمان ہو تم— سمجھو میری بات راٹھور— میں آنا چاہتی ہوں۔ اور اس کے لیے اس بے رحم وقت سے بہتر کچھ بھی نہیں— میں گھر

والوں کو منالوں گی — یہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں کہہ دوں گی کہ تمہارے گھر والے تمہاری شادی جلدی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہمیں یہ قدم اٹھانا پڑا...... سنو راٹھور......'

بادل گرج رہے تھے۔ میزائلیں چھوٹ رہی تھیں۔ دھماکے ہو رہے تھے۔ نیٹ بند تھا۔ آواز گم ہوگئی تھی۔ میں ایسے گہرے سناٹے میں تھا، جن کے بارے میں شاید میں نے زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا— مگر شاید شائستہ ٹھیک کہتی ہے— انسانوں کے قتل عام کے لیے جب دہشت گرد اپنا حوصلہ جٹا سکتے ہیں تو ہم محبت کے لیے کیوں نہیں—؟ یہ کوئی پریوں کی کہانی نہیں تھی— لیکن سب کچھ جیسے پریوں کی کہانیوں جیسا ہی لگ رہا تھا— پاکستان میں اتنی گھٹن، اتنی بندشوں میں رہنے والی شائستہ فہیم خاں جب ایسا بھیانک قدم صرف میرے لیے اٹھانے کو سوچ سکتی ہے تو میں کیوں نہیں کرسکتا؟ ممکن ہے، یہ سب کچھ بے حد غیر معمولی اور ممکنات سے الگ دکھائی دے۔ لیکن کبھی کبھی اصلیت شاید اس سے بھی زیادہ تلخ ہوتی ہے— اب میں حیران نہیں تھا۔ صرف نئی اسٹریٹجی پر اپنی طرف سے کارروائی کرنے کی دیر تھی— ایک دھوکہ— ایک جھوٹا نکاح— لیکن ہم دونوں یہ اس محبت کے لیے کر رہے تھے، جسے اس دہشت بھرے کہرے میں بچانا ہمارے لیے ضروری ہوگیا تھا۔

شائستہ نے اپنی طرف سے پورا ہوم ورک کرلیا تھا اسے احساس تھا۔ دونوں بھائی اس کی مخالفت میں کھڑے ہوجائیں گے۔ نہ اماں اس حقیقت کو تسلیم کریں گی نہ ابو۔ اسے ٹھیک ویسی ہی بغاوت اپنے گھر میں انجام دینی ہوگی۔ جیسی تختہ پلٹ بغاوتوں کی کہانیاں اس نے سن رکھی ہیں۔ اس لیے کہ اسے ہندوستان پہنچنا ہے۔ جہاں اس کا کوئی بھی رشتے دار نہیں رہتا۔ ورنہ شاید اس جھوٹ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اور ظاہر ہے، راجندر راٹھور...... ایک ہندو نام سننا اس کے گھر والے کسی بھی صورت میں برداشت نہیں کریں گے۔ اس لیے راٹھور یا اس کے گھر والوں کو مسلمان بن کر ہی ملنا ہوگا۔

اس واقعے کے ٹھیک تیسرے دن اس نے نیٹ پر اطلاع دی—

'خوش ہو جاؤ۔ میں نے مورچہ جیت لیا ہے۔'

اس نے تفصیل سے بتایا— پہلے دونوں بھائی اور امی ابو محبت کی بات سے ہی بھڑک

گئے—— پھر جب یہ سنا کہ تم مسلمان ہو اور دہلی میں رہتے ہو، تو ابو کا لہجہ ذرا سا نرم پڑ گیا—— ان کا بچپن دہلی میں ہی گزرا تھا۔ خیر یہ لمبی کہانی ہے کہ میں نے یہ مورچہ کیسے فتح کیا۔ لیکن میرے گھر والے راضی ہو گئے ہیں۔ میں نے بتا دیا ہے کہ تمہارا نام محمود ہے۔ اور گھر والے تمہاری شادی جلد کرنا چاہتے ہیں—— تمہارے ابو کی طبیعت خراب رہتی ہے۔ اس لیے وہ پاکستان نہیں آسکتے۔ اور اس سے پہلے کہ گھر والے محمود کا نکاح کہیں اور کر دیں، ہم فون پر اپنی نکاح کو منظوری دیں گے اور محمود یہ بات مان گیا ہے۔

شائستہ نے آگے بتایا—— ابو، تمہارے ابو سے بات کرنا چاہتے ہیں تاکہ فون پر نکاح کی رسم پوری کی جاسکے۔ میں شاید اندر تک لرز گیا تھا۔

جھوٹ در جھوٹ

زندگی کے اس بے حد اہم موڑ پر، اچانک دنیا کے نظارے بدلے تھے میرے لیے—— شاید محبت کی شدت آپ سے آپ کو چھین لیتی ہے۔ پھر جیسے آنکھوں کے آگے کی پرچھائیوں میں صرف جلتے ہوئے قمقمے رہ جاتے ہیں۔ حیرانیوں کا ایک وہائٹ ہاؤس ہوتا ہے...... جس کے ہر دروازے پر محبت کی ایک بڑی سی مورت ہوتی ہے۔ لیکن اب یہ مورت جھوٹ کی بنیاد پر کھڑی تھی۔ ایک جھوٹ سے نکلنے والا دوسرا جھوٹ۔ جیسے جھوٹ ان دنوں ہند و پاک کے درمیان بولے جارہے تھے۔ پاکستان کے لیے ہندوستان کی انفارمیشن ایک جھوٹ تھی جیسے ہندوستان کے لیے پاکستان مسلسل دباؤ سے بچنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتا رہا۔ بابو جی کے الفاظ میں—— جنگ ہی اکیلا راستہ ہے۔ اور یہاں، ہمارے لیے شاید محبت ہی اکیلا راستہ۔

شائستہ اپنے جھوٹ کے مہرے چل چکی تھی۔ اور اب یہ جھوٹ کا یہ پانسہ مجھے پھینکنا تھا۔

اور اس کے لیے میں نے اس بے رحم رات کا سہارا لیا۔ جس دن ہندوستان کے مِتّل، مکیش امبانی جیسے بڑے سرمایہ دار گجرات کے ہتھیارے وزیر اعلیٰ کو ملک کا وزیر اعظم بنانے کا خواب دیکھ رہے تھے—— ملک بارود کے ڈھیر پر کھڑا تھا اور بارود کا کھیل، کھیل چکے شخص کو ملک کے وزارت عظمیٰ کی کرسی پر براجمان ہونے کا خواب سجایا جارہا تھا۔

رات کے دس بج گئے تھے۔ ماں بابو جی سے، دفتر سے نکلتے ہوئے میں اپنی بات بتا چکا تھا کہ آج آپ دونوں سے کچھ ضروری بات کرنی ہے—— شاید اس ضروری بات کا مطلب وہ سمجھ

چکے تھے — سردی میں ان کے چہرے پر اس بے حد ضروری بات کی تپش کو محسوس کیا جا سکتا تھا — میرے اندر کمرے میں داخل ہونے تک جیسے وہ خود کو تیار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

'کسی کی زندگی بچانے کے لیے اگر جھوٹ کا سہارا لیا جائے تو......؟ مان لیجئے کوئی شخص ایک گھٹن بھرے قید خانے میں ہے۔ آپ اسے باہر نکالنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں اور اسے زندگی مل جاتی ہے؟'

ماں' بابو جی پراسرار نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے —

'میں نے شادی کا فیصلہ کیا ہے۔'

ممکن ہے، اچانک کا یہ جملہ 'ماں' بابو جی کے لیے کسی دھماکے کا کام کرتا، لیکن وہ ابھی بھی غور سے میرا چہرہ پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ماں بولی — 'اچھی بات ہے!'

بابو جی بولے — 'میں ریٹائر ہو چکا ہوں۔ ہم دونوں تمہارے ہی بھروسے ہیں۔ نہ بھی ہوتے، تب بھی پریم وِواہ جیسے پرستاؤ کے وِرودھ میں، میں نہیں جاتا۔'

'یہ سن کر بھی نہیں کہ وہ لڑکی ایک مسلمان ہے —؟'

اب چونکنے کی باری ماں کی تھی۔

'مسلمان اور پاکستانی بھی — لیکن اگر یہ نہیں ہوا تو میں بھی نہیں رہوں گا — '

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو بابو جی کے الفاظ نے مجھے روک لیا — 'بیٹھو......'

ان کی آنکھیں کشمکش یا الجھن کا احساس کرا رہی تھیں......

کیسے ملاقات ہوئی......؟

میں نے بتا دیا۔

'دیکھا ہے؟'

'ہاں۔'

'فون پر بات ہوئی ہے۔'

'ہاں۔'

'تم اسے ہندو بناؤ گے؟'

'نہیں۔'

ماں کا چہرہ سناٹے میں ڈوبا تھا—

'میرا رشتہ سنگھ سے رہا ہے۔ جانتے ہو۔ عمر کی اس پائیدان پر بھی ان کی سبھاؤں میں آتا جارہا ہوں۔ لیکن وہ بھی جانتے ہیں کہ بچے اپنا مستقبل خود چنتے ہیں...... حالات اچھے نہیں۔ تم بھی دیکھ رہے ہو۔ دونوں طرف یدھ کے سائے منڈرار ہے ہیں— ایسے میں شادی کا پرستاؤ؟ چلو مان لیا میں تیار ہو جاتا ہوں۔ لیکن وہ لوگ؟ میں قریب سے جانتا ہوں۔ ان پاکستانیوں کو...... بابو جی نے آنکھوں پر ڈھیلے ہو رہے چشمے کو ٹھیک کیا...... 'بچپن پاکستان میں ہی گذرا۔ دنگے پھیلے تو لٹے لٹائے ہم دہلی آگئے— آج بھی اردو اخبار پڑھ لیتا ہوں...... ہم مسلمانوں کے محلے میں تھے...... شاید وہ پرانی یادوں میں گم تھے...... چشمہ اتارا آنکھیں صاف کیں— 'وہ کسی ہندو کو برداشت نہیں کریں گے۔'

'جانتا ہوں۔'

'پھر—؟' اس بار چونکنے کی باری ماں کی تھی۔

'شائستہ کا یہاں کوئی بھی نہیں رہتا......'

'شائستہ......' بابو جی دھیرے سے بڑبڑائے......

'اگر کوئی ہوتا تو شاید کسی بھی جھوٹ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی— ہم جانتے ہیں' حالات خراب ہیں۔ شاید حالات اور بدتر ہوتے چلے جائیں۔ ہم سب ٹھیک کرلیں گے۔ لیکن اس کے لیے صرف ایک راستہ ہے کہ شائستہ ہندوستان آجائے......'

'یہ کیسے ہوگا؟'

'ہم فون پر نکاح کریں گے۔'

'نکاح—؟ پاگل ہو—؟ نکاح کا مطلب سمجھتے ہو— نکاح کا مطلب ہے دھرم پریورتن— تم دھرم پریورتن کرو گے—؟ مسلمان بنو گے—؟ کیونکہ نکاح تو تبھی ہوسکتا ہے جب تم مسلمان بن جاؤ— وہ شک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے کہ کہیں اس میں بھی کوئی پاکستانی چال تو نہیں۔

میری آواز کمزور تھی— 'کیونکہ نکاح کے بغیر، شائستہ ہندستان نہیں آسکتی— ہاں، ایک بار وہ ہمارے ملک آجائے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'

'ہمیں کیا کرنا ہوگا — بابو جی اب بھی مجھے بغور دیکھ رہے تھے۔
'ہم صدیقی خاندان کے ہیں۔ میں محمود صدیقی — آپ آفتاب صدیقی۔ اور ماں......'

'عارفہ صدیقی......' بابو جی ماں سے بول رہے تھے — 'تم عارفہ ہو بھی...... بچپن میں پڑوس میں ایک لڑکی تھی عارفہ — میرے ساتھ کھیلتی تھی۔ سپنے کتنی دور نکل گئے۔'
ان کا لہجہ ایک بار پھر بجھ گیا تھا...... ماں باپ بڑے شہروں کے لیے صرف ایک کٹھ پتلی ہوتے ہیں' جنہیں ان کے پڑھے لکھے نوکری کرنے والے بچے نچاتے رہتے ہیں۔'
اپنے کمرے میں آنے تک میں پریشان تھا۔ شاید سب کچھ اتنی جلدی ہو جانے کی امید نہیں تھی۔ لیکن ابھی کئی امتحانات باقی تھے۔ نکاح۔ قاضی، یعنی ایک جھوٹے نکاح کو سچ بتانا۔ کون مسلمان اس کے لیے تیار ہوگا؟

دوسرے دن صبح بابو جی نے اپنے دو پرانے مسلم دوستوں کو بلا لیا تھا۔ میں نے چھٹی لے لی تھی۔ جس وقت میں کمرے میں داخل ہوا، کمرے میں موت جیسا گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ شاید بابو جی مولوی سبحان (جو پڑوس میں ہی رہتے تھے اور صبح بابو جی کے ساتھ مارننگ واک پر نکلتے تھے) اور ہدایت اللہ خاں دونوں سے اس نازک موضوع پر بات کر چکے تھے۔ مولانا ہدایت اللہ کی بابو جی نے کچھ بے حد دشوار کن لمحے میں مدد بھی کی تھی — لیکن اس وقت دونوں کے چہروں سے ناراضگی ظاہر ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ۔ دونوں کے چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی، کرتا پائجامہ۔ میں پاس والے صوفے پر بیٹھ گیا......
'مذہب بچوں کا کھیل نہیں......' ہدایت اللہ نے جیسے بغاوت کر دی تھی۔
'وہ لڑکی اگر پاگل ہے اور اسلام سے بے دخل ہونا ہی چاہتی ہے تو کیا تمہارا بھی لڑکا —؟ میاں جوانی کے جوش دو دن میں بجھ جاتے ہیں......'
مولوی سبحان آہستہ سے بولے — 'تمہاری دوستی میں آ گئے۔ لیکن جھوٹا نکاح۔ نعوذ باللہ...... یہ ممکن نہیں......'
'ویسے بھی فون پر نکاح قبول نہیں ہے۔ یہ بس چند مجبوریوں کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ کہا گیا ہے۔ 'لا نکاح الا بولی' کوئی بھی نکاح بغیر ولی کے جائز نہیں۔'

ہدایت اللہ نے کہا— ''برخوردار، مسلمان بن جائیں پھر کوئی قباحت نہیں...... ویسے بھی یہ آج کل عام ہوگیا ہے۔ شادی کے لیے پریشانی آئے تو مسلمان ہوجاؤ— اسلام ۴-۴ شادیوں کی اجازت جو دیتا ہے۔''

گفتگو چل رہی تھی۔ سارے تیر میرے خلاف جارہے تھے۔ میں جیسے یکا یک گہرے سنّاٹے میں آگیا تھا۔ جس امتحان کی گھڑی کو آسان مان کر چل رہا تھا وہ اس قدر الجھی ہوئی اور بھیانک ہوسکتی ہے، شاید یہ سوچ پانا بھی میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ مگر ایسا ہو رہا تھا— مجھے محسوس ہوا، یکا یک شائستہ کا وجود میرے اندر سے گم ہونے لگا ہو...... سانس تیز تیز چلنے لگی تھی۔ پھر اچانک جانے کیا ہوا میں زور زور سے بول رہا تھا۔

'جھوٹ کیا ہوتا ہے، میں نہیں جانتا— آپ بڑے لوگ ہیں— ہم تو بچے ہیں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں۔ جو جھوٹ کسی کو بچانے کے لیے بولا جائے، وہ جھوٹ، جھوٹ نہیں ہوتا— یہاں بھی دو زندگیاں داؤ پر لگی ہیں— اور دوسری طرف آپ کا مذہب ہے— مجھے پیار گوارا ہے تو مسلم بن جانا بھی گوارا ہے— لیکن شائستہ نہیں چاہتی— جیسے میں نہیں چاہتا کہ شائستہ میرے گھر آکر اپنا دھرم چھوڑ کر میرے بھگوانوں کو ماننے لگے— دو دھرم کے لوگ اگر ایک دوسرے کو چاہنے والے ہیں تو اپنے اپنے دھرموں کے ساتھ ایک چھت کے نیچے کیوں نہیں رہ سکتے—؟ اس دنیا میں جب قتل و غارت کے لیے، ہزاروں تسلیاں یا فتوے مل جاتے ہیں، تو دو پیار کرنے والوں کو ایک جھوٹ کا سہارا کیوں نہیں مل سکتا—؟ بابو جی سنگھ کو ماننے والے ہیں۔ بابری مسجد کے گرنے سے لے کر ہزاروں واقعات ایسے ہیں، جہاں لاشوں کی تجارت ہوئی ہے اور آپ کے یہاں...... فدائین...... اُسامہ جیسے لوگ جو مذہب کے نام پر انسانی معصوم جانوں کا قتل کررہے ہیں— یہ سب جائز ہے تو پیار کا ایک جھوٹ جائز کیوں نہیں—؟ میں چلّایا تھا— وہ وہاں مرجائے گی اور یہاں میں— کیا یہ آپ دونوں کے مذہب کے لیے فخر کی بات ہوگی—؟ یا وہ جھوٹ، جو دو زندگیوں کو بچالے۔'

شاید میں رو رہا تھا...... کچھ عجیب سے احساس رہے ہوں گے کہ میں زیادہ دیر تک کمرے میں ٹھہر نہیں سکا۔ میرے جانے کے فوراً بعد ہی دونوں مولوی صاحبان بھی اپنے گھر چلے گئے تھے۔

میں گہرے سناٹے میں تھا— اس کے باوجود پرامید۔ اندر جل پریوں کی طرح رقص کرتی شائستہ موجود تھی۔ جو کہہ رہی تھی— 'گھبراؤ مت۔ ڈرتے کیوں ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'

رات میں ہدایت اللہ اکیلے واپس آ گئے— وہ کئی جگہ بالخصوص گاؤں کی شادیوں میں نکاح کے فرائض انجام دے چکے تھے۔

چائے پیتے ہوئے انہوں نے بابو جی کو اپنے دل کی بات بتا دی— 'راز داری ضروری ہے۔ اب تو جیسے ہونٹوں پر پاکستان کا نام لانا بھی ملک سے غداری جیسا ہو گیا ہے— بڑے میاں کی باتوں میں وزن تھا— آپ تیاری کرو۔ لیکن یہ فیصلہ دل پر پتھر رکھ کر کیا ہے میاں۔ اللہ معاف کرے۔ اگر اس جھوٹ سے دو زندگیاں بچ سکتی ہیں تو پھر یہ جائز ہے......'

وہ بابو جی کی آنکھوں میں جھانک رہے تھے— 'شاید تم یہ بھی جان جاؤ کہ ایک انسان کی زندگی بچانے کا معاملہ سامنے آتا ہے، تو اسلام پیچھے نہیں ہٹتا— وحشیوں نے اسلام کو درندوں کا مذہب بنا دیا ہے۔'

جاتے ہوئے وہ ٹھہر کر بولے— 'میں نکاح پڑھا دوں گا۔ دو گواہوں کی ضرورت پڑے گی۔ ایک مولوی سبحان ہو جائیں گے۔ دوسرا میں اپنے چھوٹے بھائی کو تیار کر لوں گا۔'

ایک وزنی پتھر میرے وجود سے اتر گیا تھا— اس رات دیر تک پتا جی میرے پاس بیٹھے رہے۔ ان کی آنکھیں جل رہی تھیں۔

''چلو، تم خوش ہو۔ شاید اسی میں ہماری خوشی ہے— لیکن تم نہیں جانتے ان مسلمانوں کو— قریب سے دیکھا ہے ان لوگوں کو— یہ آج بھی اسی مغلیہ دور میں جیتے ہیں، جہاں اپنے ہی دیش میں ہم پر جزیہ لگاتے ہوئے، ہمیں دوئم درجے کا شہری بنا دیا گیا تھا— ان کے لیے سب کچھ ان کا دھرم ہے۔ تو پھر ہمارے لیے ہمارا دھرم کیوں نہیں—؟ وہ اپنا پاکستان لے چکے۔ ان کی نفرتوں نے بنگلہ دیش بنوا دیا۔ یہ اپنے بھائیوں کے بھی نہیں ہوتے۔ پھر ہندو کیوں شرماتا ہے اپنے مذہب کی الکھ جگانے میں— ہر بار ایک سیکولر مکھوٹا کیوں پہنتا ہے—؟ ایک بابری مسجد کا موضوع ان سترہ سالوں میں بار بار اٹھتا رہا— اور بنگلہ دیش اور پاکستان میں جو ہزاروں مندر توڑ دیئے گئے، وہاں—؟ دراصل یہاں بھی وہ اسلام کی حکومت چاہتے ہیں۔ یا وہ جہاں بھی ہوتے

ہیں۔ اسلامی حکومت کا خواب دیکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مذہب میں لکھا ہے...... کافروں سے جہاد کرو۔ یہ فدائین دھماکے دراصل جہاد کی ہی شکل ہیں، جسے وہ کبھی کم نہیں کریں گے......'

ایک باپ کھو گیا تھا، سنگھ کا سانپ مذہبی چولے سے سامنے آ گیا تھا — میں ڈر رہا تھا۔ یا شاید حیران ہو رہا تھا — ہم جھوٹ سے الگ نہیں ہوتے۔ جھوٹ ہمارے ساتھ چلتا ہے۔ ہم اپنی خوشیوں کے لیے بار بار جھوٹ بولتے ہیں۔ لیکن جھوٹ اپنی زہریلی زبان دکھا کر ہمیں ڈراتا بھی رہتا ہے۔

یہ وہی دور تھا، جب قصاب کو لے کر ہند پاک کی سیاست گرما چکی تھی — اور ادھر امریکہ، ایٹمی دھماکوں سے آزاد دنیا کا اعلان کرنے والے ہیرو اوبامہ کے ساتھ ایک نئی تاریخ کا گواہ بننے کی تیاری کر رہی تھی — وہائٹ ہاؤس کے 132 کمرے والے محل میں، جسے کبھی 18 ویں صدی کے کالے غلاموں نے مل کر بنایا تھا۔ پہلی بار ایک حبشی صدر کے ذریعے اس محل میں جا کر نئے خوابوں کو پورا کرنے کا وقت آ گیا تھا — یہ خوابوں کو سچ کرنے کا وقت تھا۔ شاید اسی لیے ایک نئے خواب کی بنیاد میں بھی رکھ چکا تھا —

دوسرے دن صبح ہی میں شائستہ کو اپنی کامیابی کی خبر دے دی — گجانند راٹھور عرف آفتاب صدیقی سے تقریباً دو بجے شائستہ کے والد کی ایک رسمی بات چیت ہو گئی اور آئندہ جمعرات رات 8 بجے فون پر نکاح کا وقت مقرر کر دیا گیا۔

جیسا میں نے شروع میں بتایا ہے، میرے لیے سب کچھ کسی پریوں کی کہانی جیسا تھا — راکھشس کے چنگل میں قید پری — شہزادہ جنگل جنگل بھٹکتا ہوا، ہزاروں طلسم سے گزرتا آخر کار شہزادی کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے — لیکن شاید میں بھول گیا تھا۔ پریوں کے کرشمے یا فنتاسی عام زندگی کے کرشمے یا فنتاسی کے سامنے بالکل پھیکے ہیں — شاید میرا اصل چیلنج اب شروع ہوا تھا۔

آخر میں مذہب

جمعرات — شام، ساڑھے سات بجے ہی ہدایت اللہ، مولوی سبحان اور ہدایت اللہ کے چھوٹے بھائی آ گئے۔ ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل چکا تھا۔ صوفے کنارے کر دیئے گئے تھے۔

قالین پر سفید چادر بچھ گئی تھی۔ گئو تکیے لگ گئے تھے۔ اس درمیان پاکستان، شائستہ کے والدین سے دو تین بار بات ہو چکی تھی۔ مجھے آئیڈیا کا اشتہار یاد آ رہا تھا، جہاں ایک موبائل سے گاؤں دیہات کے بہت سارے بچے پڑھ رہے تھے۔ یا ایک نیتا جی کے مال بنائے جانے کے نام پر ملک کے کونے کونے سے رائے مانگی جاتی ہے...... اور عوام کہتی ہے— نا— وہاٹ این آئیڈیا سر جی۔ اور یہاں یہی موبائل— جھوٹ ہی سہی۔ سرحد کی دیواریں توڑ کر دو رشتوں کو ایک بندھن میں باندھنے جا رہا تھا۔

آٹھ بج گئے۔ موبائل کا اسپیکر آن تھا۔ تاکہ نکاح کے الفاظ اور میرے قبولنامے کو وہاں سنا جا سکے— اور لڑکی کے قبول نامے کے لفظ یہاں سب کو سنائی دے سکیں۔ میں نے اپنے دوست فردین کو اس رازداری بھرے جھوٹ میں شامل کیا تھا کہ وہ اپنے موبائل سے اس موقعے کی تصویر لے لے تاکہ اسے ثبوت بنا کر شائستہ کے گھر والوں کو ویزا میں کوئی پریشانی نہ ہو۔

بابو جی سفید کرتے پائجامے میں تھے۔ سر پر ٹوپی— باہر کا دروازہ بند تھا— اس حلیے میں پہلی بار دیکھ کر عجیب سا لگا تھا۔ بابو جی گجانند راٹھور نہیں، جامع مسجد میں نماز پڑھانے والے امام صاحب لگ رہے تھے۔ لباس نے مذہب کا فرق مٹا دیا تھا۔

آٹھ بج گئے۔

ہدایت اللہ نے قرآن شریف کے کلمات پڑھنے شروع کئے...... کمرے کا سناٹا...... ایک بھیانک خاموشی...... آواز گونج رہی تھی...... فردین، بابو جی، مولوی سبحان، ہدایت اللہ کے چھوٹے بھائی...... اور پردے سے جھانکتی ماں۔ میرے لیے ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ لیکن شاید ایک جھوٹ کو پہنتے ہوئے بھی سچ کا احساس ہوتا ہے۔

اسپیکر پر شائستہ کے رونے کی آواز سن رہا تھا...... اُف میں، بھیانک سناٹے میں تھا— جھوٹ اب صرف ایک سچ تھا۔ ہمارے ملک، ہمارے خون سے گزرتا سچ...... وہ زار و قطار روئے جا رہی تھی۔ اسپیکر پر مولوی کی آواز ابھر رہی تھی۔ آپ کا نکاح محمود صدیقی ولد محمد آفتاب صدیقی کے ساتھ دو لاکھ روپے، سکّے رائج الوقت دو معزز گواہوں کی موجودگی میں...... آپ نے قبول کیا......؟'

رونے کی آواز کے درمیان شائستہ کی آواز ابھری— ہاں، قبول کیا......
امام کے تین بار شائستہ سے قبول نامے کے بعد اب میری باری تھی......

میری آنکھیں بند تھیں۔ اب شاید یہ جھوٹ نہیں رہا تھا۔ قبول کرنے کے ساتھ ہی وہ میری زندگی میں آگئی تھی — اس کے رونے کی آوازیں ابھی بھی ٹھہر ٹھہر کر میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

ممکن ہے، دوسروں کے لیے یہ جھوٹ ہو یا ناٹک — لیکن ہمارے لیے زندگی سے کہیں زیادہ — اور یہ بھی سچ تھا، اب وہ مکمل طور پر میری زندگی میں داخل ہو چکی تھی۔

دوسرے دن میں نے نکاح کی فلم، شائستہ کو میل کر دی۔ شائستہ کا فون آیا تھا — وہ چہک رہی تھی۔

'مسز راٹھور بول رہی ہوں۔ اف...... پکّے پاکستانی لگ رہے تھے تم...... ارے اب تو میں تمہاری منکوحہ ہوں۔ کچھ بھی کر سکتے ہو تم۔ لیکن مسٹر ابھی اتنا بے صبر بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ حالات خراب ہیں۔ بڑے بھائی حکومت سے ویزا لینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں امی جان اور فرحان آئیں گے۔ فرحان میرا چھوٹا بھائی ہے۔ ابو کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے اس لیے وہ نہیں آپائیں گے۔ گھبرانا مت۔ ایمرجنسی ویزا مل جائے گا۔'

اور اس کے ٹھیک سات دنوں بعد اس نے خوشخبری دی — 'ویزا مل گیا ہے۔ سات دنوں کا ملا ہے۔ لیکن ابھی ہم چار دنوں میں لوٹ جائیں گے۔ ہمارے پاس صرف چار دن ہوں گے اور یہ چار دن تمہیں سنبھالنے ہیں۔'

●

زندگی، ناٹک یا ڈرامے سے کہیں زیادہ ایک کڑوی سچائی ہے — ہم زندگی میں ایک معمولی سا بھی قدم اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں تو جیسے ایک ناٹک اپنے بھیانک روپ میں ہمیں نئی صورت حال سے آگاہ کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک ہم کامیاب رہے تھے لیکن اب؟ راستے پریشان کن اور الجھے تھے — بھارت آئے ہوئے پاکستانی ایک ایک کر کے واپس بھیج دیئے گئے تھے۔ بیحد ایمرجنسی حالت میں ہی ویزا ملنا ممکن تھا۔ پھر اس فارمالیٹی پورا کرنے کے لیے پولس ویری فکیشن۔ لیکن یہاں بھی ہمارے پڑوسی مولانا سبحان نے مدد کی تھی۔

شائستہ کے بھائی نے وہاں کی ہوم منسٹری دوڑ بھاگ کر کے ویزا حاصل کر لیا تھا اور اب وہ آرہے تھے — پولس انکوائری میں مولوی سبحان نے ساتھ دیا تھا — آفتاب صدیقی ہمارے

کرائے دار ہیں اور اچھے آدمی ہیں۔

ایک بلا ٹل گئی تھی لیکن اصل امتحان ابھی باقی تھا۔ شائستہ کو فرحان سے خطرہ تھا، جس کے بارے میں اس کا شک تھا کہ وہ طالبان جیسی دہشت پسند تنظیم سے وابستہ ہے۔ ظاہر ہے، اس شک کے کچھ بنیاد بھی رہے ہوں گے۔ لیکن اب تک کی ساری مہم اتنی کامیابی سے انجام پائے گی، میں نے سوچا نہیں تھا— شائستہ کے پاس صرف چار دن ہوں گے۔ ان چار دنوں کو زندگی بھر کا ساتھ بنانا تھا۔ اصل زندگی کا جواب شروع ہوا تھا۔ کتنے ہی خیالات آ رہے تھے۔ جا رہے تھے۔ وہ معافی مانگ لے گا— گڑگڑا کر اپنی محبت کی بھیک مانگے گا۔ لیکن وہ ایک جھوٹ کو کیوں تسلیم کریں گے—؟

پھر؟

اگر وہ شائستہ کو ساتھ لے کر چلے گئے تو—؟ تو کیا ان حالات میں اس کا پاکستان جا کر شائستہ کو لانا ممکن ہے—؟ شاید نہیں۔ صرف ایک ہلکی سی امید کہ پیار جیت جائے— جیسے مولوی سبحان یا ہدایت اللہ نے اس پیار کی عظمت کو دہشت گردانہ کارروائیوں پر ترجیح دی— شاید شائستہ کی امی جان کا دل بھی پسیج جائے۔

لیکن ابھی سب سے بڑی الجھن تھی، ان چار دنوں میں اس کے گھر والوں کا مسلمانوں کی طرح رہنا اور تواضع کرنا— کیا یہ ممکن ہو سکے گا؟

لیکن یہ ممکن کرنا پڑے گا— قدم قدم پر احتیاط برتنی ہوگی۔ ذرا بھی لاپروائی اور خطرہ سامنے— اور خطرہ بھی ایسا کہ ان نازک اور سیاسی حالات میں، معاملات کے بے حد بگڑ جانے کا خطرہ بھی سامنے تھا۔

ایک ہندو گھر کو مسلمانی گھر بنانے کا کام جاری تھا— دیوار پر ٹنگے دیوی دیوتاؤں کے کلینڈر چھپا دیئے گئے تھے— اسلامی کلینڈر دیواروں پر جگہ جگہ لگا دیئے گئے— پوجا والا کمرہ بند کر دیا گیا— بابو جی تو سفید کرتا اور پائجامہ پہن کر مسلمان بن جائیں گے اور ماں؟

مشکل ماں کی تھی۔ ماں سیندور پوچھنے، منگل سوتر اتارنے کو راضی نہیں تھی— مر جاؤں گی لیکن نہیں اتاروں گی— لیکن بابو جی کے سمجھانے پر ماں، عارفہ صدیقی بن گئی تھی۔ شلوار جمپر— سر پر آنچل ڈالے— اپنے گھر میں ہو کر بھی، جیسے ہم کسی اجنبی گھر میں تھے— کہاں سے ہندو تھے ہم......؟ گھر کی دیواروں سے لے کر پہناوے تک— کہاں ہیں ہم؟ بس

لباس یا پہناوے کی حد تک؟ لیکن ایک مشکل اور تھی۔ گھر میں نان ویج نہیں کھایا جاتا تھا۔ بابو جی اور ماں اس کی بو تک سے پرہیز کرتے تھے۔ یہ ذمے داری مولوی سبحان نے قبول کر لی تھی۔ میرے گھر سے آ جائے گا۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کو بتایا تھا— گجانند بابو کے یہاں، ان کے بچپن کے پاکستانی دوست آ رہے ہیں۔

'اس ماحول میں— ؟ ممکن ہے، ان سے پوچھا گیا ہو، لیکن جواب آسان تھا— دوست تو کسی بھی ماحول میں آ سکتے ہیں۔ دشمن تھوڑے ہی آ رہے ہیں۔'

ہمارے طرف سے ساری تیاری مکمل تھی۔ لیکن احتیاط برتنے کے باوجود بھی خطرے کا پہلا سائرن اس وقت بجا، جب گاڑی گھر کے دروازے پر داخل ہوئی— دروازے پر انگریزی میں گجانند راٹھور کی نیم پلیٹ لگی تھی— اس نیم پلیٹ کے بارے میں ہم نے اس سے پہلے غور نہیں کیا تھا— مگر حادثہ ہو چکا تھا۔ چھ بجے صبح یہ لاہور بس سے چلے تھے اور شام چھ بجے لاہور سے چلنے والی بس انہیں دلّی گیٹ چھوڑ گئی تھی۔ میں گاڑی لے کر پہلے ہی ان کے استقبال کے لیے کھڑا تھا— مگر شائستہ کو چھوڑ کر امی جان یا فرحان دونوں میں کہیں وہ گرمجوشی نہیں تھی، شاید میں جس کی امید کر رہا تھا۔

گاڑی چلاتے ہوئے میں نے شائستہ کی طرف دیکھا، وہاں قندیل کی طرح روشن مسکراہٹ کے ساتھ ایک گھبراہٹ بھی چھپی تھی۔

گاڑی کے گھر پہنچنے تک سناٹا ہی رہا۔ کسی نے کوئی بھی ذکر چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب گاڑی چرمرا کر گھر کے دروازے پر رک گئی تھی۔

'گجانند راٹھور......' فرحان کے چونکنے کی باری تھی۔

مجھے دن میں آسمان کے تارے نظر آ گئے— یہ انہیں کا فلیٹ ہے۔ ہم کرائے میں رہتے ہیں۔'

'اوہ......!'

شائستہ کے بے حد پیارے معصوم چہرے پر سناٹا چھایا ہوا تھا— امی جان غور سے ہماری طرف دیکھ رہی تھیں۔

'اپنا مکان نہیں ہے؟'

'ہو جائے گا۔ جلد ہی......'

گاڑی رکنے کی آواز کے ساتھ ماں نے دروازہ کھول دیا تھا۔

فرحان، بابو جی کے گلے ملا۔ علیک سلیک، ہونے کے بعد یہ لوگ صوفے پر بیٹھ گئے۔ دیوار پر لٹکے اسلامی کلینڈر کو دیکھتے رہے۔

'پہلے ناشتہ یا چائے — یا آپ لوگ فریش ہونا پسند کریں گے —؟'

شائستہ کی امی کے چہرے پر ناراضگی کے آثار اب بھی برقرار تھے، جیسے اس شادی میں ان کی رضامندی شامل نہیں ہو۔

'دونوں بھائی بہت پیار کرتے ہیں اس سے۔ ورنہ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا......'

شائستہ سہمی ہوئی تھی۔

فرحان پوچھ رہا تھا۔ 'یہاں تو مسلمانوں پر بہت ظلم ہوتا ہے۔ آپ لوگ کیسے برداشت کر لیتے ہیں اتنا ظلم......؟

بابو جی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، میں نے روک دیا —

'ظلم تو نہیں ہوتا......'

'نہیں ہوتا —؟ بابری مسجد توڑ دی — گودھرا میں اتنے ظلم ڈھائے — ظلم اور کیا ہوتا ہے......؟'

وہ طالبان کی زبان بول رہا تھا۔

'بابو جی خود کو روک نہیں پائے — آپس میں لڑائی تو ساری دنیا میں چلتی ہے۔ بابری مسجد مسمار ہوئی تو اخبار سے میڈیا سب نے خوب خبر لی — مسلمان یہاں اپنی پوری آزادی کے ساتھ رہتے ہیں۔'

'وہی۔ آپ لوگ شاید ایک خاص طرح کی سینسر شپ میں جیتے ہیں۔ اس لیے ملک کے خلاف بولنے کی آزادی نہیں۔'

'ایسا نہیں ہے......'

ٹھیک یہی وقت تھا، جب پاس کے مندر سے گھنٹہ بجنے کی آواز سنائی پڑی —

شائستہ کی امی چونک پڑی — یہاں پاس میں مندر ہے؟'
فرحان نے پوچھا — 'آپ مندر کے سائے میں رہتے ہیں؟'
'بھارت مسجدوں اور مندروں کا شہر ہے۔ قدم قدم پر مندر — بابو جی بولتے بولتے رہ گئے...... میں بابو جی کی بے بسی اور لاچاری سمجھ رہا تھا۔
ماں چپ تھی۔ نظریں بچا بچا کر وہ سہمی ہوئی شائستہ کو دیکھ رہی تھی —
'مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ یہاں پاس میں کوئی مسجد ہے؟'
فرحان کے اس اچانک سوال سے ہم سب جیسے سناٹے میں آ گئے تھے......
'نہیں ہے......' — میرا لہجہ ڈرا ڈرا سا تھا......
'کوئی بات نہیں۔ گھر میں نماز پڑھ لیں گے۔ پچھم کدھر ہے؟'
شائستہ کی امی، ماں سے پوچھ رہی تھیں......
ہمارے دل ڈوب سے گئے تھے —
ماں چپ تھی۔ ہونٹوں پر تالا۔ اس نئی مصیبت کے بارے میں تو ہم نے غور بھی نہیں کیا تھا......
فرحان کی آنکھوں میں شک کے سائے گہرے ہو گئے تھے...... 'آپ لوگ نماز نہیں پڑھتے کیا؟'
شائستہ کی امی کہہ رہی تھیں — 'وہاں سنا تھا، بھارت کے لوگ غیر مذہبی ہوتے جا رہے ہیں۔ نماز اور قرآن سے کوئی مطلب ہی نہیں...... ناراضگی اب آہستہ آہستہ ظاہر ہو رہی تھی۔
'ہم وضو کریں گے۔ پھر مغرب کی نماز۔ پھر تلاوت کریں گے...... قرآن شریف تو گھر میں ہوگا ہی —' وہ ماں سے پوچھ رہی تھی — 'غسل خانہ کہاں ہے — جا نماز نکال دیجئے۔ تلاوت کے بعد ہی ہم چائے ناشتہ کریں گے، پھر باتیں کریں گے......'
فرحان، شائستہ اور امی جان کو ان کا کمرہ دکھا دیا گیا تھا — باہر ہم تینوں سکتے میں تھے — ایک دوسرے سے نظر ملاتے ہوئے بھی گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔

•

وہ بھیانک رات گزر گئی۔ مولوی سبحان کے گھر سے جائے نماز اور قرآن شریف ان کا

چھوٹا بیٹا لے آیا تھا اور یہ بات فرحان اور امی جان پر ظاہر ہو گئی تھی۔ رات کھانے کے بعد امی جان نے مختصر میں اپنا فیصلہ سنایا۔

'فون پر نکاح کو ہم صرف ایک رسم مانتے ہیں۔ یہاں آ کر آپ کا گھر گھرانا اور ماحول دیکھنا تھا — محمود میاں کو پاکستان آنا ہوگا — تبھی ہم شائستہ کی رخصتی کر سکیں گے۔

رات جیسے کمرے میں ڈھیر ساری چمگادڑیں جمع ہو گئی تھیں۔ میں جانتا تھا، شائستہ کی امی اور فرحان گھر کا ماحول دیکھ کر خوش نہیں تھے۔ جیسے جبراً بیٹی کی ضد میں ہندستان تو آ گئے، لیکن اب اس آنے پر افسوس ہو رہا ہو — فرحان بار بار بھارت پاک دشمنی کے تذکرے لے کر بیٹھ جاتا — یا پھر کشمیر کی باتیں کرتے ہوئے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں — بابو جی کے لیے یہ سب برداشت کرنا ممکن نہیں تھا لیکن وہ برداشت کیے ہوئے تھے۔ رات کسی طرح کٹ گئی۔ لیکن صبح یعنی دن کا وقت دھماکے جیسا تھا —

ماں نے علی الصباح نظریں بچا کر پوجا والا کمرہ کھول دیا تھا — وہ اپنی پوجا میں مصروف تھیں...... کہ اچانک چونک گئیں۔

دروازے پر لال لال آنکھیں لیے فرحان اور شائستہ کی امی جان کھڑے تھے۔

'تو ہمیں بیوقوف بنایا گیا۔ آپ لوگ مسلمان نہیں ہندو ہیں......'

پھر جیسے ایک کے بعد دوسرے دھماکے ہوتے چلے گئے۔

●

ڈرائنگ روم میں سب اس وقت ایسے بیٹھے تھے، جیسے کسی کی میت میں آئے ہوں — ایک طرف دونوں گھر والے تھے۔ دوسری طرف سر جھکائے مولوی سبحان......

'دھوکہ —'

فرحان کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ 'اتنا بڑا دھوکہ...... مجھے کل ہی شک ہو گیا تھا۔ لیکن جھوٹا نکاح — ؟ اسلام کی بے حرمتی ہم گوارا نہیں کریں گے۔'

شائستہ کی آنکھیں روتے روتے پھول گئی تھیں۔

'ہم پولس میں جائیں گے۔ ایف آئی آر درج کرائیں گے۔ دھوکے بازوں کا ملک ہے یہ۔ اتنا بڑا دھوکہ — میرے لیے یہ بات موت سے زیادہ بھیانک ہے کہ میں ایک کافر کے یہاں ہوں۔'

'ہم ہی بے وقوف تھے، جو اس بے حیا کے بہکاوے میں آ گئے — تھوڑی سی جانچ پڑتال کر لیتے تو شاید اصلیت سامنے آ جاتی۔ نوج یہ نیٹ چیٹنگ جو نہ کرائے۔ بے شرمی کا اکھاڑا ہے......'

''تو پولس کے پاس جائیں گے آپ؟' کافی دیر بعد مولوی سبحان نے منہ کھولا......'الحمد للہ۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ سچ اور جھوٹ کے معنی جانتا ہوں۔ لیکن میں دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ ان بچوں نے جو کیا وہ گناہ نہیں۔ کتنا مذہب جانتے ہیں آپ —؟ ہندوستانیوں کا مذہب کیا پاکستانیوں کے مذہب سے الگ ہے —؟ وہی اسلام جو میرے دل میں ہے، وہی آپ کے دل میں ہے — اور اسلام نفرت نہیں، محبت سکھاتا ہے — دلوں کو توڑنا نہیں جوڑنا سکھاتا ہے۔ میں ابھی بھی اپنی بات پر قائم ہوں کہ ان دونوں نے جو کچھ کیا، وہ ذرا بھی غلط نہیں ہے۔'

'اس لیے کہ آپ بھی اس سازش میں شامل تھے — وہ بھی ایک مسلمان ہو کر — شریعت کا پاس ہونا چاہئے — آپ نے جو کچھ کیا وہ نا قابل معافی ہے۔' فرحان کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ 'اتنا بڑا فریب شاید یہ سوچ پانا بھی میزائل کے پھٹنے جیسا ہے۔'

'تو آپ پولس کے پاس جائیں گے۔ فریاد لے کر۔ اور پولس آسانی سے اس پریم کہانی کو سچ مان لے گی؟ ایسے ماحول میں جہاں تلوار سر پر منڈرا رہی ہے۔ جنگ کا ماحول ہے۔ ممبئی پر فدائین حملہ ہو چکا ہے اور ہندوستانی حکومت کے پاس ایک مضبوط ثبوت بھی ہے۔ ایسی صورت میں آپ جانتے ہیں پولس کے پاس جانے کا مطلب —؟ ایمرجنسی ویزا، مشکل حالات میں آپ کی آمد — ان سب کو دہشت گردانہ کارروائیوں کی نظر سے دیکھا جائے گا — جائیے پولس کے پاس......'

جیسے اچانک آنکھوں کے آگے کی دھند آپ کو ایک نہ ختم ہونے والے اندھیرے میں دھکیل دیتی ہے۔ میں جیسے اچانک صفر میں دھکیل دیا گیا...... میں نے پلٹ کر دیکھا۔ شائستہ کی آنکھوں کے آنسو اس کے گال پر جمع ہو گئے تھے۔ آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں — جیسے ڈاکٹر

نے سہارا دیتے دیتے جواب دے دیا ہو......

'ہم سب پھنسیں گے...... پولس میں جانے کے بعد کوئی نہیں بچے گا......' بابو جی کمرے میں ٹہل رہے ہیں۔

'میں بھی سنگھ کا آدمی ہوں۔ ایک کٹر اور مذہبی انسان۔ لیکن کیا کٹر پن بچوں کی خوشی سے زیادہ معنی رکھتی ہیں۔'

پہلی بار بابو جی کی آنکھوں میں آنسو تھے — 'میں نے بس ان بچوں کی خوشی کے لیے یہ بھی سوچ لیا تھا — سیاست کی عمر نہیں رہی اب۔ سنیاس لے لوں گا۔ سنگھ کی سبھاؤں میں جانا بند...... سچ اگر لاکھوں لوگوں کی جان لینے سے زیادہ بھیانک ہے تو ہم ایک سچ کے لیے آگے کیوں نہیں آسکتے —'

'دھوکہ......' فرحان کمرے میں ٹہلتا ہوا بے چین تھا — 'ہم ایک اجنبی دیس میں چند کافروں کے درمیان اپنی غلطی سے پھنس گئے ہیں۔ ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ پولس کے پاس گئے تو شاید وہ ایک نیا قصاب ڈھونڈ لے گی......'

'ہماری پولس ایسی نہیں ہے۔' شاید پہلی بار مجھے احساس ہوا تھا، مجھے بولنا چاہئے — 'شائستہ نے یہ ساری لڑائی صرف میرے لیے لڑی ہے۔ اس وقت پاکستان جیسے ملک سے ساری بندشوں کے باوجود اگر یہاں تک آنے کی ہمت جٹائی ہے تو صرف میرے لیے — لیکن شاید تاریخ کے سارے بے رحم اوراق میں ہمیشہ سے پیار کو شکست ملتی رہی ہے۔'

'مجھے معاف کر دیجئے...... شائستہ کو بھی......' الفاظ ٹوٹ رہے تھے۔ صرف آنکھیں ظاہر کر رہی تھیں...... ہونٹ لرز رہے تھے...... ''ہم نے سوچا تھا — سب ٹھیک ہو جائے گا...... ملک کی تقسیم نے سب ٹھیک کر دیا تھا نا —؟ دو ملک — دو الگ ملک — اپنی جگہ چین سے زندگی گزارنے والے دو ملک۔ لیکن کہاں سب ٹھیک تھا —؟ 61 برسوں میں سب ٹھیک کہاں ہوا — لڑتے ہی رہے ہم — نفرت بوتے رہے — نفرت کی فصلیں کاٹتے رہے...... نفرت بھلا کیوں نہیں سکتے ہم......؟'' میں نے آنسو پونچھے — 'بتایئے کیا راستہ ہے؟ راجندر راٹھور سے سچ مچ محمود صدیقی بن جاؤں تو —؟ آپ مجھے پاکستان بلا کر شائستہ مجھے سونپ دیں گے۔'

'نہیں — ' امی کا لہجہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

'پھر راستہ بتایئے۔ حل نکالیے......' آنسو ایک بار پھر آنکھوں میں سمٹ آئے تھے —

'ہم نے سوچا تھا سب ٹھیک ہو جائے گا— یہاں آپ کے آنے کے بعد آپکے پاؤں پر گر کر ہم معافی مانگ لیں گے— آپ بدلتے وقت کے ساتھ ہمارے پیار کی گہرائی کو سمجھیں گے اور معاف کر دیں گے......'

الفاظ ٹھہر گئے ہیں۔

میں کمرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ دیوار پر جھولتے اسلامی کلینڈر میں ایک بچہ قرآن کی تلاوت کر رہا ہے۔ مکہ اور مدینہ کی تصویریں— صرف کمرہ بدلا ہے— ہم حالات نہیں بدل سکتے۔ لیکن برسوں کی تہذیب سے جڑنے کے بعد کسی نئے فیصلے کی حمایت میں ہی سہی، کمرہ ایک نئی تہذیب تو اوڑھ سکتا ہے—؟ پھر حالات کیوں نہیں بدلے جا سکتے......

اور یہ وہی نازک وقت تھا، جب افغانستان اور پاکستان سے طالبان کے فتوے آ گئے تھے۔ لڑکیوں کو پڑھانا منع ہے۔ باہر سڑک پر نکلنا، غیر مردوں کو دیکھنا......اور ایسے تمام فتووں میں عورت کی بغاوت کی سزا موت تھی۔ عورت ایک بار پھر پندرہویں صدی میں پہنچ رہی تھی۔ شاید شائستہ کی بغاوت کو بھی اسلامی شریعت سے جوڑ کر دیکھا جائے گا......

موت......موت......

صرف موت کا جان لیوا احساس رہ گیا تھا۔ شاید ہم ہار چکے تھے—

امی چپ تھیں—

شائستہ کی سسکیاں گونج رہی ہیں—

بابو جی ادھ مرے سے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ماں کی آنکھوں کی پتلیاں بے جان ہو چکی ہیں......

فرحان نے فیصلہ سنا دیا۔

''ہم ابھی جائیں گے یہاں سے۔ اب یہاں رکنا مناسب نہیں۔ اور ہاں، محبت جیسی کسی چیز کا واسطہ دے کر ہمیں روکنے کی کوشش مت کیجئے— ہم بے شرمی اور بے حیائی جیسی چیزوں کو غیر اسلامی اور غیر اخلاقی مانتے ہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔''

'ایک منٹ......'

شائستہ اپنی جگہ سے اچھلی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح جل رہی تھیں۔

'یہ نکاح آپ کے لئے جھوٹا سہی۔ میرے لیے نہیں ہے۔ اس لیے خود کو محمود کی منکوحہ سمجھتے ہوئے میں اس سے دو منٹ اکیلے میں باتیں کرنا چاہتی ہوں......'

فرحان نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ لیکن امی جان نے خاموش اجازت دے دی۔

کمرے میں اس وقت صرف ہم دونوں تھے — لاچار، بے بس — خوفزدہ — شائستہ نے مجھے بانہوں میں لیا۔ میرے ہونٹوں پر اپنے ہونٹوں کی آگ رکھ دی۔ پھر جدا ہوئی —

'گھبراؤ مت۔ تمہاری بیوی ہوں اب — کوئی گناہ نہیں کیا میں نے — اور وقت گواہ ہے — دشمنی اور دہشت کے ایسے ماحول میں — ہم نے ایک دوسرے کو چنا...... اور جو کچھ ہم کر سکتے تھے...... ہم نے کیا......'

'لیکن وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔ بے شرمی اور بے حیائی کے مظاہرے کی سزا وہاں صرف موت ہے۔'

وہ مسکرا رہی تھی...... 'تم سے الگ ہو کر زندہ بھی کہاں ہوں۔ مگر اس غلط فہمی میں مت رہنا کہ وہ شائستہ فہیم خاں کو پاکستان لیے جا رہے ہیں — میں اپنا جسم، اپنی روح یہیں چھوڑے جا رہی ہوں...... تمہارے پاس......'

وہ جھٹکے سے مڑی۔ پھر باہر نکل گئی......

میں بت بنا اپنے ہونٹوں پر اس کے ہونٹوں کے ذائقے کو ہمیشہ کے لیے اپنے اندر محفوظ کرتا رہا...... باہر ٹھنڈ بڑھ گئی تھی...... لوگ چلے گئے تھے — بھیانک تنہائی اور سناٹے کا احساس ہو رہا تھا مجھے۔ آنکھوں کے آگے دھند کی ایک گہری لکیر دور تک بچھ گئی تھی...... لیکن اس دھند میں ابھی تک شائستہ فہیم خان کے چہرے کو میں اندر تک محسوس کر سکتا تھا...... 'میں اپنا جسم اپنی روح یہیں چھوڑے جا رہی ہوں تمہارے پاس......'

کہانی ختم ہو چکی تھی — لیکن شاید کہانی کا ایک بے جان حصہ ابھی باقی تھا — یہ وہی وقت تھا جب ہندوستان، پاکستان پر دہشت گردوں کو ہندوستان بھیجنے کا دباؤ بڑھا رہا تھا...... اور بدلے میں پاکستان اپنی پالیسی میں الجھا ہوا تھا — میں نے ایک چھوٹا سا خط ہوم منسٹری کو بھیجا......

جس میں صرف اتنا لکھا تھا— 'عزت مآب— ملک کا ایک شہری ہونے کے ناطے یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں— اکثر اخباروں میں پڑھتا ہوں۔ سنتا ہوں کہ آپ لوگ پاکستان سے دہشت گردوں کو سونپنے کی مانگیں کرتے رہے ہیں— میں جانتا ہوں، پاکستان ایسا نہیں کرے گا— بدلے میں پاکستان بھی اسی طرح کی کچھ مانگیں آپ کے سامنے رکھتا آیا ہے— یہ خط بے حد تکلیف دہ الفاظ کے ساتھ لکھ رہا ہوں— کہ میری محبت شائستہ فہیم خاں، ولد مرزا فہیم خاں، میر قاسم محلّہ، لاہور پاکستان میں ہے۔ آپ دہشت گرد مانگتے ہیں وہ نہیں بھیجتے— کیا ایک بار میری بات پر غور کرتے ہوئے آپ ان سے ایک محبت کے لیے اپیل نہیں کر سکتے—؟ صرف ایک بار— شاید اس کے جواب میں وہ بھی ایسی ہی محبت آپ سے مانگ بیٹھیں— پھر ممکن ہے محبتوں کا یہ سلسلہ دور تک چل نکلے—'

میں گہری سوچ میں ڈوبا تھا...... اور ظاہر ہے، اس وقت بھی میری آنکھوں میں شائستہ کی صورت جھلمل جھلمل کر رہی تھی— بہت اندھیرے کے باوجود میں ابھی اس لڑائی کو بند نہیں کرنا چاہتا تھا......

●❖●

اس بار نہیں

"اس بار نہیں/اس بار جب میں اپنے چہرے پر درد لکھا دیکھوں گا/ نہیں گاؤں گا کوئی گیت/ تکلیف بھلا دینے کے لیے/ اس بار زخموں کو دیکھنا ہے غور سے/ تھوڑے لمبے وقت تک/ کچھ فیصلے/ کہیں تو شروعات کرنی ہوگی/ اس بار یہی طے کیا ہے/

پرسون جوشی کی ایک کویتا سے

مہا بھارت میں یکشیہ، یدھشٹر سے پوچھتے ہیں— تمہیں اس دنیا میں سب سے انوکھی بات کیا لگتی ہے۔ یدھشٹر کہتے ہیں۔ سب جانتے ہیں، موت ہی سچ ہے۔ سب کو ایک دن مرجانا ہے۔ لیکن سب ایسے جیتے ہیں گویا کبھی نہ مرنے کے لیے اس دنیا میں آئے ہوں۔

اس وقت شام کے ساتھ بجے ہوں گے۔ آفس رسپشن پرٹی وی دیکھنے والوں کی بھیڑ جمع تھی۔ سیریل بم بلاسٹ۔ مارے گئے فدائین کے چہرے بار بار کیمرے کے آگے چمک رہے تھے۔ اینکر زور زور سے چلاّ رہا تھا۔ پولس تفتیش کر رہی ہے۔ دھماکے کرنے سے پہلے ان کے ٹھکانے کون کون سے تھے۔ یہ کہاں سے آئے تھے۔ اعظم گڑھ سے کشمیر اور پاکستان تک، اینکر دہشت گردوں کے تار جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں— چہرہ زرد— بدن میں کاٹو تو خون نہیں۔ وہ

سر سے لے کر پاؤں تک لرز رہا تھا۔ جس وقت جینی سے اس کی نظریں ملیں، وہ جیسے اندر تک ننگا ہو چکا تھا۔ وہ ایک سکنڈ بھی وہاں ٹھہرا نہیں۔ سرعت سے باہر نکل گیا۔ جینی کو کچھ عجیب سا لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اس کے چہرے کا تاثر پہچان گئی تھی۔ وہ تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔

'سنو تو۔'

باہر شام کی سیاہی چھا چکی تھی۔ سڑک پر گاڑیاں دوڑ رہی تھیں۔ آفس سے دو قدم سگریٹ والی گمتی کے پاس وہ کھڑا تھا۔

جینی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ پریشان — اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی —

'اس طرح بھاگ کر کیوں آ گئے۔ پاگل ہو — یہ میں بھی جانتی ہوں کہ وہ تم نہیں ہو —'

اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ دھویں کے چھلوں میں اس کا بے جان اور سپاٹ چہرہ کسی مردہ کی طرح نظر آرہا تھا۔

'کیا کسی نے کچھ کہا۔ کوئی تبصرہ کیا؟ نہیں نا —' آہستہ سے جینی نے اس کا ہاتھ تھام لیا — صرف اس لیے کہ آتنک وادیوں کے نام تمہارے ناموں کی طرح ہوتے ہیں...... وہ زور سے چلائی — پاگل مت بنو۔ خود کو کمزور اور جذباتی کرتے ہوئے کہیں نہ کہیں تم ان لوگوں کا ساتھ دیتے ہو۔ کوئی بھی پڑھا لکھا آدمی ان کے نام پر تمہیں یا عام مسلمان کو شک کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا — سمجھ رہے ہو نا تم۔'

آخری جملہ اس نے قدرے پیار سے ادا کیا تھا — 'بس اب اندر چلو اور ہاں — زیادہ سگریٹ پینا صحت کے لیے نقصان دہ ہے......'

تھوڑی ہی دیر بعد دونوں آفس کی کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے — جینی کی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

'سنو سلیم درگاہی۔ اپنے اندر کے ڈر کو باہر نکالو۔ جب وہ اسلام یا مسلمان کہتے ہیں تو یہ تم نہیں ہوتے۔ تم کیوں نہیں سوچتے اس سطح پر۔ جیسے سنگھ، بجرنگ دل یا ہندوتو کے معنی جب میڈیا سمجھاتا ہے تو وہ میں نہیں ہوتی — میں جینی کشواہا۔ آتنک، ورلڈ مارکیٹ کا ایک پروڈکٹ ہے، جس کی آڑ لے کر طاقتور ملک اپنی سیاست کی روٹیاں سینک رہے ہیں۔ پھر چاہے وہ بش ہوں یا اوباما۔

لیکن جیسے اسے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں بے جان اور سرد تھیں۔

وہ چہرہ۔ وہ چہرہ اس کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا۔ وہ اس معصوم چہرے کی زد میں تھا۔ وہ بڑی بڑی اندر اتر جانے والی آنکھیں جیسے اس کے اندر اندر سما گئی تھیں۔

جینی نے خاموشی سے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔ اس نے بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

'چلو۔ ویستا میں چل کر بیٹھتے ہیں۔'

لیکن جیسے کوئی آہٹ نہیں — آواز کی گونج نہیں — سناٹا اور سناٹے میں وہی چہرہ اس کی آنکھوں کی پتلیوں پر فریز ہو گیا تھا۔ چھوٹے بال پیشانی تک پھیلے ہوئے — سانولا رنگ۔ چہرے پر کیپ یا ہیٹ جیسی کوئی چیز نہیں۔ کالے کپڑوں میں دایاں ہاتھ تھوڑا سا اٹھا ہوا۔ تصویر شیشے کے پیچھے سے لی گئی ہے۔ جب اس کی ایک چھوٹی سی جھلک عمارت سے کافی فاصلے پر زمین لیے بہت سارے چینلس نے ایک ساتھ لی تھی — جب وہ کچھ دیر کے لیے شیشے نما کیبن میں نظر آیا تھا۔ بائیں ہاتھ میں اے کے فوٹی سیون — دائیں ہاتھ کی کلائی میں بندھی ایک کالی پٹی۔ عمر یہی کوئی پچیس سے ستائیس برس۔

اندھا دھن چلتی گولیوں کے درمیان جیسے میڈیا کو ایک بڑی، سب سے بڑی بریکنگ نیوز مل گئی تھی۔ مگر وہ چہرہ — اس کی آنکھیں ایک پل بھی اس چہرے سے ہٹ نہیں رہی تھیں —

'یہ تم نہیں ہو۔ سمجھے تم۔' جینی ایک بار پھر غصے سے بولی — اس بار پلٹ کر اس نے جینی کو دیکھا۔ یہ میں ہی ہوں جینی۔ بس، الگ الگ بھیس میں میں ہی ہوں — اس کا گلہ رندھ گیا تھا۔

'ایک خاموش تماشائی بن گئے ہیں ہم۔ جن کی اوقات ایک جوکر سے زیادہ نہیں ہے۔ ہر بار گولی عام آدمی کو نہیں لگتی، ہمیں لگتی ہے۔ سیدھے یہاں دل میں۔ ہر بار جیسے پاگل کر دینے والے سوال ہمارا راستہ روک لیتے ہیں۔ ارے یہ بھی ہم۔ یعنی یہ بھی مسلمان — ارے گولی کہاں چلی — برفیلی پہاڑیوں میں — وہاں بھی کوئی اظہر یا سلیم ہی ملے گا — واردات نیپال میں ہو، یا کوہ قاف کی پہاڑی میں — کرنے والا مسلمان ہوتا ہے۔ اور یہاں پھٹتی ہے ہماری۔ کانپ ہم جاتے ہیں۔ بل میں دبکتے ہیں ہم — چاہے سڑک پر جاتے کسی نہتے پر گولی چلے۔ سندھ میں یا اکشر دھام میں۔ بھیڑ بھاڑ والے علاقے میں یا تاج میں۔ یہ فدائین سالے.....' اس نے غصے میں گندی گالی بکی۔ یہ تو صرف ایک بار پولس کی گولی سے مر جاتے ہیں۔ اور یہاں ہم۔ بار بار مرتے رہتے ہیں۔ تمہیں وہ فلم یاد ہے۔ جس میں ایک انگریز ایک مسلمان سے کہتا ہے — سوال

یہ نہیں ہے کہ ہر مسلمان دہشت گرد نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہر دہشت گرد مسلمان کیوں ہوتا ہے— ٹی وی کسی کے گھر سلنڈر پھٹنے کی بھی خبر دیتا ہے نا— تو لگتا ہے یہ کام بھی ہم نے کیا ہے— پھٹ جاتی ہے ہماری......'

لیکن کون بول رہا تھا؟ کس سے؟ کیا وہ خود سے بول رہا تھا— اس نے دیکھا— جینی پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے— ''چلو اٹھو۔ چائے بھی نہیں پی تم نے۔ تمہارے ہاتھ گرم ہیں۔ گھر چلے جاؤ۔ میں بھی آج چھٹی کرلوں گی۔ تمہارے پاس آجاؤں گی۔''

گھر؟ کون سا گھر؟ وہ گھر نہیں جائے گا۔ یہ سوچ لیا ہے اس نے۔ لیکن وہ کہاں جائے گا۔ کس کے گھر؟ جینی کے گھر بھی نہیں۔ وہاں اس کے پیرنٹس رہتے ہیں اور وہ جانتا ہے۔ جینی کے پیرنٹس اس کی اور جینی کی دوستی کو پسند بھی نہیں کرتے۔ جینی نے ایک بار کافی پیتے ہوئے مذاق بھی کیا تھا۔ میرے ممی ڈیڈی تو تمہیں داماد بنانے سے رہے۔ جانتے ہو۔ تمہارے بارے میں ان کی کیا رائے ہے۔ مسلمان بھروسے مند نہیں ہوتے— معصوم لوگ— انہی خبروں پر رہتے ہیں، جو سنتے ہیں اور دیکھتے ہیں— اور بس ایک عام سی رائے کسی کے بارے میں بُن لیتے ہیں۔ لیکن مجھے غصہ نہیں آیا—''

'کیوں؟'

''کیونکہ وہ ان لاکھوں کروڑوں لوگوں میں سے ایک ہیں جو اپنے دماغ سے سوچتے ہیں نہ اپنے دماغ سے کوئی فیصلہ لیتے ہیں— وہ وہی سوچتے ہیں، جو اخبار، میڈیا اور چینلس ان کے دماغ میں ڈالنا چاہتے ہیں— پور فیلوز......''

''لیکن کیا صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ وہی سوچتے ہیں جو انہیں سوچنے پر مجبور کیا جاتا ہے؟ جب ایک دن ایسا سوچنے والوں کی ایک بہت بڑی جماعت بن جائے گی تو؟ وہ ہنسا تھا— اس وقت ہم تم جیسے اقلیت میں ہوں گے— یہ ہمیں پاکستان بھیج چکے ہوں گے۔''

جینی سنجیدہ ہوگئی تھی— ''کیا کروں میں سلیم درگاہی، یہ پیرنٹس ہیں میرے۔ زیادہ بولتی ہوں تو زمانے کی اونچ نیچ ہمیں سمجھانے لگتے ہیں۔ اتنا جانتی ہوں کہ برے نہیں ہیں وہ— لیکن ایسا سوچنے والے اگر اپنی فکر کا دائرہ اسی طرح بڑھاتے رہے تو— ایک دن خطرناک بھی بن سکتے ہیں۔''

اس نے ایک بار پھر بات کو پلٹتے ہوئے کہا تھا—

''ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے؟
''نہیں۔''
''سر کے بال جھڑنے لگے ہیں تمہارے— دیکھو— یہاں سے ...... اور یہاں سے...... اف...... پھر میرے علاوہ کوئی پیار کرنے والا بھی نہیں ملے گا تمہیں۔'' وہ شرارت سے بولی تھی— ''ایک ہیٹ لے آؤ— ہیٹ پہن کر اچھے لگو گے تم— میرا کہا مان لو، بولو تو میں ہی لے آؤں— ایک خوبصورت سا ہیٹ—''

جینی کی یہ ہمیشہ سے عادت تھی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو اچانک کسی مذاق سے جوڑ دینا— لیکن اس دن گھر آنے کے بعد شیشے میں دیر تک وہ خود کو دیکھتا رہا— شاید جینی ٹھیک کہتی ہے۔ ایک ہیٹ کی ضرورت ہے اسے— مسکرانے کی کوشش کی تھی اس نے...... مگر عمر کے بڑھتے احساس کو تو نہیں روک سکتا۔

ایک بار پھر وہ اسی دھواں دھواں منظر کی زد میں ہے— کہاں جائے؟ گھر؟ اس کا اپنا گھر؟ کرایے کے دو کمرے کے فلیٹ کو! اگر گھر کہا جا سکتا ہے تو...... بے شک وہ بھی ایک گھر ہے۔ جہاں سر چھپا لیتا ہے وہ— خالی وقت میں اپنے لیے آم لیٹ اور چائے تیار کر لیتا ہے— مگر یہ کمرہ بھی کتنی مشکل سے ملا تھا۔ دلّی کے ان پانچ برسوں میں کتنے فلیٹ بدلے تھے اس نے۔ کوئی واردات ہو جاتی اور بد قسمتی سے اسے نئی پناہ گاہ تلاش کرنے کی نوبت آ جاتی تو...... جیسے آنکھوں کے آگے، خوف کے ہزاروں مکڑی کے جالے تن جاتے۔ کتنی بار کمرہ بس ملتے ملتے رہ جاتا— کبھی بڑی خاموشی سے ٹال دیا جاتا— ''سوری، آپ نے آنے میں دیر کر دی— یا ایڈوانس دی گئی رقم مسکرا کر واپس کر دی جاتی— جو کرایہ دار پہلے تھے وہ واپس آ گئے۔''

نام...... نام...... سلیم درگاہی— کہیں یہ نام تو کرائے کے مکان میں آڑے نہیں آتا؟ وہ بہت دنوں تک اپنی سوچ سے جنگ لڑتا رہا— نہیں ایسا ممکن نہیں ہے— وہ ایک خطرناک سوچ کی پگڈنڈی پر نہیں چلنا چاہتا ہے— کچھ بھی ہو جائے اسے اس خطرناک سوچ سے باہر نکلنا ہی ہوگا۔

لیکن باہر نکلتے نکلتے بھی رسّی کا ایک پھندہ گلے میں رہ جاتا ہے— یہ نیا فلیٹ بھی جینی کی وجہ سے ملا تھا۔ یا جینی کے رحم و کرم سے— مکان مالک نے غور سے جینی کو دیکھتے ہوئے پوچھا

تھا۔

''آپ......؟''

'جینی کشواہا—'

'وائف ہسبینڈ......؟'

''نو......نو......جینی شرارت سے مسکرائی تھی۔'ابھی ہیٹ نہیں لیا اس نے...... جب ہیٹ لے لے گا تو......'

''ہیٹ؟''

جینی نے ہنستے ہوئے بات بدلی تھی۔' آپ ٹرسٹ کر سکتے ہیں۔ہم دونوں ایک ہی آفس میں ہیں......'

'اوہ......!'

کمرے کی Key لیتے ہوئے اس نے مالک مکان سے پوچھا— اگر جینی نہیں ہوتی تو آپ مجھے یہ فلیٹ نہیں دیتے نا؟

''نہیں۔نہیں— ایسی بات نہیں ہے......'مکان مالک گڑ بڑا گیا تھا— نئے لوگوں کو مکان دینے سے پہلے کوئی گارنٹی چاہئے نا......''

جینی ایک گارنٹی بن گئی تھی— اور اس گارنٹی نے اسے کرایے کا کمرہ دلایا تھا— یعنی یہاں جینی جیسی گارنٹی کے بغیر اس کا وجود ہی نہیں ہے— آئی ڈی اور پین کارڈ کے ہوتے ہوئے بھی اسے ایک گارنٹی چاہئے۔وہ آہستہ آہستہ جیسے خود کو کمزور محسوس کر رہا تھا۔خوفزدہ بھی— جیسے اسے اپنی پہچان کے لیے بھی کہیں نہ کہیں جینی کے وجود کی ضرورت ہے—

پرانے فلیٹ سے نئے فلیٹ میں سامان شفٹ ہو گیا— سامان تھا ہی کتنا— ایک عدد فرج ٹی وی۔دو بڑی کتابوں کی ریک، ڈائننگ ٹیبل، ایک مسہری، صوفہ اور دو کرسیاں— لیکن اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔کافی بناتے ہوئے جینی اس سے بات کرتی جا رہی تھی۔

'میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو؟'

کافی لے کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی جینی۔ایک بات کہوں۔ بڑے گھسے پٹے سوال

ہیں جو تم خود سے کرتے رہتے ہو۔ تم خود کو فریش کیوں نہیں رکھتے؟ ہر وقت دم گھٹنے والے سوالوں کی زد میں کیوں رہتے ہو؟ اگر تم لندن میں ہوتے اور وہاں تم سے ایک اچھوت فارنر کی طرح سلوک ہوتا تو......؟

وہ زور سے دہاڑا— 'لیکن یہ ہمارا ملک ہے— ہم یہاں اچھوت فارنر نہیں ہیں۔'

'وہاں بھی نہیں ہو— اور یہاں بار بار اس سچ کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ 'یہ تمہارا ملک ہے— ریلیکس......' وہ اس کی انگلیوں کو کس کر رہی تھی— لندن یا آسٹریلیا میں ہوتے تب بھی اجنبی بننے کی ضرورت نہیں تھی۔ کیوں کہ ہم اپنے وجود کے ساتھ جہاں بھی ہوتے ہیں، پاؤں پھیلانا جانتے ہیں۔ کچھ باتیں درگزر کرنے کے لیے ہوتی ہیں— سب سے آسان چیز ہے Ignore کرنا— اگنور کرلو۔ اور شان سے جیو۔'

'اگنور کرنا آسان نہیں جینی۔ تم جانتی ہو، جب اس طرح کی وارداتیں ہوتی ہیں...... کوئی ہمارے نام کا آدمی ٹی وی اسکرین کے سامنے ہوتا ہے۔ ہماری قوم کا، ہمارا اہم مذہب۔ جانتی ہو دل کیا چاہتا ہے؟ ٹی وی میں آگ لگا دوں۔ پہنچ جاؤں اس کے سامنے— قتل کر دوں۔ کہ تم لوگوں نے جینا مشکل کر دیا ہے ہمارا۔ تمہاری وجہ سے ہمیں شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ تم یہ سب کرتے ہی کیوں ہو؟ سچ بتاؤ— مذہب کے لیے یا پیسوں کے لیے؟ جانتی ہو جینی، گھر سے باہر نکلنے کے بعد لگتا ہے ایسی ہر واردات کے بعد دیواریں تک ہمیں گھور رہی ہوں۔ جیسے سب کچھ ہم نے کیا ہو۔ بے قصور ہو کر بھی ہم معصوم ذہن رکھنے والوں کے، شک کے دائرہ میں آجاتے ہیں......'

''تمہاری غلطی یہ ہے کہ تم ہر بار ایسی وارداتوں سے خود کو جوڑ کر دیکھتے ہو— سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ تم ایسا کرتے ہی کیوں ہو— مت کرو۔''

وہ دھیرے سے آگے بڑھی۔ اس کے ہونٹوں پر اپنے گرم ہونٹ رکھ دیئے پھر پیچھے ہٹی۔

''تمہارے تیزی سے اٹھتے ہوئے بالوں کو کم از کم میں نہیں دیکھ سکتی۔ کچھ کرو سلیم— نہیں تو اگلی بار...... وہ مسکرا رہی تھی— جن پتھ سے تمہارے لیے ایک ہیٹ لے آؤں گی۔''

اس نے ایک بار پھر بات کا رخ موڑ دیا تھا۔ لیکن شاید ہوا کے رخ کو نہیں موڑ سکی تھی—

رات تیزی سے سرک رہی تھی۔

ان دنوں شام میں ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ وہ گھر جانا نہیں چاہتا تھا۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔ وہ دیر تک دوستوں کے نمبر چیک کرتا رہا۔ پھر بجھے دل سے اس نے عمران کو فون لگا دیا۔ چار سال پہلے ہی عمران سے دوستی ہوئی تھی۔

''سوری ڈیئر، تمہیں بور کرنے آرہا ہوں۔'

''آجاؤ۔'' دوسری طرف سے کہا گیا۔

''سوری اس لیے کہ کب تک ٹھہروں گا نہیں کہہ سکتا۔ مگر پلیز میری مدد کرو۔ میں بہت پریشان ہوں۔''

ساکیت، عمران کے فلیٹ پر چائے پیتے ہوئے، اچانک اس کے چہرے پر جھریوں کا جال سا بچھ گیا تھا۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ بریکنگ نیوز میں واردات سے متعلق نئی نئی باتیں بتائی جا رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا۔ ایک جھٹکے سے ٹی وی بند کیا۔ اور صوفے پر دراز ہو گیا۔

کیا بات ہے؟ عمران کے چہرے پر اداسی تھی۔

''کچھ نہیں۔''

''ان خبروں کو لے کر پریشان تو نہیں...... عمران آہستہ آہستہ چائے کا سپ لے رہا تھا۔

''جب تک مرضی رہ سکتے ہو۔ لیکن اپنے گھر سے کیوں بھاگ رہے ہو......''

دماغ میں ہتھ گولے پھٹ رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ ایک ہی سانس میں غٹ غٹ چائے پی گیا۔ مگر جیسے بم کے گولے مسلسل پھوٹ رہے تھے—وہ چہرہ بار بار آنکھوں کے آگے ناچ رہا تھا۔ ایک بھولے بھالے سے معصوم آدمی کا چہرہ—

اس آدمی کا چہرہ، جو فدائین حملوں میں مارا گیا تھا۔ قد پانچ فٹ دس انچ، سانولا رنگ—ٹی وی پر جو تصویر بار بار فلیش ہو رہی تھی...... اس کے مطابق...... اس کے بائیں ہاتھ میں A-K 47 اور دائیں ہاتھ میں ایک کالی سی پٹی۔

وہ اس چہرے کو جانتا ہے۔ اس چہرے کے ساتھ اس نے تین دن گزارے ہیں—

تین دن۔

بستر پر لیٹنے تک۔ دماغ میں سائیں سائیں چلتی آندھیاں۔ کسی حد تک کم ہوئی تھیں۔ مگر اب سارا منظر سامنے تھا۔ گھر سے ممی کا فون آیا تھا۔ بارش آنے والی ہے۔ چھت ٹپک رہی ہے۔ کچھ پیسے بھیج دو۔ آفس سے اس نے چھٹی کرلی۔ جینی نے پوچھا بھی۔ لیکن اس نے بات بدل دی۔ نہیں کچھ نہیں — وہ جینی سے بھی پیسے مانگ سکتا تھا اور جینی انکار بھی نہیں کرتی — مہینے کے آخری دن — گھر والے سمجھتے ہیں کہ وہ نوٹ چھاپنے والی مشین میں کام کرتا ہے۔ لیکن پیسے تو بھیجنے ہیں — ڈھابے میں کھانا کھایا۔ دیر تک سڑکوں پر آوارگی کرتا رہا — سڑک پر آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ ایک بس سے دوسری بس — ٹہلتا ہوا وہ اپنے نئے فلیٹ کی طرف چلا — ادھر ایک قطار سے جھگی جھوپڑیاں آباد تھیں۔ یہ وہ مزدور تھے جو میٹرو کے لیے کام کر رہے تھے۔ دکانیں بند تھیں۔ سڑک پر اکا دکا لوگ چل رہے تھے۔ رات کے گیارہ بج گئے تھے۔ گھر کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک اس کے قدم ٹھہر گئے۔ سامنے ایک نوجوان تھا۔ سر پر ہیٹ لگائے — پیٹھ پر بیگ لٹکائے — ایسا بیگ، جیسے عام طور پر کالج اسٹوڈنٹس رکھتے ہیں وہ پریشانی کے عالم میں ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا — پھر اس کی طرف دیکھ کر جیسے ایک امید سی بندھی۔

وہ اشارہ کر رہا تھا — ''یہاں پاس میں کوئی ہوٹل مل جائے گا۔ سستا سا۔ اگر مسلمان ہوٹل ہو تو......''

'مسلمان'...... وہ چونک گیا تھا...... 'میرا نام سلیم درگاہی ہے۔'

لڑکے کے چہرے پر ایک پل کو خوشی لہرائی...... 'میں...... اظہر کلیم...... جوب کی تلاش میں ہوں...... بس دو تین دن کے لیے...... پھر یہاں سے غازی آباد چلا جاؤں گا۔ کوئی ہوٹل ہے آس پاس؟''

ایک بار پھر اس نے لڑکے کا بہ غور معائنہ کیا — لڑکے میں کوئی بھی بات ایسی نہیں تھی جو اسے بلا وجہ شک میں مبتلا کر سکتی ہو — اس نے اشارہ کیا...... وہاں میرا فلیٹ ہے کرایے کا...... تم چاہو تو رہ سکتے ہو۔

لڑکے کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے — 'مجھے کچھ پرائیویسی چاہیے...... وہ سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ اکزام کی تیاری کرنی ہے۔ اس لیے ہوٹل......'

''ہوٹل کا کرایہ تم مجھے دے دینا...... اس بار وہ کسی تاجر کی طرح مسکرایا تھا...... دو کمرے ہیں میرے پاس — اطمینان رکھو...... تمہارے کمرے میں کوئی تمہیں ڈسٹرب بھی نہیں کرے گا۔

نوجوان کچھ لمحے کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ لیکن جلد ہی فیصلہ لے لینے کی طمانیت اس کے چہرے پر موجود تھی۔

چلو......

کمرے میں آنے کے بعد اس نے نووارد کو اس کا کمرہ دکھا دیا— کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔ ٹائلیٹ، باتھ روم کمبائن ہے۔ تم چاہو تو اپنا دروازہ بند کر سکتے ہو— کچن کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے پوچھا تھا—

''میں چائے بنانے جا رہا ہوں۔ تم چائے پینا پسند کرو گے؟''

''نہیں۔''

اس بار اس نے غور سے نووارد کو دیکھا۔ اس کے سر پر ایک گندی سی ہیٹ تھی۔ کپڑے بھی گندے ہو رہے تھے۔ اس نے آسمانی جینس اور سفید شرٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں ملٹری والے جوتے تھے۔ اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اس نے اپنی بات پھر دہرائی...... ''پلیز مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا...... مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے...... اس بیگ میں کھانے پینے کے سامان موجود ہیں...... امید ہے تم مجھے آرام سے سونے دو گے۔''

نووارد نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

عجیب آدمی ہے...... اس نے ایک لمحے کو سوچا پھر خیال آیا کہ اسٹوڈنٹس لائف میں سارے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ نہ سمجھ میں آنے والے— اس نے چائے بنائی۔ اندر سے موبائل پر کسی سے بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ کسی سے بات کر رہا تھا۔

چائے پینے کے بعد اس نے اپنے کمرے کی لائٹ بجھا دی اور بستر پر سونے کے لیے لیٹ گیا— باہر کتے زور زور سے بھونک رہے تھے جانے کتنی دیر تک وہ سوتا رہا۔ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز سے وہ چونک گیا۔

رات کے دو بج گئے ہوں گے۔

سامنے اظہر کلیم تھا— دروازہ کھول کر اس نے لائٹ آن کر دی تھی۔

'سوری، تم جاگ رہے ہو...... تمہیں ڈسٹرب کیا۔'

اس کے کندھے پر اب بھی بیگ لٹکا ہوا تھا— نیند نہیں آ رہی ہے— نئی جگہ جلدی نیند

نہیں آتی— ''میں ذرا باہر گھوم کر آتا ہوں۔ جلدی آجاؤں گا۔''

اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ کروٹ بدلتے ہوئے اس نے کہا— جلدی آجانا۔ مجھے صبح دفتر بھی جانا ہے۔

آسمان پر چاند روشن تھا۔ لیمپ پوسٹ کی روشنی میں وہ اسے تھوڑی دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا— پھر دروازہ بند کیا۔ لیکن آنکھوں سے نیند اچٹ چکی تھی۔ کم بخت۔ بیگ بھی ساتھ لے کر گیا۔ مسلمان ہو کر مسلمان پر بھی ٹرسٹ کرنا نہیں جانتا۔ بیگ لے جانے کی کیا ضرورت تھی— لیکن اسے خوشی بھی تھی۔ کسی پر ٹرسٹ نہ کر کے شاید ایسے لوگ اپنے اندر کے ٹرسٹ کو زندہ رکھتے ہیں۔ یہی ان نوجوانوں کے پریکٹیکل ہونے اور آگے بڑھنے کا راز ہے۔

اس نے دوبارہ چائے بنائی۔ فریج میں رکھا ہوا باسی پزا کے کچھ ٹکڑے منہ کے حوالے کیا۔ دیر تک کمرے میں ٹہلتا رہا— چار بجے کے قریب وہ واپس آیا۔ دروازے پر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا— سوری کہہ کر وہ تیزی سے کمرے میں داخل ہو گیا۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے اس نے فیصلہ کر لیا تھا— اس لڑکے سے اس کی نہیں بن سکتی۔ دوسرے دن وہ صاف کہہ دے گا...... وہ اپنے لیے کسی ہوٹل کا بندوبست کر لے۔ آنکھیں بند کرنے سے پہلے اس نے جینی کے میسج کو موبائل پر پڑھا— مس یو این لو یو— جلدی کوشش کرو کہ Miss you کہنے کی نوبت نہ آئے— تم پاس ہو گے تب بھی تمہیں Miss کروں گی۔ کیسے؟ یہ مت پوچھنا۔''

وہ زیر لب مسکرایا۔

دوسرے دن آٹھ بجے اس کی نیند ٹوٹی۔ ہڑبڑاہٹ میں اٹھا، تو تکیے کے پاس پانچ سو کے چار نوٹ اور ایک تحریر پڑی تھی— شکریہ...... ہوٹل میں ہوتا تب بھی ایڈوانس تو دینا پڑتا— ابھی دو دن اور قیام رہے گا— آج سات بجے آؤں گا— پلیز شام مجھ سے پہلے پہنچ جانا۔

نوٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ نوجوان کے اب یہاں رہنے پر اسے کوئی اعتراض نہیں تھا...... وہ جب چاہے، جتنے دن چاہے یہاں رہ سکتا ہے۔

●

ایک بار پھر دماغ میں پٹاخے چھوٹ رہے تھے— عمران دوسرے کمرے میں سو گیا

تھا۔اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔ وہ دہشت بھری اُن خبروں کی زد میں تھا— شاید بھارت تیزی سے کٹر پنتھی اسلام کے لڑاکوؤں کے لیے سب سے محفوظ ملک بنتا جارہا ہے۔ اسے یاد آیا۔ اینکر زور زور سے چیخ رہا تھا— اگر آپ آتنک کی زد میں ہیں تب بھی مذہب آپ کی کوئی مدد نہیں کرنے والا۔ کیونکہ آتنک وادی مذہب دیکھ کر گولیاں نہیں چلاتے— وہ اندر سے پسینے میں ڈوب چکا ہے۔ شام کے ۶ بجے سارے چینلس پر ہاٹ بریکنگ نیوز— بھیڑ سے بھرے ریلوے اسٹیشن پر ۸ سے ۱۰ کلو آر ڈی ایکس سے بھرے دو تھیلے— اچانک فدائین حملے سے سارا شہر جیسے کسی گہرے صدمے میں ڈوب گیا۔ سیریل بم دھماکے— چینلس چیخ رہے ہیں— سرکار اور پولس کی لاپرواہی نے آتنک وادیوں کو اپنی مرضی سے حملہ کرنے کے لیے راستہ بنادیا— وہ عمارت جس میں آتنک وادی چھپے تھے، کچھ گھنٹوں کی لگاتار فائرنگ کے بعد پولس آتنک وادیوں کو مار گرانے میں کامیاب ہوئی تھی۔

مگر وہ چہرہ— وہ واردات بھول چکا ہے۔ صرف وہ چہرہ یاد ہے۔ وہ چہرہ جو تین دنوں تک اس کے ساتھ رہا— پولس ...... فوجی کارروائی ...... آتنک واد— حکومت کے بیان۔ وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا اس کے کانوں میں لگاتار یہی جملے گونج رہے ہیں ...... پولس تفتیش کر رہی ہے۔ حملہ کرنے سے پہلے آتنک وادیوں کے ٹھکانے کون کون تھے اور وہ کہاں کہاں ٹھہرے تھے؟

اس کی آنکھوں کی چمک بجھتی جارہی ہے۔ وہ کانپ رہا ہے ...... بستر سے اٹھ کر اس نے چلنے کی کوشش کی— لیکن یہ کیا۔ سارے جسم میں لرزش طاری ہے— یقیناً وہ پکڑ لیا جائے گا۔ پولس کے ہاتھ کافی لمبے ہیں— وہ یعنی سلیم درگاہی— اس کے گھر پولس ریڈ کرے گی— بوڑھے ماں باپ ...... بھائی بہن ...... سب جیسے سناٹے میں آجائیں گے ...... پولس چارج شٹ لگائے گی ...... مالیگاؤں سے اعظم گڑھ تک کے تار جوڑنے کی کوشش ہوگی ...... کب سے جانتے تھے؟ تم کن لوگوں سے ملے ہوئے ہو؟ کس کے لیے کام کرتے ہو؟ پاکستان میں تمہارا آقا کون ہے؟ لشکر یا طالبان؟ یا اسلامی مجاہدین؟

اسے لگا جینی کے پاپا زور زور سے جینی سے کہہ رہے ہوں— میں کہتا نہ تھا— مسلمان بھروسے مند نہیں ہوتے۔

اسے لگا، جینی نے شرمندگی سے سر جھکالیا ہے۔

نفرت کی ایک تیز آندھی آئی اور اسے بہا کر لے گئی۔ آگے بڑھ کر فریج سے پانی کی بوتل نکالی۔ پانی کے دو چار قطرے ہی گلے تک جا سکے۔ بیسن کے پاس لگے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھا— ایک زرد، بیمار چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا— رات ہی رات جس پر جھریوں کا جنگل اگ آیا تھا۔ وہ ایک بار پھر بستر پر دراز تھا— وہ معصوم چہرہ ایک بار پھر نگاہوں کے سامنے تھا۔ جینی نے اس دن اس کے گھر رکنے کی خواہش کا اظہار کئی بار کیا۔ لیکن وہ خوبصورتی سے ٹال گیا— جینی نے برا بھی مانا تھا— چھ بجے شام اس نے آفس چھوڑ دیا۔ اس کے پڑوس میں للی آنٹی رہتی ہیں۔ عمر چالیس کے قریب— ان کی دو پیاری سی بیٹیاں بھی ہیں۔ ایک پندرہ کی دوسری تیرہ— اس دن تیزی سے کمرے کی طرف آتے ہوئے للی آنٹی مل گئیں۔ پھول کی طرح کھلا ہوا چہرہ— کیا بات ہے۔ گرل فرینڈ کو بلایا ہے کیا......

نہیں۔ ہاں......، وہ گڑبڑا سا گیا—'

للی آنٹی زور سے قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ شرماتے کیوں ہو۔ اچھی بات ہے— جاتے ہوئے وہ ایک بار پھر پلٹ کر بولیں— تمہاری فرینڈ کل بھی آئی تھی کیا؟ آگے بڑھنے سے پہلے انہوں نے ایک بار پھر زور سے قہقہہ لگایا— یہ لڑکیوں کو زیادہ کوکافی مت پلایا کرو۔ ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔''

آٹھ بجے اظہر کلیم دوبارہ آ گیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر تازگی تھی۔ کپڑے بھی صاف ستھرے تھے۔ لیکن سر پر وہی گندی سی ہیٹ موجود تھی۔ آج وہ خوش لگ رہا تھا۔

''چائے پلاؤ گے تو پی لوں گا—''

بیگ اندر رکھ کر وہ اس کے کمرے میں آ گیا۔ صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یہ کالی پٹی کس لیے ہے؟''

'ماں کی نشانی ہے'— وہ آہستہ سے بولا۔

رسمی سی بات چیت کے بعد چائے پیتے ہوئے اس نے صرف اتنا کہا— چائے اچھی بنا لیتے ہو۔ شاید میں کل کے دن اور رکوں— پھر تمہیں تکلیف نہیں دوں گا۔

اکزام کیسا گیا؟

''اکزام آج نہیں تھا۔ ایک دن بعد ہے۔ صبح ہی نکل جاؤں گا— اس نے ایک سانس

میں چائے ختم کر کے میز پر رکھ دیا— چائے کا بے حد شکریہ۔'

اس رات وہ کہیں نہیں گیا۔ لیکن شاید وہ سو نہیں سکا تھا۔ دیر رات تک اس کے بند کمرے سے کھٹر پٹر اور موبائل سے فون کرنے کی آواز آتی رہی۔ ممکن ہے کوئی گرل فرینڈ ہو۔ یا وہ اپنے گھر والوں سے باتیں کر رہا ہو۔ مگر اتنی رات گئے ...... اسے کیا...... اسے تو ہوٹل کا کرایہ مل رہا ہے۔

دوسرے دن بھی اظہر کلیم سویرے ہی نکل گیا۔ ہاں، تکیہ کے پاس پانچ سو کے دو نوٹ پڑے تھے۔ لیکن کوئی تحریر نہیں تھی۔

دوسرے دن وہ جینی سے اس واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا— پتہ نہیں جینی کیا سمجھے۔ ممکن ہے، وہ کہے کہ پیسوں کی ضرورت تھی تو اس سے کیوں نہیں لیا— جینی نے اس دن بھی گھر چلنے کی پر زور فرمائش کی۔ لیکن اس نے ٹال دیا— جینی کے چہرے پر شک کے بادل منڈلا رہے تھے۔

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تمہاری زندگی میں کوئی اور آ گیا ہے......؟'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بول رہی تھی۔ اگر ایسا ہوا تو جانتے ہو کہ کیا ہوگا؟ اسے بھی مار دوں گی اور تمہیں بھی۔ دوسرے ہی لمحے جینی محبت کی بارش میں شرابور تھی— ''تمہیں تو مار بھی نہیں سکتی۔''

اس دن وہ سات بجے کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ ڈنر تیار کیا— تھوڑا سا ڈنر اظہر کلیم کے لیے بھی رکھ چھوڑا کہ شاید اسے بھوک لگی ہو— دیر تک پرانی میگزینس پڑھتا رہا— پھر اس کے آنے کی امید چھوڑ دی— رات گیارہ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔

''السلام علیکم۔ سوری آج دیر ہوگئی...... دراصل۔''

اس نے محسوس کیا اظہر کلیم کے چہرے پر ایک خوفناک اداسی پسری ہوئی ہے— آنکھیں سوجی ہوئی— دن بھر کی تکان اور دوڑ دھوپ کا اثر اس کے چہرے سے صاف جھلک رہا تھا۔

'کھانا؟'

کھالیا—

'چائے بناؤں۔'

'نہیں...... کمرے میں جاتے ہوئے وہ ایک لمحے کو ٹھہرا— کل صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔'

اس رات اگر اس کا اندازہ غلط نہیں تو وہ جلدی سو گیا۔ ہاں، کچھ دیر تک موبائل سے، کسی سے بات کرنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ مگر الفاظ صاف نہیں تھے— رات دو بجے ہوں گے کہ اچانک وہ بستر سے اٹھ گیا— کوئی رو رہا تھا— شاید وہی تھا۔ اس کے رونے کی دھیمی آواز وہ اس سناٹے میں بخوبی سن سکتا تھا— ایک بار خواہش ہوئی کہ وہ اس کا کمرہ نوک کرے— پھر اس نے اس ارادے کو ملتوی کر دیا— پھر جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ صبح آٹھ بجے نیند ٹوٹی تو بستر پر ہزار کے تین نوٹ پڑے تھے۔ یعنی ہوٹل کے روم کے حساب سے۔ اس نے خود ہی ایک رات کے دو ہزار روپے طے کر لیے تھے— چھ ہزار روپے— برے نہیں تھے— اسی دن آفس سے پوسٹ آفس جاتے ہوئے اس نے پانچ ہزار روپے گھر منی آرڈر کر دیئے۔

ٹھیک اسی دن، شام چھ بجے یہ فدائین حملہ ہوا تھا۔ پہلے ریلوے اسٹیشن پھر پاس کے ایک بزنس سینٹر کو فدائین نے اپنا نشانہ بنایا— پولس کارروائی کے پانچ چھ گھنٹوں کے دوران تین فدائین مار گرائے گئے تھے— وہ اس چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ بدن میں لرزش تھی اور شاید وہ یہی لمحہ تھا جب وہ 'کافکا' کے میٹامارفوسیس میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اور شاید وہ آوارہ سڑکوں پر تیز تیز دوڑ رہا تھا۔

●

دوسرے دن آٹھ بجے عمران نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔ 'کیا ارادے ہیں؟ آفس نہیں جانا کیا؟ نہیں جانا ہو تو یہ Key رکھ لو...... میرے پاس ہے...... کچھ کھانے کی خواہش ہو تو فرج سے نکال کر کھا لینا۔'

عمران کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد جینی کا فون آیا تھا— کہاں ہو؟

عمران کے گھر رہنے کی بات سن کر وہ زور سے چیخی— ''پاگل ہو گیا؟ وہاں کیوں رکے؟ اچھا کوئی بات نہیں۔ آفس ذرا جلدی پہنچ جاؤ۔''

اس کی آواز کمزور تھی— 'شاید میں آج آفس نہیں آپاؤں۔'

اس نے فون کاٹ دیا۔ موبائل کو سائلنٹ پر کرنے کے بعد صوفے پر دھنس گیا— ایک

بار ٹی وی آن کرنے کی خواہش ہوئی— پھر خوف کے احساس نے ایسا کرنے سے روک دیا— اسے یہ بھی احساس تھا، کہ وہ اپنے ساتھ عمران کو تو خطرے میں نہیں ڈال رہا ہے۔نہیں، اسے یہاں نہیں رہنا چاہئے— اس کے پکڑے جانے کے بعد پولس عمران سے بھی پوچھ تاچھ کرسکتی ہے.....

دس بجے اس نے عمران کا کمرہ چھوڑ دیا۔ دماغ اب بھی سائیں سائیں کررہا تھا— اسے یقین تھا کہ میڈیا اور پولس دونوں اپنی اپنی پہنچ کا استعمال کررہے ہوں گے۔ وہ کسی وقت بھی پکڑا جاسکتا ہے۔اور پکڑے جانے کے بعد— سر چکرا رہا تھا— ذہن سوچنے، سمجھنے کی صلاحیت سے معذور ہو چکا تھا۔ بے دلی سے وہ اپنے گھر کی طرف نکل پڑا— یہ دیکھنے کے لیے کہ پولس کے کتے کہیں اس کی بو تو نہیں سونگتے پھر رہے ہیں— گھر کے قریب آکر وہ ٹھہر گیا۔ گومتی کے پاس والی دکان پر کچھ لوگ کھڑے تھے۔ گھر کے آگے ایک پولس والا تھا۔ وہ ایک کھمبے کی اوٹ میں ہو گیا— پولس والا کسی سے کچھ دریافت کررہا تھا۔ پھر وہ اپنے اسکوٹر پر بیٹھا اور روانہ ہو گیا— اس کے بدن میں خون کا دوران تیز تھا— یہ آسانی سے سمجھا جاسکتا تھا کہ اب وہ پولس تفتیش کا ایک حصہ بن چکا ہے۔اور شاید کچھ ہی گھنٹوں میں......

سانس چلنے کی رفتار تیز تھی— جیسے چاروں طرف سے وہ سلگتے چلّاتے لفظوں کی زد میں تھا— کیمرے کے فلیش چمک رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے سہمے سہمے سے گھر والوں کا چہرہ ناچ رہا تھا— یقیناً وہ پکڑا جائے گا— لیکن وہ کیا کرے— کیا وہ پولس کے پاس جائے؟ قریبی تھانے میں جاکر حلفیہ بیان لکھوائے؟ کیا پولس اس کی بات مان کر چھوڑ دے گی؟ ہزاروں طرح کی جرح— کارروائی، تھرڈ ڈگری کا استعمال، گھر والوں سے پوچھ تاچھ— جینی سے، آفس سے، بوس سے، عمران سے......

اسے لگا جیسے ایک بے حد کمزور لمحے اس نے اپنے مستقبل کا ایسا داؤں کھیلا ہے۔ جہاں صرف موت ہے— موت کے سرخ سرخ دائرے، اس کی آنکھوں کے آگے پھیلتے جارہے ہیں۔

اب بہت دیر ہو چکی ہے۔

کیا وہ خودکشی کرلے؟ ٹرین کے آگے آجائے؟ نہر میں کود جائے۔لیکن خودکشی کی وجہ سے؟ پولس کیا یونہی تفتیش کو بند کردے گی؟ اور خدانخواستہ تفتیش کے دوران اگر اظہر کلیم کو تین دن

گھر ٹھہرانے کی بات کا پتہ چل جائے تو...... کیا پولس اس کے ماں باپ کو چھوڑ دے گی؟ جینی کے باپ کا کہا گیا جملہ بار باراس کے ذہن میں گونج رہا تھا...... مسلمان بھروسے مند نہیں ہوتے۔

وہ دیر تک یونہی سڑک پر گشت کرتا رہا۔ بھوک پیاس سب اڑ چکی تھی —— صرف آنکھوں کے آگے ٹھہری موت رہ گئی تھی —— ایک بے رحم موت —— وہ زندہ رہے یا مردہ، جیسے ایک بے رحم موت اس کا انتظار کر رہی ہے۔

نہیں معلوم وہ کتنی دیر تک سڑکوں پر یونہی آوارہ بھٹکتا رہا —— پاؤں بوجھل تھے، سر میں چکر آرہے تھے۔ تھکا ہارا وہ ایک ڈھابے میں آ گیا۔ مگر جیسے بہت ساری آنکھیں اس کے تعاقب میں تھیں —— اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ سامنے والا آدمی...... اور وہ —— پاس کے بینچ پر بیٹھا ہو اخبار پڑھتا ہوا آدمی...... شاید وہ اخبار سے نظر بچا کر بس اس کی طرف دیکھ رہا ہے...... اندر جیسے تیر کی طرح ایک ٹھنڈ لہراتی چلی گئی۔

وہ ٹھہرا نہیں...... تیزی سے باہر نکل آیا —— احساس ہوا، اخبار کنارے رکھ کر وہ آدمی بھی تیزی کے ساتھ اس کے پیچھے نکل آیا ہے۔

وہ تیز تیز سڑکوں پر دوڑ رہا ہے۔ بے تحاشہ...... پاگلوں کی طرح۔

دماغ میں چلنے والی آندھیاں تیز ہوگئیں ہیں —— جن پتھ...... کناٹ سرکس...... پالیکا بازار —— یونہی پاگلوں کی طرح...... وہ لوگوں کے درمیان سے گزر رہا ہے۔ سجی ہوئی دکانیں، شاپنگ کرتے لڑکے لڑکیاں —— مگر جیسے سب پلٹ کر بس اسی کی طرف دیکھے جا رہے ہیں۔ یقیناً اب اس کا بچنا محال ہے۔ شاید وہ پہچان لیا گیا ہے —— کچھ ہی دیر، کچھ ہی لمحوں میں سارا کھیل ختم —— دماغ میں میزائل چھوٹ رہے ہیں۔

میٹرو اسٹیشن۔ وہ چپ چاپ ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔ رونے کی خواہش ہو رہی تھی۔ لیکن شاید آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔ جیب سے موبائل نکالا۔ ہاتھوں کی ہتھیلیاں سرد تھیں اور بے جان۔ جینی کے کتنے ہی مسڈ کال تھے اور کتنے ہی میسج۔ آخری میسج پانچ بجے کے آس پاس بھیجا گیا تھا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پڑھنا شروع کیا۔ لکھا تھا —— شام چھ بجے میں تمہارے گھر پہنچ رہی ہوں۔ تالا بند ملا تو تالہ توڑ دوں گی۔ اس لیے پلیز مجھے اپنے گھر پر ملو۔

اسے یقین تھا۔ جینی ایسا کر سکتی ہے۔

اور اب جینی سے ملنے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر آہستہ آہستہ ٹرین کے رینگنے کی آواز سنائی دے رہی تھی......

•

ایک بے حد اداس، بوجھل اور ڈراؤنا دن —— وہ اپنے گھر کے دروازے پر تھا۔ اور اچانک ایک بار پھر چونک گیا تھا۔ وہی صبح والا پولس کا آدمی...... وہ شاید اس کے گھر سے ہی باہر نکلا ہوگا۔ اسکوٹر پر بیٹھتے ہوئے اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ پھر اسکوٹر اسٹارٹ کیا اور روانہ ہو گیا——

دل میں دھک کا اضافہ ہو چکا تھا...... چند لمحے وہ ساکت و جامد وہیں کھڑا رہا—— شاید آنے والے بے رحم وقت سے مقابلے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ لیکن کیا ایسا کرنا آسان تھا؟ گھر کی طرف بڑھتے ہوئے للّی آنٹی ایک بار پھر ٹکرا گئی تھی۔

'ارے سنو......'

اس نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔ مگر اسے احساس تھا، مسکراہٹ کی جگہ کافکا کے اسی کیڑے نے لے لی ہو، جو دھیرے دھیرے اس کے وجود پر حاوی ہو گیا تھا۔

'تمہاری دوست آئی ہے۔ اچھی ہے......' للّی آنٹی مسکرا رہی تھیں۔ ایک Key اسے کیوں نہیں دے دیتے...... وہ تو اچھا ہوا بیچاری میرے پاس آ گئی۔ تالہ کھل گیا۔ جاؤ انتظار کر رہی ہے تمہارا۔

جاتے ہوئے پلٹ کر ایک بار پھر للّی آنٹی دھماکہ کر گئی تھیں...... 'دو دن پہلے کون آیا تھا؟ آج کل کچھ زیادہ ہی کافی پینے لگے ہو......'

ہنسنے کی آواز دماغ میں گرجنے والے میزائل کی آواز سے دب گئی تھی۔

آگے بڑھ کر اس نے اپنے گھر کی بیل پر انگلی رکھ دی۔

دروازہ کھلنے اور اندر داخل ہونے تک احساس ہوا، جینی کی آنکھیں اس کے سارے جسم کو ٹٹول رہی ہوں۔

'اچھا سنو۔ وہ پولس والا آیا تھا۔ صبح بھی آیا تھا۔ تم نے پاسپورٹ کے لیے اپلائی کیا تھا...... کیا شکل بنالی ہے...... جینی نے دھیرے سے اس کے ہاتھوں کو چھوا...... چلو...... ہاتھ منہ دھو لو۔ ایسے لگ رہے ہو جیسے...... ان دھماکوں میں تمہارا بھی ہاتھ ہو۔'

وہ زور سے چیخی — 'کیا کرتے رہے سارے دن۔'

اس نے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ جینی نے گھر کی صفائی کر دی تھی۔ ہاتھ منہ دھونے کے بعد وہ ڈرائنگ ٹیبل والی چیئر پر بیٹھ گیا۔ ذہن اب بھی سائیں سائیں کر رہا تھا...... زور زور سے چیخنے کی خواہش ہو رہی تھی۔ اچانک وہ چونک گیا۔ جینی قریب تھی۔ اس کے سر کے بالوں کو سہلاتی ہوئی......

'کیوں ہو جاتے ہو ایسے...... کبھی کبھی میں سچ مچ ڈر جاتی ہوں تم سے...... جیسے یہ ملک میرا ہے۔ ویسے تمہارا بھی ہے۔ اور اس بات کو مجھ سے کہیں بہتر تم جانتے ہو۔ جانتے ہو نا......؟ وہ قریب آ گئی— بالکل اس کے سانسوں کے قریب۔ ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا...... ''ایسی وارداتیں ہوتی ہیں۔ ہمیں بھی برا لگتا ہے مگر ہم...... تمہاری طرح تو نہیں ہو جاتے؟ میں جانتی ہوں تم بھیانک طریقے سے ڈر گئے ہو۔ مگر کیوں؟ انہیں اپنا ہم نام یا ہم مذہب مانتے ہی کیوں ہو؟ وہ ایک آتنک وادی ہیں بس۔'

اس کی آنکھیں پیار سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں— سنو ایک گفٹ ہے تمہارے لیے— گھر کی صفائی کرتے ہوئے ایک چیز ملی ہے مجھے...... شیطان کہیں کے...... مجھے بتایا کیوں نہیں۔ چلو...... میں بتا دیتی ہوں...... پہلے آنکھیں بند کرو۔

جینی ایک لمحے کو اٹھی۔ اندر کمرے کی طرف بھاگی۔ پھر دوسرے ہی لمحے واپس آ گئی— آنکھ بند پلیز......

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

جینی نے اس کے سر پر کچھ رکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولی۔ اب آئینے میں خود کو دیکھو۔

اس نے چونک کر خود کو آئینے میں دیکھا— یہ وہی گندا سا ہیٹ تھا— اسے، اس چہرے پر حیرت تھی— بار بار آنکھوں کے آگے منڈراتے چہرے کے باوجود اسے لگ رہا تھا...... کچھ چھوٹ رہا ہے۔ تو وہ یہ ہیٹ چھوڑ گیا تھا—

جینی ہنس رہی تھی......

وہ غور سے آئینے میں خود کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

•❖•

کوئی ہے......

حالانکہ اس پورے سلسلۂ واقعہ کو جسے آپ ابھی اس کہانی کے ذریعے جاننے کی کوشش کریں گے کسی ناقابل یقین یا ڈرامائی صورتحال سے جوڑ کر دیکھنا مناسب نہیں ہے، لیکن شاید کچھ سچ بڑے عجیب اور چونکانے والے ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں، زندگی میں آپ کو کسی ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے یا نہیں، جب زبان گنگ ہو جاتی ہے اور مکالموں کی جگہ صرف گہری خاموشی، دستک یا آہٹیں رہ جاتی ہیں۔ جو اچانک ہی سناٹے میں آپ کو چھو کر کہتی ہیں...... 'کوئی ہے—'

بس ایسے ہی ایک نادر یا کمیاب لمحہ اچانک اس کہانی کا جنم ہو گیا۔

•

ماحول خاموش اور بے جان تھا۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے خاموش اور بے جان ماحول میں آپ دشنیت کی طرح پتھر اچھال کر کوئی ہلچل یا کسی جرأت کی امید نہیں کر سکتے۔ اس وقت سب کچھ توقع کے مطابق تھا۔ یعنی جیسا شانتنو نے سوچا تھا۔ چمکتے لیکن ٹھنڈے اداس سورج کے ساتھ کا ایک دن— موسم خزاں کی ایک بوجھل صبح اور گارڈن میں لگے 'سنے'، گل بہری اور 'ٹیلی' کے بے رس پھولوں کی قطار' جسے کچھ دن پہلے ہی وہ اپنے 'ایلیسیشن فری' پبلشر سے لے کر آیا تھا۔ اس میں کہیں کوئی چونکنے جیسی یا قابل اعتراض بات نہیں ہے۔ برنارڈ شاہ کی طرح اگر آپ مرد کے وقار اور ''سپر مین'' ہونے کی خواہش کو دلائل سے بیان کرتے رہے ہوں تو ممکن ہے اس ''ایلیسیشن فری'' کی تمثیل سے آپ کو انسان ہونے کے عظیم خطاب کے ساتھ تھوڑی سی چوٹ پہنچے۔ اس لیے تھوڑی سی معافی کے ساتھ، کہ شانتنو کے لیے وہ فرنگی پبلشر اس سے زیادہ داد پانے کا مستحق نہیں تھا۔ ''ہوس ہے دورا ہے پر'' کی غیر متوقع کامیابی کے بعد شانتنو کے پاس آئے

اسی فرنگی پبلشر نے کچھ اداسی، کچھ گہری تکلیف سے گذرتے ہوئے کہا تھا—

'معاف کیجیے گا، آپ سے ملاقات کے لیے ایک بے افسوسناک دن کا شگون نکلوانا پڑا'

'بے حد افسوسناک دن'......؟

'آج میں نے اپنا پرانا وفادار ایلیسیشن بیچ دیا، مگر نقصان میں نہیں رہا شانتنو—'

کتابوں کی سیل کی طرح اس کی تھرکتی انگلیوں پر ایلیسیشن ڈاگ کا پورا حساب موجود تھا—اس کا ایک الگ کمرہ— کمرہ میں اس کی سجاوٹ میں اتنے روپے لگے۔ کھانے میں اتنے۔ اس میں وفاداری اور پیار کی کہیں کوئی تفصیل نہیں تھی۔ اس طرح قاعدہ سے دیکھیں تو فرنگی پبلشر (جو تھا تو ہندوستانی، مگر انگریزی کتابوں کا پبلشر ہونے اور اس کے رہن سہن کا خیال کرتے ہوئے شانتنو کو یہی نام مناسب لگا) کے لیے ایلیسیشن کو بیچنا کہیں سے بھی گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ اور اسی کے مطابق کولکتہ میں رہنے والی مارگریٹ ایلیا کو اس کی شائع شدہ تمام کتابوں میں یہ ڈاگ اتنا پیارا لگا کہ وہ اسے ہر قیمت پر خریدنے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس طرح ایک فیصد جذبات اور ننانوے فیصد خالص تجارتی سطح پر ایلیسیشن کا سودا ہوا—اور مس مارگریٹ اپنے تھل تھل سینے سے ایلیسیشن کو چپکائے کچھ دیر تک اس سے اپنا پن کا احساس کرتی رہی، پھر اسے لے کر سیدھے فلائٹ سے فرر......ہو گئی—مہاشویتا کے دیس یا 'نذرل' کے گاؤں— تو قصہ کوتاہ، ذکر آیا تھا، 'سنے' گل بہری اور ٹیلی کے بے رس پھولوں کا— تو یہ وہی ایلیسیشن فری پبلشر تھا جو اس کے لیے خاص طور پر لایا تھا اور بدلے میں شانتنو نے اس سے جو چند سوالات کئے، وہ کچھ اس طرح ہیں۔

--- یہ پھول کہاں ہوتے ہیں؟

اٹلی میں'

--- کیا اٹلی کی عورتوں کو بھی یہ پھول پسند ہیں؟

انتہائی ذمے داری کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نہیں— کیوں کہ سوائے خوبصورت ہونے کے، ان میں کوئی مہک نہیں ہے۔

--- کیا اس سے یہ مطلب لیا جائے کہ عام طور پر خوبصورت عورتوں میں چمک یا مہک کی کمی ہوتی ہے؟

پبلشر کی رائے تھی۔ ایسا پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا......

--- کیا ان پھولوں کا ماحولیات پر بھی کچھ اثر پڑتا ہے؟

پبلشر کی رائے تھی — واضح طور پر تو نہیں لیکن جہاں تک 'ادبی ماحولیات' کا سوال ہے، اس سے آئندہ مستقبل میں اثر پڑنے کا امکان ہے — وہ بھی تب جب ان پھولوں کی پہچان رکھنے والا کوئی شخص جو ناشر بھی ہو، آپ کے دروازے پر آئے، آپ کے ادب سے زیادہ ان پھولوں میں دلچسپی لے۔

ان میں اور بھی کئی سوالات تھے۔ جیسے، کیا ان پھولوں کو یہاں کی آب و ہوا راس آئے گی —؟ یا کیا یہ پھول 'ویاگرا' انرجی اور طاقت کی دواؤں میں بھی استعمال ہوتے ہیں —؟ واضح طور پر بہت سی باتوں کا ناشر محترم کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

●

خزاں کی اس بوجھل صبح ایسا بہت کچھ ہوا تھا جو شانتنو کے دل و دماغ پر اپنی یادگار چھوڑ گیا تھا۔ ہر بار اپنی کتاب فروخت کرتے ہوئے وہ پر مطمئن رہتا تھا کہ شاعری بھرم ہے۔ ادب کوئی مشغل نہیں ہے۔ ساری زندگی لاکھ ٹکے کے انعام میں گذار دینا زندگی کے تئیں کوئی انضباطی کارروائی نہیں ہے۔ یہ لاکھ ٹکے تو وہ دوسرا اور تیسرا ایڈیشن آتے ہی اپنے اے آئی او کے فنڈ میں ٹرانسفر کر لیتا ہے۔

''ساری زندگی — ایک خطابی انعام یا اعزاز کے لیے، مائی فٹ —''

شانتنو ہنستا تھا۔ اسے اس کے کئی دوست یاد تھے۔ ایک تو سکھن چکرورتی تھا۔ پان کھاتا تھا۔ نسوار لیتا تھا۔ یہ بھی خیال نہیں رکھتا کہ نسوار کہاں گر رہی ہے۔ دوسروں کو اٹھنے والی کھانسی کی بھی فکر نہیں ہوتی۔ نسوار اٹھایا۔ ناک میں ٹھونسا، فکر میں ڈوب گئے — تھوڑی دیر بعد فکر سے آزاد ہوئے تو دھوتی اٹھائی، ناک صاف کی۔ اب ایسے 'چرکوٹوں' سے چھتیس کا آنکڑا ہے شانتنو کا۔ کیونکہ ایسے کئی لوگوں سے ادبی سپریم بنے ہونے کے نام پر اس کی اچھی خاصی لڑائی بھی ہو چکی ہے۔ مثلاً اسی سکھن چکرورتی کو لیجیے اور ذرا گذشتہ نومبر کے، سردی کے وہ مکالمے بھی سن لیجیے، مثلاً — 'آپ کی نظموں میں نسوار کی مہک زیادہ ہے —'

'آپ ادب بھی سمجھنے لگے —' یہ سکھن چکرورتی کا جوابی حملہ تھا۔

'ادب آپ کے نسوار میں ہے۔ ناک میں ڈالنے، دھوتی سے پونچھنے کے درمیان تک کی فکر اگر ادب ہے تو مجھے معاف کیجیے گا —'

'کیا —؟' سکھن کے چہرے پر شکن پڑ گئی تھی۔

'اب کیا یہی دن باقی رہ گئے تھے کہ آپ سے ادب پر تنقیدی گفتگو بھی سننے کو ملے گی۔ بھائی—اگر آپ ادیب ہیں تو ہمیں کتے رہنے دیجیے۔ وہ بھی گلی کا رنگ جھڑا، پلّو پڑا کتا۔'

'تو آپ مانتے ہیں آپ گلی کے رنگ جھڑے پلّو پڑے کتے ہیں' ادیب نہیں'

'آپ کہنا کیا چاہتے ہیں—؟ سکھن کی آنکھیں باہر نکل آئی تھیں۔ جسم کی دبلی پتلی ہڈیاں پھڑک اٹھیں۔ قہقہے لگاتے شانتنو نے اپنا جملہ مکمل کیا—' سنو سکھن چکرورتی' لڑتے ہوئے دو آدمیوں میں ایک شخص نے دوسرے سے کہا، میں نے تو آپ کو شریف سمجھا تھا۔ اس پر دوسرے نے کہا میں نے بھی آپ کو شریف سمجھا تھا...... پہلے نے کہا، چلئے میں اپنی بات واپس لیتا ہوں......ہا......ہا......''

گفتگو کی آخری کڑی کے طور پر ہارے ہوئے سکھن کا چہرہ اسے یاد تھا۔

''تمہارے پاس ایک خاص مقصد سے آیا تھا۔''

''کیا؟''

''کچھ پیسے چاہئے تھے—''

''پیسے اپنے پبلشر سے کیوں نہیں مانگتے؟''

''مانگتا تو ہوں پر بار بار— سکھن ناک میں نسوار ڈال رہا تھا— سچ میں ہم گلی کے رنگ جھڑے کتے ہیں— شرمیلے کتے— جسے ہرا ایرا غیرا نا شر بھی دولتی مار کر بھگا دیتا ہے۔ کتابیں سب چھاپنا چاہتے ہیں۔ مگر پیسے دیتے ہوئے— ایک شرمیلا کتا، جو ادب کی تخلیق کرتے ہوئے بھی شرمیلا ہی رہتا ہے— شاید اسی لیے یہ پورا نظام صدیوں سے ایسا ہی ہے۔

●

ماحول خاموش اور بے جان تھا۔ لیکن کسی نے اس خاموش اور بے جان ماحول میں دشنیت کی طرح پتھر پھینکنے کی کوشش کی تھی۔ بھلے ہی اس سے کوئی دھماکہ نہ ہوا ہو— کہیں کوئی ہلچل نہ مچی ہو......لیکن ایک ہلچل اس کے اندر اٹھی تھی۔ گہری خاموشی کو کچھ بوجھل مکالموں نے دھماکے کے ساتھ توڑ ڈالا تھا— فرنگی پبلشر کے بڑے سے کیبن میں وہ اپنی نئی کتاب کے سرورق کو کچھ بے چینی اور کچھ کچھ گہری مایوسی بھری آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ نہیں کلر ٹھیک نہیں ہے۔ رنگوں کا انتخاب غلط ہے— اور اس ایبسٹریکٹ آرٹ کی کیا ضرورت تھی— لڑکی کو کسی درخت یا کنویں یا سانپ کے طور پر کیوں محسوس کیا جائے؟ اس کی جگہ کوئی جیتی جاگتی خوب صورت لڑکی کیوں

نہیں— اور یہ وہی وقت تھا جب کیبن کے خالی پڑے صوفے پر بیٹھے دونوجوان قلمکار جوزف براڈسکی کی نظموں پر غور کر رہے تھے۔

''لوگ— مر رہے ہیں—''

''جب ہم گلاسوں میں اسکاچ انڈیلتے ہیں یا کاکروچ مارتے ہیں۔ لوگ مر رہے ہیں۔''

شانتنو نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک پل کو کتابوں کی پوری عمارت کسی معصوم نوجوان میں بدل کر رہ گئی، جہاں خواہشوں کے نام پر صرف ایک تلاش بچی ہو۔ سیاسی تجزیہ شروع ہوا۔ دوسری عالمی جنگ، خانہ جنگی، ٹکراؤ کی کہانیاں— ویتنام سے گرینیڈا تک— افغانستان سے عراق— چلّی سے پناما اور نکارگوا تک، فلسطین کے معصوم قتل ہوئے بچے...... اور—

'لوگ مر رہے ہیں، جب ہم اپنی بے نام خواہشوں کا سودا کرتے ہیں۔ رنگ محل بناتے ہیں۔ اعتماد کھوتے یا پاتے ہیں...... مٹن یا چکن خریدتے ہیں...... لوگ مر رہے ہیں......'

شانتنو نے پلٹ کر دیکھا— خواہش ہوئی— پل بھر کو اس مرتی ہوئی بھیانک گفتگو کا حصہ بن جائے— لوگ محبت بھی کر رہے ہیں۔ جب ہم اسکاچ انڈیلتے ہیں...... یا ٹائی کی ناٹ باندھتے ہیں۔ لوگ پارک میں، گھر میں، سڑک پر...... جزیروں میں...... صحراؤں میں...... بیاباں میں لوگ ایک دوسرے کے بازوؤں میں سو رہے ہیں— لوگ پیار کر رہے ہیں— جنگ اور لڑائی کے باوجود— بوسہ لے رہے ہیں ایک دوسرے کا، چوم رہے ہیں۔ بانہوں میں بھر رہے ہیں، اور یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب صرف وہی نہیں کر رہے ہیں جو نوجوان ہیں— وہ بھی کر رہے ہیں جو نوجوانی کی سیڑھیوں سے بہت دور، آگے نکل گئے ہیں......

یہ مناسب وقت تھا، اس پل کو جینے کا یا اس پل کو اپنے اعتماد میں لینے کا، جس نے شانتنو سے چپکے سے کہا— کہ شیطانوں سے اب بھی یہ دنیا بھری ہوئی ہے— پھانسی کے جھولے اب بھی چوراہوں پر لٹکے ہیں— اور کس نے لٹکائے ہیں— انہوں نے— جن کی باتیں کسی موت کے ہتھیار سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔

چھن سے ایک آواز ہوئی تھی۔

شیشے کا ایک گلاس زمین پر گرا تھا— ریسپشن گرل سے لے کر عالمی سیاست کے منظر نامے پر مرنے والوں کی تعداد شمار کرنے والے ان دونوجوان فلسفیوں نے بھی اس سمت دیکھنے کی

جرأت کی تھی— وہ ایک لڑکی تھی— نہیں عورت— بال چھوٹے— چہرہ گورا چٹا— بدن نشے سے بھرپور— جیسے چیختے ہوئے اسٹوو کے شعلے ہوتے ہیں— عمر نے جیسے سمندر کے طوفاں کو، کسی معجزہ کی طرح روک رکھا ہو...... عورت کے چہرہ پر غصہ صاف جھلک رہا تھا۔ دیسائی یعنی وہ فرنگی پبلشر کچھ کہنے کی کوشش میں میمنے جیسا معصوم یا پھر چیتے جیسا شاطر لگ رہا تھا۔ عورت کے ہاتھ میں کوئی کاغذ تھا، جسے دکھا کر وہ زور زور سے کچھ کہہ رہی تھی۔

شانتنو اپنی پرانی کتاب لینے کا بہانہ بنا کر شیشے کے کیبن سے باہر نکل آیا۔

عورت خوبصورت تھی— غصے میں ابلتے چہرہ سے اس کی جوانی کے پیڑ پر کتنے ہی گلاب مہک اٹھے تھے۔ ان کی خوشبو سے انجان شاید وہ اپنے دلائل کو واضح کرنے میں لگی تھی۔ اس کے حملے دھماکہ خیز تھے۔

'نہیں، آپ کو یہ نہیں کرنا چاہئے تھا، کم سے کم ایک مرتے ہوئے آدمی کے ساتھ تو بالکل نہیں۔'

'دیکھئے۔ ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا...... آپ...... آرام سے۔ بیٹھ کر بھی باتیں کر سکتی ہیں۔' دیسائی بچنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا تھا۔

'نہیں، بالکل نہیں— اور آرام سے۔ آپ کہہ رہے ہیں...... آرام سے بیٹھنے کے لیے— آپ جانتے ہیں، آرام کیا ہوتا ہے۔ ساری زندگی اپنے آرام کو ترک کر کے اور قربان کرنے کے بعد ایک عام آدمی شمل شرما بنتا ہے، آپ جانتے ہیں شمل شرما بننا کیا ہوتا ہے۔'

'وہ ہمارے لیے احترام اور عظمت کی علامت ہیں۔'

'آہ۔ علامت ہیں نہیں تھے— آپ نے بنایا اُنہیں تاریخ— وہ اسپتال کے بستر پر تھے، بیمار تھے۔ اور آپ کیا کر رہے تھے؟ شمل شرما کے لیے— آپ اپنی جیبیں بھر رہے تھے— اپنے مکان بنا رہے تھے— اپنا بینک اکاؤنٹ بڑھا رہے تھے۔ مگر ٹکس کے پیسے سے۔ شمل کے پیسے سے، آپ شمل جیسے شریف لوگوں کا استحصال کرنے والے ہیں۔ آپ اپنی کمینگی سے ان کی شرافت کی چادر تار تار کرتے ہیں— عورت کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا— میں سمجھاتی تھی شمل کو— ناشر بدل دو— لیکن وہ اپنی عظمت کے پیروں کے نشان دیکھنے میں الجھا ہوا تھا— یا پھر عظیم خیالوں کو تاریخ بنتے دیکھنے کی، ایک عجیب سی بچوں والی خواہش کی پرورش کر رہا تھا۔ لیکن کیا اتنے سے سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ تہذیبی وراثت سے پیدا ہونے والی قیمت— اقدار کا ٹکراؤ اور دخل

اندازی کی تحریر — یہی نام دیا تھانا، اس کے نقادوں نے اُس کے زندگی بھر لکھے ادب کو سمجھنے کے لیے — سب بکواس۔ شمل نے دخل اندازی کا ادب لکھا ہوتا تو اپنی تحریروں کے لیے بھی آپ کے ساتھ بھی دخل اندازی کرتا یا پیسے مانگتا۔ مگر اب — یاد رکھئے، شمل نہیں ہے — اور میں آپ کو چھوڑوں گی نہیں —'

اس نے لمحہ بھر کو فرنگی پبلشر کی آنکھوں میں اس کٹے بکرے کو دیکھ لیا تھا، جس کے بدن سے قصائی چمڑا ہٹانے کی کوشش کرتا ہے — بیچارہ دیسائی — شانتنو نے پہلے ہی باہر نکلنے کی تیاری کر لی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا، یہ کیا تھا یا اُسے ایسا کرنے کا حق ہی کیا تھا۔ یا پھر سگھن چکرورتی کے الفاظ میں، آپ سماج یا واسطوں کی پروا ہی کیوں کرتے ہیں۔ آپ جو بیچ رہے ہیں، سو بیچتے رہئے — اس کے خریدار بہت ہیں۔ باقی اصول یا اقدار کی تلاش یا اصولوں کی ایجاد کی آپ کو ضرورت نہیں ہے۔ مگر — عورت کی خوبصورتی یا گفتگو کی کشش کچھ اتنی زیادہ تھی کہ وہ باہر نکل آیا تھا — اور کچھ ہی لمحوں بعد غصے سے لال پیلی وہ عورت باہر نکل کر اپنی چھوٹی زین کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ وہ اسٹائلش جینس اور ریڈ ٹی شرٹ میں تھی۔ گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے شانتنو کی طرف پل بھر کو دیکھا اور یہی مناسب وقت تھا جب شانتنو نے اس سے براہ راست گفتگو کے لیے خود کو تیار محسوس کیا۔

'آپ ایک منٹ مجھے دے سکتی ہیں؟'

'کیوں؟ عورت کی بھنویں تن گئی تھیں۔ آپ ریسپشن پر کھڑے ہماری باتیں سن رہے تھے۔'

'ہاں —'

'اس سے کیا ہوتا ہے، مجھے آپ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے —'

ہوا کے جھونکے کی طرح زین کے گذر جانے کے بعد بھی عورت کے الفاظ شانتنو کے کانوں سے ٹکرا رہے تھے — 'اس سے کیا ہوتا ہے، مجھے آپ میں کوئی دلچسپی نہیں ہے' — شانتنو سنجیدگی سے مسکرایا۔ پہلی ملاقات میں وہ اس سے زیادہ بات چیت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن دل کہہ رہا تھا، دوسری ملاقات بہت جلد ہونے والی ہے۔

●

اور یہ کوئی اتفاق نہیں تھا۔ نہ ہی ماحول خاموش اور بے جان تھا۔ رات کی طلسمی چادر دور تک بچھی ہوئی تھی اور اس طلسمی چادر میں بے شمار ستارے، ٹمٹماتے ہوئے یہ اعتماد پیدا کرنے کی کوشش میں لگے تھے کہ دشنیت کی طرح پتھر اچھال کر ہلچل پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ 45 سالہ شانتنو کے لیے اکیلے رہنا خوبصورت زندگی کا جیسے حصہ بن چکا تھا۔ لڑکیاں اس کے لیے ترغیب سے زیادہ ایسی کشش تھیں، جو اسے ایسی دلکش راتوں میں لبھانے آجاتیں یا پھر بستر پر مینکا، اروشی اور گندھاری بن جاتیں، مگر مندیرا —

ٹمٹماتے ستارے کبھی سانپ، کبھی کنواں، کبھی مچھلی بن جاتے، اور ہر شکل میں وہ مندیرا کے بہتے جسم کے آبشار کا نغمہ سن رہا تھا۔ مندیرا جیسے ستاروں کی گواہی میں دیکھتے ہی دیکھتے کسی بیش قیمتی فن پارے میں بدل گئی اور کہنا چاہیے، شانتنو اس وقت اپنے فن کی دلیل پر قائم تھا — کیا فن ایک تصور بھر ہے؟ صرف میوزیم میں رکھے جانے یا جگہ پانے بھر کے لیے —؟ کیا مندیرا بھی محض ایک بھرم ہے۔ صرف ایک بوڑھے وجود کے لیے محدود —؟

آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کا کارواں دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا — اور اب یہ تارے کسی عظیم فنکار کے فن پارے میں بدل گئے تھے — اور اس فن پارے میں مندیرا آ گئی تھی۔

'میں کنواں نہیں ہوں — سانپ بھی نہیں — مچھلی بھی نہیں۔ میں تو پوری پوری غزل ہوں۔ کیوں نہیں پڑھتے ہو تم —'

شانتنو کو یاد آیا — اس دن دوبارہ دھول اڑاتی زین کے نظروں سے غائب ہونے کے بعد وہ دوبارہ اس شیشے کے کیبن میں لوٹ آیا تھا۔ دیسائی اس کا منتظر تھا۔

'کہاں گئے تھے، آپ —'

'باہر، سگریٹ کا کش لینے —'

'اچھا ہی کیا —' دیسائی ہاتھ میں چیک بک لیے نیچی نگاہ کئے کسی سوچ میں گرفتار تھا — آنکھوں کے پاس چشمے کی کمانی بار بار کھسک رہی تھی۔

'ایلیسیشن بیچ کر اچھا نہیں کیا آپ نے —' شانتنو کہتے کہتے ٹھہرا۔

'ہا — ہا —' دیسائی ہنسا — 'تمہیں یاد ہے —'

'تمہیں یاد آتی ہے یا نہیں اس ایلیسیشن کی —؟'

'کیوں نہیں۔ کتنا لمبا ساتھ تھا۔'

'ایلیمینیشن کی یاد آتی ہے لیکن ایک بیمار قلمکار کو جو ہاسپٹل کے بیڈ پر پڑا تھا، بھول گئے اسے — ؟'

دیسائی تڑپ کر ہنسا — 'تو تم نے ہماری باتیں سن لی'

'سنی پڑی — ویسے کون تھی یہ لڑکی — ؟'

'لڑکی نہیں، عورت کہو — مندیرا ہے — نظمیں لکھتی ہے — پینٹنگ کرتی ہے، شمل کی تخلیقات میں بہہ گئی۔'

''اور دونوں نے شادی کر لی۔''

'ہاں، عمر بھی نہیں دیکھی — شمل اور اس کی عمر میں آدھے سے بھی زیادہ کا فرق تھا — '

شانتنو کہتے کہتے ٹھہر گیا کہ محبت عمر کہاں دیکھتی ہے — مگر محبت کی یہ باتیں فرنگی پبلشر سے اس وقت کرنے کی، اس کی کوئی خواہش نہیں تھی — اس نے پیار کو زیادہ نہیں جانا تھا، لیکن شانتنو پیار کو حدود میں بند دیکھنے کے خلاف تھا...... پیار تو تیز بہتی ندی ہے اور اس بہتی ندی کو نہ تو باندھا جا سکتا ہے اور نہ ہی جوش میں بہتی اس ندی پر کوئی پل ہی بنایا جا سکتا ہے — اس نے پیار کو 'ادبی حدود' سے پرے ہی رکھا تھا۔ اس کے لیے پیار روح سے زیادہ ایک جسمانی خوبصورتی تھا اور اس خوبصورتی کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ وہ دھڑلے سے بھڑ سکتا تھا، خواہ وہ اس کا فرنگی پبلشر ہی کیوں نہ ہو۔

دیسائی ٹھہا کا لگا رہا تھا — 'یہ رائلٹی کا چکر بھی...... سب شانتنو تو نہیں ہوتے — '

شانتنو کو لگا دیسائی کا پورا بدن ایک کتے کی دم میں تبدیل ہو گیا ہو۔

'کیوں — '

'کیوں؟ یہ کہ مجھ سے زیادہ آپ جانتے یا سمجھتے ہیں — دیسائی سنجیدہ ہو رہا تھا — اس کا رنگ گورا تھا۔ آنکھوں پر کالا چشمہ — کچھ سوچنے کی کوشش میں اس کا چہرہ نیولے کے چہرہ میں بدل جاتا تھا۔ وہ ہنس رہا تھا — شانتنو، آپ بھی نا — اب بتائیے، کیا پڑی تھی مجھے ادب کا روگ پالنے کی۔ سب...... سالے — 'وہ ایک پل کو ٹھہرا۔ اپنے آپ کو شیکسپیئر، اروندھتی یا کرن دیسائی سمجھتے ہیں — سمجھتے ہیں کہ نہیں — وہ اپنے پورے پھوہڑ پن کے ساتھ ہنس رہا تھا — وہ سمجھتے ہیں کہ آسمان میں شگاف ڈال سکتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں جیسے سڑک پر نکل جائیے تو ہر شخص انہیں اینا بھ

بچن یا شاہ رخ خان کی طرح جانتا ہے— جیسے باہر نکلے تو سب انہیں گھیر لیں گے— دیسائی ہنس رہا تھا— آٹو گراف— پلیز آٹو گراف— سن آف بچ— کتنی عجیب بات ہے— یہ جن کے لیے لکھتے ہیں وہی نہیں پڑھتے۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہر گھر میں ان کے قاری موجود ہیں، گلی کے کتے تک ان کے ادب کو چاٹ رہے ہیں— کتنا بکتے ہیں— کون خریدتا ہے— اس نے لمبی ناک والے شمل کی ایک کتاب کھینچی— دیکھئے پہلا ایڈیشن پانچ سو ہے— ہے کہ نہیں؟ اب پانچ سو کتاب چھاپنے میں کتنی لاگت آتی ہے یہ آپ سے زیادہ کون جانے گا— سرکاری گوداموں کا آسرا نہ ہوتا تو یہ بھی نہیں بکتی— اور مندیرا سوچتی ہے— بس شمل سے ہم کروڑوں کما رہے ہیں— محل بنا رہے ہیں۔ کوٹھیاں کھڑی کر رہے ہیں، دراصل— '

دیسائی پھسپھسا رہا تھا— فرسٹریٹڈ عورت— ایک وقت آتا ہے، جب ایسی عورتیں ایک بڑے نام کو ادب کی گٹھلی کی طرح چوستے ہوئے اگل دیتی ہیں اور صرف پیڑ گننا چاہتی ہیں— پیسوں کے پیڑ— مگر کتنے پیسوں کا پیڑ بھائی— آپ سمجھ رہے ہیں نا شانتنو؟'

اور یہیں دھوکہ کھا گیا تھا دیسائی۔ شانتنو شاید اس صورت حال میں اس کا سارا غصہ ہضم کر لیتا مگر دیسائی نے جس غیر مہذب انداز میں مندیرا کا نام لیا تھا وہ اسے گوارا نہیں تھا— پسند اور ناپسند کی بھی اپنی اپنی نفسیات ہوتی ہے۔ شانتنو کے چہرے پر شکن تھی، اس نے دھیرے سے دیسائی کو روکا—

'بلڈ پریشر چیک کرایا ہے؟'

'کیوں؟'

'چیک کرا لو دیسائی۔' شانتنو کے الفاظ برف ہو رہے تھے— تم کو یاد ہے دیسائی۔ میری پہلی کتاب—

'وہ— سیکس اور لائف— '

'ہاں، اسی کے بارے میں پوچھ رہا تھا— یاد ہے پہلا ایڈیشن کتنا چھپا تھا— لاکھوں میں— اس کے بعد بھی ہر سال نئے ایڈیشن نکالنے پڑے۔'

'وہی تو— کافی دیر سے ہاتھ میں تھامی ہوئی چیک بک نکال کر دیسائی نے سامنے رکھی— 'یہ اس سال کی رائیلٹی کی رقم ہے۔ پسند کرو تو سارے واؤچر آپ دیکھ سکتے ہیں۔ آپ بکتے ہیں۔ اس لیے آپ کو رائیلٹی کی بھاری رقم دیتے ہوئے بھی مزا آتا ہے۔ مگر یہ ادیب— '

دیسائی کی بھنویں تن گئی تھیں — برا ہو نمیشا دیش پانڈے کا۔ جو اپنا یہ پبلشنگ ہاؤس مجھے سونپ گئی۔ ہم اچھے بھلے انگریزی، بچوں کی کتابیں، جنسی مواد پر مشتمل کتابیں چھاپ رہے تھے۔ یار دوستوں کے سمجھانے میں آ گئے کہ ادب بھی چھاپو۔ پیسہ تو ہے ہی، نام بھی ہے۔ بڑے لوگوں کے درشن ہوں گے، مگر — نام بڑے درشن چھوٹے۔ وہ ایک بار پھر نفرت سے منہ سکوڑ رہا تھا۔ سب خود کو وکرم سیٹھ اور اروندھتی رائے سمجھتے ہیں۔ ارے اتنا بک کر بھی تو دکھاؤ —''

سامنے پڑی ڈائری میں مندیرا اور اس کا فون نمبر چمک رہا تھا۔ شانتنو نے اس بات چیت کو یہیں روکا — ڈائری اٹھائی — نمبر ایک لمحہ کو یاد کیا، اپنا موبائل نکالا اور سیو کر لیا — کس ارادے سے — شاید اسے خود پتہ نہیں تھا۔ اس نے واؤچر چیک کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، چیک لیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا —

شانتنو کو لگا، ہوا تیز ہو گئی ہے — بادلوں کا ایک کارواں آسماں پر منڈرایا — تارے چھپ گئے — اسے یاد آیا، گھر آ کر اس نے کئی بار مندیرا کو فون لگانے کی کوشش کی۔ لیکن ہر بار نمبر لگا کر وہ ایک گہری سوچ میں ڈوب جاتا۔ کیوں کروں؟ کیا کہوں گا؟ کیوں ملنا چاہتا ہوں، وہ بھی شمل جیسے معروف ادیب کی بیوی سے جو خود بھی ایک فنکار ہے، نظمیں لکھتی ہے — فون ایک بار پھر مل گیا۔ لمحہ بھر کو اخلاقیات نے خوشبو کا لباس پہنا۔ ایک عجیب سی ہلچل شانتنو کے پورے بدن میں ہو رہی تھی۔ انگریزی میں کچھ غصہ بھرے لفظوں میں پوچھا گیا تھا —

'ہو آر یو —؟'

'یہ میں ہوں شانتنو — رائل کنگ پبلشر کے دفتر کے باہر سے۔'

'باہر —' وہ پل بھر کو سوچ میں ڈوب گئی — مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا ہے۔'

'آپ شمل کی کتابوں کی رائیلٹی کے لیے —'

'اوہ، میں نے کہا تھا نا، میری آپ میں —'

'انٹرسٹ نہیں ہے —' شانتنو کھلکھلایا — لیکن دوسرا تو انٹرسٹ لے سکتا ہے نا۔ میرا مطلب ہے، ادب میں — آپ اور شمل کے ادب میں —' شانتنو نے دھیرے سے کہا — ملنا چاہتا تھا آپ سے، انکار مت کیجئے گا۔

'کل صبح گیارہ بجے آ جایئے۔ فون رکھا گیا۔'

قصہ کوتاہ، شمل کے گھر کا پتہ معلوم کرنے میں شانتنو کو دشواری نہیں ہوتی اور جان بوجھ کر یہ پتہ اس نے دیسائی سے نہیں مانگا تھا۔

●

جو کچھ ہوا، وہ کسی گہرے دھند سے گذرنے جیسا تھا، اور وہ بھی شانتنو جیسے شخص کے لیے جس کی پیدائش ہی ایک تجارت پیشہ خاندان میں ہوئی تھی۔ جہاں زندگی کے لیے جدوجہد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی — اور نہ ہی کسی فن کے 'عروج' کے لیے کوئی کھلا روشن دان ہی تھا — وہاں سب کچھ پیسہ تھا۔ صبح سے شام تک پیسے گننے والے خاندان میں کب پاکٹ بکس یا رومانٹک ناول پڑھنے کی عادت پڑ گئی، وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ شانتنو کے لیے ایسے رومانٹک ناولوں کی اپنی دنیا تھی اور یہ دنیا تنہائی میں، رات میں چپکے سے اس کے سامنے پھیلتی چلی جاتی۔ جوانی کی دہلیز تک پہنچتے وہ پیسوں سے سپنوں کی رومانٹک دنیا تک کا سفر کر چکا تھا۔ اسی درمیان اس نے دو ایک ناول لکھ ڈالے۔ ناول کی ہیروئنیں عام طور پر وہی ہوتیں جو اس کی زندگی میں آئی ہوتیں یا پھر جو تنہائی یا سپنوں کے سفر میں اس کے ساتھ ہوتیں۔ شروع میں، گھر میں اس کے لکھنے کی مخالفت تو ہوئی لیکن بزنس مین باپ نے ایک بات اس کے دل و دماغ میں بٹھا دی کہ لکھنے سے اگر بزنس جیسا مالی فائدہ ہوتا ہے تو لکھو، ورنہ بزنس سنبھالو۔ ابتداء میں لکھے گئے ناول تو نہیں چلے لیکن دلی اور میرٹھ کے بازار میں اسے جلدی ہی کامیابی مل گئی اور پھر تو راجہ بکتا ہے جیسے ناول نے دیکھتے ہی دیکھتے اسے کتاب کی منڈی یا پاکٹ بکس کی دنیا کا شہنشاہ بنا دیا — جلدی ہی اس پر فلم بنانے کا عمل بھی شروع ہو گیا اور شانتنو کا یہ 'ادبی سفر' اس کے باپ کے بزنس سے بھی بڑا ایک پڑاؤ ثابت ہوا۔ پھر شانتنو نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ کئی پبلشر بدلے — پاکٹ بکس کتابوں سے الگ کے دعوت نامے بھی اس کے پاس آئے۔ اسی درمیان شانتنو اس فرنگی پبلشر کے قریب آیا۔

جو کتابوں سے زیادہ اپنے ایلیسیشن کتے کی تعریف میں زمین۔ آسمان کے قلابے ایک کرتا تھا۔ حالانکہ شانتنو نے ایلیسیشن جیسی پھرتی اس کے وجود میں کبھی نہیں دیکھی جب کہ ہر بار چیک یا پیشگی رائیلٹی کی بات کرتے ہوئے وہ دیسی، رنگ جھڑے کتے کی طرح ہی لگتا — پھر بھی شانتنو کے لیے دیسائی ایک بڑی پارٹی تھا اور اس پارٹی کو وہ کسی بھی قیمت پر چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ شانتنو نے شادی نہیں کی۔ تنہا زندگی کی شان و شوکت اسے ہمیشہ سے پسند رہی۔ اور ادیب کہلانے کا بھرم، ہر بار اس میں حوصلہ سے زیادہ جوش بھر دیتا۔ ہاں یہ دھند، تب تب ہٹتی تھی جب

اس کے ادیب کہلانے پر سوالیہ نشان لگایا جاتا تھا۔ ادیبوں کی ویران دنیا سے اپنی دنیا کا سچ اسے زیادہ قبول ہوتا تھا— آخر وہ بھی تو لڑتا ہے سماج سے— سماج کے توہمات سے— اسی سماج میں پیار بھی آتا ہے۔ اسی لیے اس کے کردار شدت سے پیار بھی کرتے ہیں۔ شانتنو نے پریم چند کو بھی پڑھا تھا۔ شرت چند کو بھی— ابتداء میں اس نے شمل کی بھی ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن شمل اس سے پڑھا ہی نہیں گیا۔ یا کہنا چاہیے، ایسی خشک ادبی کتابیں اس سے پڑھی ہی نہیں جاتی تھی۔ کبھی کبھی تو وہ یہ بھی سمجھنے میں ناکام رہتا کہ آخر ایسی کتابیں لکھی ہی کیوں جاتی ہیں اور کون پڑھتا ہے انہیں؟

دوسرے دن ٹھیک گیارہ بجے وہ مندیرا کے فلیٹ کے باہر تھا۔ ایک چیز اسے بار بار پریشان کر رہی تھی۔ کبھی یہاں شمل بھی رہتا ہوگا— دھوپ کھلی کھلی تھی— پیڑ پودے خاموش تھے۔ شانتنو کو لگ رہا تھا شمل یہاں کرسیاں نکال کر بیٹھتا بھی ہوگا— گھر میں داخل ہونے اور ڈرائنگ روم کے صوفے میں دھنسنے تک، وہ مسلسل شمل کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ سامنے شمل کی بڑی سی تصویر لگی تھی— بائی پانی کا گلاس دے گئی اور کچھ ہی لمحے گزرنے کے بعد ہاتھ میں چائے کی ٹرے لیے مندیرا حاضر تھی۔ کسی ہوئی جینس اور ٹی شرٹ میں چائے کی ٹرے اس نے میز پر رکھ دی— رسمی گفتگو کا سلسلہ شروع ہوتے ہی اس نے روکھے سوالات کا حملہ شروع کر دیا۔

'آپ کیا کرتے ہیں۔'

'ادیب ہوں—'

'ادیب—؟' مندیرا چونکی تھی— ادیب۔ آپ تو کہیں سے بھی ادیب نہیں لگتے، ادیب تو اپنے رویئے سے ہی دکھائی دے جاتا ہے۔ لیجئے چائے پیجئے— چائے بڑھاتے ہوئے بھی اس کا حملہ جاری تھا۔ 'آپ جانتے ہیں، ادب کیا ہوتا ہے؟'

'جی—'

'اچھا نام کیا ہے آپ کا—'

شانتنو نے نام بتایا۔ دو جھلملاتی آنکھوں میں تھرتھراہٹ ہوئی۔ آنکھیں بند ہوئیں— پھر جلد ہی کھل گئیں— شانتنو— وہ پاکٹ بکس والا— مندیرا ہنس رہی تھی— رلجہ بکتا ہے۔ جس پر فلم بھی بنی تھی— ایک سی گریڈ ناول پر بننے والی سی گریڈ فلم۔ اچھا تو آپ وہ ہیں— دیسائی آپ کو

بھی چھاپتا ہے۔ آپ تو بہت بکتے ہیں، اور آپ کے تو خاص ریڈر ہیں — ' مندیرا کی ہنسی میں غصہ تھا۔ چنیا بادام اور بھونجا کھانے والے لوگ — ٹرین میں سفر کرتے ہوئے — اس کی پلکوں میں تناؤ تھا۔ شانتنو کو تعجب ہوا۔ اتنے دھماکوں کے بعد بھی اس کی قوت برداشت باقی تھی — شاید وہ یہ سب سوچ کر آیا تھا۔ یہی فائر تو، مندیرا کی جوانی کا حصہ تھا — غصے میں اس کا پورا بدن گلاب کے ننھے سے پودے کی طرح اور بھی دلکش ہو جاتا۔ اس کے گٹھے ہوئے گداز بدن میں کنویں اور سانپ کی ساری علامتیں ایک ساتھ جمع ہو کر اس کے رگ و پے میں طوفان کھڑا کر رہی تھیں۔

'تو آپ تخلیق کار ہیں، ادیب — مندیرا ہنس رہی تھی — جانتے ہیں تخلیقی اظہار کیا ہوتا۔ کیا ہوتا ہے شمل بننا — ؟ چھوٹی سی نازک عمر میں اس کا بڑھاپا بھول کر سوچتی تھی، ایک دن اس کے جسم کے سوئمنگ پل میں چھلانگ لگا دوں گی۔ سب کچھ بھول جاؤں گی — آپ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ سچ کیا ہوتا ہے — ؟ سماجی سروکار کیا ہوتے ہیں — ؟ شمل جیسا انسان اپنی تخلیق کے توسط سے کیسے اپنے فن کی بلندیوں پر پہنچتا ہے — آپ جانتے ہیں — آپ جانتے ہیں میں راتوں کو اٹھ کر اسے لکھتے ہوئے دیکھتی تھی۔ لکھتے وقت، اس کی انگلیاں ایک عظیم دستکار کی انگلیاں بن جاتیں اور وہ پورے وجود سے ایک بے حد معصوم بچے میں بدل جاتا۔ ایک ماہر سنگیت کار کی طرح لکھتے ہوئے اس بدن کی مشین برابر بجتی رہتی تھی۔ میں نے سنے تھے اس کے سر — اب بھی سن رہی ہوں۔ لکھتے وقت اس کا بدن ایک عجب سے سرور میں ڈوب جاتا — کمرہ میں اسے گھیر کر جیسے نور کے فرشتے جمع ہو جاتے۔ آپ جانتے ہیں، الفاظ کیا ہوتے ہیں — ؟ الفاظ کا استعمال کیسے کیا جاتا ہے — ؟ الفاظ پانی کی طرح بہانے کے لیے نہیں ہوتے — جو آپ کرتے ہیں — الفاظ سنبھال کر رکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ تھوڑا تھوڑا خرچ کرنے کے لیے...... جیسے شمل کرتا تھا — ' ہاں — وہ اس کی میز ہے۔ وہ اب بھی ہے۔ اب بھی لکھ رہا ہے......'

مندیرا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لمحہ بھر کو روشنی سی چمکی۔ تھرتھراتی مندیرا اٹھی۔ آگے بڑھی۔ کرسی کو بوسہ دیا اور پھر لوٹ آئی۔'

'' آپ ادیب ہوتے تو نہیں بلاتی۔ ادیب صرف شمل تھا۔ باقی گھاس کھودنے والے' چائے کے کپ خالی ہو گئے تھے۔ مندیرا کی آنکھوں میں اب بھی تناؤ چھلک رہا تھا۔ 'لیکن آپ مجھ سے ملنے کیوں آئے؟' وہ ہنسی۔ میرے لیے جدوجہد کریں گے؟ دیسائی کے خلاف؟ مجھے تسلی دیں گے؟ میرے خیال سے آپ نے اس کی ایک بھی کتاب نہیں پڑھی ہوگی۔ کیوں؟'

'ٹھیک کہتی ہیں آپ — ایک پڑھی تھی — پڑھی نہیں گئی۔'

مندیرا زور سے ہنس پڑی — یہی تو شمل کی جیت ہے — آپ کو بھی سمجھ میں آجاتا تو پھر شمل، شمل کہاں رہ جاتا، شانتنو نہ بن جاتا۔ وہ ہنس رہی تھی — اس ہنسی کے انداز میں لمحہ بھر کو دھماکہ ہوا تھا — اس کی گوری ہتھیلیاں، چوڑی کی طرح چھنک کر اس کی ہتھیلیوں سے چھوگئی تھیں۔ اُس ایک لمحہ میں جیسے سونامی سماگئی۔ مندیرا کے چہرہ کے تاثرات بدلے — گرم بھاپ دیتی ہتھیلیوں کا اپنا احساس شانتنو کے لیے ہزار جسموں کے احساس سے بھی بڑھ کر تھا۔

مندیرا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔'دراصل اس گلوبل نظام میں ہم اپنی مادری زبان بھول بیٹھے۔ یہی المیہ ہے۔ انگریزوں کی غلامی، انگریزی کی برائی دے گئی ہمیں۔ پڑھتے، جیتے اور اپنی تہذیب میں ملاتے ہوئے ہمارے سارے اقدار اسی رنگ میں رنگ گئے — زبان بھی انہیں کی ہوگئی۔ دراصل یہ ان تمام ممالک کے مالی نظام کی کمزوری ہے، جن کی وجہ سے ان کی اپنی زبان چھن جاتی ہے۔ شمل نے صرف انگریزی میں لکھا ہوتا تو آج اس کی حیثیت دوسری ہوتی — وہ لکھ سکتا تھا — مگر اس کے اپنے تجربے، اقدار اتنے حاوی تھے کہ وہ کسی دوسری زبان میں لکھنے کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا تھا...... اور اسی لیے دیسائی جیسے لوگ......'

اچانک ایک حادثہ ہوگیا تھا...... مندیرا پل بھر کو ٹھہر گئی۔ وہ سامنے والے کمرہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں یکا یک سہم گئی تھیں۔ کمرہ میں قطار سے، الماری سے جھانکتی کتابیں — شمل کی میز، پرانے زمانے والے کرسی، دیواروں کے جھڑتے رنگ...... قطار سے دور تک سجے پھولوں والے گملے — کالونی کے اندر پہنچنے تک شانتنو اس ادبی خاموشی اور پیڑوں سے چھن کر آنے والی فلسفیانہ دھوپ کی کرنوں کا جائزہ لے چکا تھا۔ پوری کالونی میں، خاص کر شمل کے فلیٹ کے پاس جو چپی اور گہری خاموشی اس نے محسوس کی تھی، وہی ہلچل وہ مندیرا کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ فلسفے چلتے چلتے ٹھہر گئے۔ اس کی آنکھیں خوف زدہ تھیں — کان کھڑے تھے۔ جیسے کسی کی آہٹ محسوس کر رہے ہوں۔ وہ ایک ٹک شمل والے کمرہ کی طرف دیکھ رہی تھی —

'کوئی ہے...... نہیں مجھے صبح سے اسی بات کا احساس تھا کہ کوئی ہے...... آپ نے —

مندیرا شانتنو کی طرف مڑی — اور سب کچھ غیر یقینی ڈھنگ سے ہوا تھا۔ اس نے یکا یک شانتنو کا ہاتھ تھاما — 'صبح میں برش کرتی ہوئی یہاں آئی — وہ وہاں کھڑا تھا۔ تم نے بھی آہٹ سنی نا......؟

اور سامنے...... وہاں شمل کے کمرے میں — وہ زور سے چیخی — میں پوچھ رہی ہوں تم نے دیکھا یا نہیں — ؟ مندیرا زور سے چیخی۔ سمترا —'

گھر میں کام کرنے والی بائی اس کی چیخ پر دوڑ کر آ گئی تھی۔ اس کے لہجہ میں گھبراہٹ تھی۔ 'کیا ہوا میم صاحب۔' مندیرا کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ 'پچھواڑے کی کھڑکی بند کی یا نہیں؟ میں نے صبح ہی کہا تھا، اس کھڑکی کو بند رکھا کرو، پورے دو مہینے سے ایسا ہو رہا ہے کوئی ہے — کوئی ہے — جو یہاں تک آ کر — تم نے سنا نہیں سمترا — وہ تیز آواز میں دہاڑی — گیٹ لاسٹ، جا کر کھڑکی بند کرو۔'

'میم صاحب — ابھی تو بارہ بجے ہیں۔'

'بارہ بجے ہیں —' مندیرا کے چہرہ سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ بارہ بجے — بارہ بجے چور نہیں آ سکتے؟ کھڑی کھڑی منہ کیا دکھ رہی ہو۔ جاؤ تم پہلے کھڑکی بند کرو۔ تم یہاں — اس نے مضبوطی سے کسی منظوری یا نامنظوری کی پروا کیے بغیر شانتنو کا ہاتھ تھاما۔ شمل کے کمرہ کی طرف بڑھی۔ وہ یہاں تھا تم نے دیکھا یا نہیں — نہیں پلیز بولو تم — سچ بولنا، دیکھا تھا نا تم نے بھی — ؟ یہاں — اسی کرسی کے پاس تھا وہ — سایہ نہیں تھا، وہم نہیں تھا میرا۔ جب ہم باتیں کر رہے تھے۔ وہ ہماری طرف دیکھ رہا تھا...... مگر — مندیرا نے ہاتھ چھڑا لیا — کون ہو سکتا ہے وہ اور — کھڑکیوں پر تو جالی لگی ہوئی ہے — کہاں جا سکتا ہے وہ۔ ہو سکتا ہے۔ بات چیت میں کچھ دیر کے لیے ہماری پلکیں بوجھل ہوئی ہوں — اور اسی پلک جھپکنے کا اس نے فائدہ اٹھایا ہو — مگر وہ آتا ہی کیوں ہے؟ اور کہاں چلا جاتا ہے۔ اچانک اس کا بدن جیسے پھر کانپا۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھیلی تھیں۔ جیسے وہ کس آہٹ کو کان لگا کر سننے کی کوشش کر رہی ہو، اچانک وہ تیزی سے پلٹی۔ اس کا ہاتھ تھاما۔ ابھی بھی وہ اس گھر میں ہے — وہ ہے، سنو، تم بھی سنو...... اس کے پیروں کی آہٹ...... اب وہ اوپر جا رہا ہے، سیڑھیوں سے۔ میرے ساتھ آؤ — ! مندیرا تیزی سے مڑی۔

آگے دالان سے ہو کر سیڑھیاں چلی گئی تھی۔ تنگ سی سیڑھیاں — سیڑھیوں پر روشنی ذرا کم تھی — لمحہ بھر کو وہ رکی...... اس کی طرف دیکھا۔ پھر تیزی سے اسے اشارہ کرتی ہوئی باقی سیڑھیاں بھی طے کر گئی۔ اوپر ایک کھلا کمرہ تھا — روشن دان بند تھے۔ کھڑکی پر پردہ پڑا تھا۔ دبیز پردہ...... کمرہ میں بندھی ہوئی کتابوں کے علاوہ ٹوٹے صوفے اور بے کار کی چیزیں بھی پڑی تھیں۔ ایک صاف پلنگ بچھا تھا۔ وہ یہاں آیا تھا۔ یہ شمل کی کتابیں ہیں۔ کچھ دن پہلے۔ پبلشر نے بھجوائی

تھیں۔ دیکھو، کھولی بھی نہیں گئیں — اچانک وہ چلائی۔ دیکھو وہ ہے، ابھی بھی ہے — وہ کانپتے لہجہ میں چیخی۔ کون ہے..... آگے بند پردہ سے روشنی کا ایک سایہ سازمین پر گر رہا تھا۔ اب تمہیں تو کوئی وہم نہیں۔ وہ پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی — کون ہے —؟ اور یکا یک کھڑکی کے اوپر تنے مکڑی کے جالے کو اس نے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ٹھیک پاس دیوار سے چپکی ایک چھپکلی تھی۔ وہ زور سے چیخی۔ اور یکا یک اس لمحہ شانتنو کے پورے بدن میں جیسے لاوے بھر گئے۔ وہ چیخی۔ وہ پلٹی اور ایک پل کو سب کچھ بھول کر اس میں سما گئی۔ بدن میں جیسے دھماکہ ہوا۔ کمرہ میں جیسے دنیا کی سب سے خوبصورت موسیقی گونجنے لگی۔ اس کے سینے کی گولائیاں ابھی بھی سخت تھیں اور شاید دنیا کی سب سے خوبصورت عورت کی گولائیاں تھیں۔ پیر کانپ رہے تھے۔ لمحہ بھر کو شانتنو کے بدن کے اندر ہزاروں پھلجھڑیاں چھوٹ گئیں۔ پھر جیسے دھماکہ ہوا۔ وہ اچانک اس کے بدن سے الگ ہوئی، ہاتھ ہٹایا۔ غصہ سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ زوروں سے چلائی۔

'تم ابھی تک گئے نہیں۔ پانی پی لیا۔ چائے پی لی، اب کیا کر رہے ہو۔ یہاں، گھڑی دیکھو۔ کتنا وقت ہو گیا ہے۔ میں اتنی دیر تک تم جیسے کسی شخص کو برداشت نہیں کر سکتی۔ مندیرا اس کی طرف دیکھ کر زور سے چیخی — میرا منہ مت دیکھو۔ جاؤ تم — گیٹ لاسٹ'

شانتنو نے جانے سے پہلے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں ابھی بھی دہشت سے پھیلی تھیں۔ وہ دھیرے سے کہہ رہی تھی..... کوئی ہے —

کھلے گیٹ سے وہ باہر نکل آیا۔ باہر پیڑ پودے خاموش تھے۔ بچوں والا ایک جھولا ہل رہا تھا — شاید کچھ دیر پہلے کوئی بچہ جھولتے جھولتے ابھی فوراً ہی ہو گیا ہو۔ باہر کی زمین نرم تھی۔ پیڑوں سے پتیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ پورے ماحول میں ایک عجیب سی خاموشی، ڈری سہمی مندیرا کی زبان بن گئی تھی۔ کوئی ہے لیکن شاید کوئی نہیں تھا۔ باہر آکر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی لیکن اسے کسی بھی طرح کی شرمندگی یا پچھتاوا نہیں تھا۔ مندیرا کے الفاظ میں کہا جائے تو وہ ایک فیصد بھی ہرٹ نہیں ہوا تھا۔ باہر آکر گاڑی میں بیٹھنے تک مندیرا کی جلتی ہتھیلیوں کا لمس اور جسم کی گرماہٹ اس کے وجود کے ریشے ریشے میں اتر چکی تھی۔ شاید اسٹیئرنگ تھامتے ہوئے وہ مسکرایا بھی تھا۔ گاڑی کے سڑک پر دوڑنے تک، وہ اپنی سطح پر واقعاتی تجزیہ کے تعجب خیز دور سے گذر چکا تھا......

لیکن سوال تھا۔ ایسا کیوں ہوا۔ کیا صرف مندیرا کا وہم تھا۔ اور مندیرا کو یہ وہم اچانک اس وقت کیوں ہوا جب اس نے دیسائی کا نام لیا۔ کیا ایسا بہت دنوں سے چل رہا ہے؟ یا کمرہ میں

آنے پر ایک مرد کی موجودگی اچانک اسے اندر سے بے چین کر گئی تھی — ؟ اچانک وہ مندیرا سے سانپ یا مچھلی، یا اس کوربیچ میں بدل گئی تھی، جسے دیسائی کے یہاں دیکھتے ہوئے اس نے پہلی بار میں ہی مسترد کر دیا تھا۔ مکمل مندیرا اس کے سامنے تھی دو دن پہلے رائل پبلشنگ ہاؤس کے کمرہ میں دیسائی کو کھری، کھوٹی سناتی ہوئی — پھر یہاں — شمل کے فلیٹ میں اچانک ایک بے نام سے ڈر کا اس کے وجود میں بیٹھ جانا — کیا یہ اتفاق تھا، یا اسے ڈرامائی انداز میں تبدیل کرنا مندیرا کی مجبوری؟ کیا ایک جھری بڑے بوڑھے بدن میں عورت کے لیے کوئی کشش باقی رہ سکتی ہے۔ وہ بھی ادب کی سطح پر؟ کب تک؟ کتنے دنوں تک۔ بار بار خواب میں آنے والا ہیرو، پریشان اور دکھ بھرے لمحے میں ہیرو سے ولن بھی تو بن جاتا ہے؟ شمل کتنی بار ولن بنا ہوگا — ؟ مندیرا کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کو پوری نہ کر سکنے کے حوالے سے۔ مندیرا جیسی کم عمر لڑکی ایک بزرگ ہیرو کے ساتھ اپنے خوابوں کے سفر میں کتنا وقت حوصلہ اور جوش کے ساتھ گذار سکتی ہے — ؟ کیا اندر سوئی ہوئی برسوں پرانی آگ کو یکا یک ایک مرد نظر آ گیا تھا — ؟ اس کی شکل میں۔ مکالمے چھپ گئے تھے۔ صرف لمس رہ گیا تھا۔ جیتا جاگتا، بولتا لمس — ایک نا قابل یقین اور ڈرامائی صورتحال نے شانتنو کو مندیرا کی نفسیات کی اس حقیقت سے متعارف کرایا تھا — کہ اب وہ نہیں ملے گی۔ لیکن کیا جو کچھ اس نے سوچا وہی سچ تھا۔ شمل کے بعد وہ نا معلوم، انجانے ڈر سے کسی نفسیاتی مرض کا شکار ہو چکی ہے۔ ایک مہینہ آندھی اور طوفان کی طرح گذر گیا۔ نہ مندیرا ملی، نہ اس نے فون کیا اور نہ ہی مندیرا نے۔ ہاں — رائل پبلشنگ ہاؤس کو لے کر تنازعہ ضرور سرخیوں میں آ گیا تھا۔

●

سچ یہ ہے کہ اس پورے پس منظر یا واقعہ کو کسی متعینہ تاریخ سے جوڑ کر دیکھنا مناسب نہیں ہے۔ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ شانتنو کو اس کا احساس تھا۔ سماج، رہن سہن، لباس، انٹرٹینمنٹ کے طریقے، کھان پان، فلمیں، ہیرو اور ہیروئن — سب بدل رہے ہیں۔ معجزہ سے سائنس اور نفسیات تک، زندگی میں آتی دوسری لڑکیوں سے مندیرا تک۔ وہ لمس جیسے بدن میں ٹھہر گیا تھا۔ مکالمے گم ہو گئے۔ لمس رہ گیا۔ چیختا ہوا لمس۔ جیسے اسٹو کے چیختے شعلے ہوتے ہیں۔ دہکتے آواز دیتے ہوئے۔ اسے وزیولائز کیا جائے تو صرف کلوزری ایکشن بچتا ہے مندیرا کا۔ سہمی سی مندیرا کا، جو اس کے سینے سے لگی ہے، اور جس کے پٹھے اس کے بدن سے مل کر تیز تیز دھڑک رہے ہیں۔ شانتنو کو یاد ہے، اس پر اسرار رات، جب وہ گھر کی بالکنی پر کھڑا تھا، اور آسمان پر بے شمار

ستارے لہروں کی طرح بہہ رہے تھے۔ اس نے کچھ اور بھی دیکھا تھا— نہیں۔ یہ وہم نہیں تھا۔ کوئی قصہ کہانی نہیں، اس منظر نے اس حقیقت کو زندہ کیا تھا کہ کائنات میں ہم اکیلے نہیں— دور تک بچھی آسمان کی نیلی چادر میں اچانک شانتو نے کوئی چیز دیکھ لی تھی۔ ایکسٹرا ٹیرسٹریل یا ایلین ۔ دنیا کے باہر کی ایک عقلمند مخلوق...... ایک نیا ذی روح، کہیں کوئی اڑن طشتری نہیں بلکہ بہت سے تارے مل کر جیسے ایک ایلین یا ای ٹی بن گئے ہوں۔ اچانک اس کی جگہ مندیرا کا چہرہ آ گیا تھا اور اگر اس غیر معمولی حادثہ کو، کہ مندیرا خوف اور دہشت سے گھبرا کر اس سے لپٹ گئی تھی۔ کسی متعینہ تاریخ سے جوڑنا ضروری ہے تو یہ بس وہی رات تھی، جب اس نے آسمان میں ایک ایلین کو دیکھا تھا۔ اور ایلین اس کے دیکھتے ہی دیکھتے مندیرا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ گو کہ ان دلیلوں کا جواب اب سائنس سے نفسیات تک کے پاس نہیں ہے۔ لیکن ایسا ہوا اور اس کے بعد تو مہینے بھر صرف اڑتی خبریں رہ گئیں—

رائل پبلشنگ ہاؤس اور دیسائی کی مخالفت میں مندیرا کی ناراض چٹھیاں بھی چرچے میں آ گئی تھیں۔ جس میں مندیرا نے سیدھا الزام لگاتے ہوئے کہا تھا— 'رائل پبلشنگ ہاؤس کے مالک شری اشوک دیسائی کے ذریعے شمل شرما کو دی جانے والی رائیلٹی کا سارا حساب کتاب غلط ہے۔ زندگی کے آخری چند مہینوں میں شمل بار بار دیسائی سے کتابوں کا حساب مانگتے رہے۔ لیکن دیسائی کا ارادہ دینے کا تھا ہی نہیں۔ شمل کی موت کے ایک ہفتہ بعد جب پبلشر کی جانب سے یہ حساب کتاب بھیجا گیا تو وہ اتنا دکھ بھرا تھا کہ اگر اپنی زندگی میں خود شمل اسے دیکھ لیتے تو وہ رائل سے الگ ہو چکے ہوتے۔'

اخبار۔ میگزین مندیرا۔ دیسائی تنازعوں سے بھر گئی تھیں۔ مندیرا نے کچھ اور بھی شدید الزام لگائے تھے۔ کچھ الزامات تیکھے اور سخت تھے۔ جیسے رائل کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟ جونا گڑھ میں کروڑوں کی کوٹھی کا راز کیا ہے؟ مندیرا نے سیدھے طور پر جاننے کی کوشش کی تھی کہ یہ کیسا کاروبار ہے، جہاں مصنف گھاٹے میں رہتا ہے اور ایک دن شمل کی طرح اپنے ہی پیسوں کی بھیک مانگتا۔ اپنی جان دے دیتا ہے اور ناشر کروڑوں کی کوٹھیاں تیار کرتا رہتا ہے۔ خط میں مندیرا نے تیکھی زبان میں اپنی ناراضگی درج کرائی تھی کہ اگر ابھی بھی ملک میں انکم ٹیکس اور سی بی آئی جیسے ادارے حرکت میں ہیں تو وہ دیسائی جیسے گھوٹالہ کرنے والے ناشروں کی خدمت میں سامنے کیوں نہیں آتے— ؟ شمل کی کتابوں کا حوالہ دے کر مندیرا نے پوچھا تھا کہ اگر 1995 تک شمل کی

کتابوں کی مجموعی رائلٹی ایک لاکھ روپے بنتی ہے تو آج کی تاریخ میں یہ صفر کیوں ہوگئی؟ ریڈر گم ہو گئے تھے تو ناشر کو بھی گم ہو جانا تھا، لیکن ناشر تو اپنی کوٹھیاں کھڑی کر رہا تھا۔'

تنازعہ شروع ہو چکا تھا، مصنفین کے بیانات آنے شروع ہو گئے تھے۔ اس دن سگھن چکرورتی آ گیا تھا۔ ناک میں نسوار ڈالتے ہوئے اور دھوتی سے ناک پونچھتے ہوئے اس نے کہا تھا— ناشر کتابوں کے فروخت کے لیے اب قارئین پر بھروسہ نہیں کرتے— وہ سنجیدہ لہجہ میں بولا— ناشر سرکاری خرید پر بھروسہ کرتے ہیں۔ خرید کس طرح ہوتی ہے، اس کا علم مصنف کو بھی نہیں ہوتا اور ناشر اسی لیے مصنف کی پرواہ نہیں کرتے۔ جب تک کتابوں کی خرید عام نہیں ہوگی۔ مسئلہ بنا رہے گا۔'

شانتنو نے نگاہ اٹھائی۔

سگھن سامنے پڑی کتاب کے صفحے پلٹ رہا تھا۔ مگر اس کے ہونٹ چل رہے تھے— 'ہمارا کیا۔ کتاب لکھی اور مکمل کتاب ایک فلاپی میں آ گئی۔ اس چھوٹی سی فلاپی سے ناشر بازار میں کتنا بناتا ہے اس کا اندازہ آپ نہیں کر سکتے اور سچ تو یہ ہے شانتنو کہ رائیلٹی کے معاملہ میں کوئی بھی ناشر صاف وشفاف نہیں— کچھ مصنفین رائیلٹی چاہتے بھی نہیں۔ وہ خود اعلیٰ عہدہ پر رہ کر ناشر کی کتاب فروخت کراتے ہیں۔ کتنے دن چلتی ہے مندیرا کی لڑائی۔ دیکھ لینا۔'

لیکن مندیرا کی لڑائی جاری تھی اور اسی درمیان مندیرا کا ایک اور خط اخباروں میں چھپ گیا تھا— 'افسوس دکھ کے ساتھ لکھنا پڑ رہا ہے کہ رائیل پبلشنگ ہاؤس اب میرے شوہر مرحوم شمل شرما کے ناشر نہیں ہیں۔ انہوں نے کتابوں کی سیل کے تعلق سے جو اعداد و شمار ہمیں بھیجے تھے وہ مشکوک پائے گئے ہیں۔'

شانتنو کو لگا تھا، ابھی تھمے گی نہیں یہ لڑائی۔ ابھی اور آگے بڑھے گی۔ ایک نہ ایک دن تو کسی کو اس کے خلاف جنگ کا بگل تو بجانا تھا ہی۔ ممکن ہے۔ یہ لڑائی مندیرا نے شروع کی ہے تو وہ فاتح بھی ہوگی۔

لیکن— شاید ہمیشہ سے ایسا ہوتا رہا ہے۔ ہم ایک حیران کر دینے والی ایلین کی دنیا میں آج بھی رہتے ہیں۔ آج بھی رات کے کسی نازک لمحے بہت سے تارے مل کر کسی اڑن طشتری میں بدل جاتے ہیں— کوئی مندیرا بارش جیسی دھوپ کی کرنوں میں صبح کے وقت، سایہ تلاش کرتی ہوئی چیخ پڑتی ہے۔ 'کوئی ہے—'

•

اس رات وہ پھر سے باپ بن گیا تھا۔ باہر رات بہہ رہی تھی۔ آسمان پر چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر کھڑکی کھول دی تھی۔ اسکاچ ختم ہو چکی تھی۔ نشے میں شاید آدمی زیادہ سوچتا ہے پچھلی رائلٹی کی تفصیل اس کے سامنے تھی۔ اس نے کئی بار واؤچر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے دیسائی پر غصہ آرہا تھا...... شانتنو کے جی میں آیا، خالی اسکاچ کی بوتل دیسائی کے سر پر توڑ دے۔ اور کہے — سالے۔ اسی لیے میں نے کئی بار سوچا تم لوگوں کے فراڈ سے بہتر ہے کہ اپنا الگ پبلی کیشن کھول لوں۔ اپنی کتابیں خود چھاپوں...... واؤچر میں اس کی کتابوں کی پچھلی تفصیل غائب تھی۔ پچھلے پانچ برس کے حساب بھی اسے مشکوک لگ رہے تھے...... ادیب کا چولا پھینک کر اس وقت وہ صرف ایک باپ بن گیا تھا۔ ایک خالص بزنس مین — شانتنو نے واؤچر ایک طرف رکھے۔ ٹہلتے ہوئے بالکنی پر آگیا۔ کچھ پل نیلے آسمان میں پھیلے تاروں کے جھرمٹ کو دیکھتا رہا۔ پھر جیب سے موبائل نکالا اور دیسائی کا نمبر ڈائل کرنے لگا — دوسری طرف دیسائی تھا۔

شانتنو دہاڑ کر بولا — 'رات کے بارہ بج رہے ہیں سالے۔ اسکاچ کا نشہ ہرن کر دیا تم نے — شانتنو گالیاں دے رہا تھا — تیرے گھر آکر ماروں گا تمہیں......'

'ہو — ہو —' دیسائی فون پر ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا — 'آپ آجاؤ نا — ناراض کیوں ہوتے ہو، واؤچر میں گڑبڑی ہے تو ٹھیک کر لیں گے۔ ایک اسکاچ کی جگہ دس بوتلیں لے جاؤ پیارے۔'

اس کے ہنسنے پر شانتنو بھی ہنسا — 'میری برادری دوسری ہے فرنگی — تمہارے ایلیسیشن کی نسل کا ہوں — بھونکتا نہیں، کاٹ کھاتا ہوں —'

کمرے میں آنے تک جگ مگ جگ مگ رات کے سناٹے میں مندیرا کے یہاں ہونے والی گفتگو کے کچھ زہریلے لمحے اسے یاد آرہے تھے۔ اس نادر لمحہ کا یہ صفحہ جان بوجھ کر شمل نے اپنی یادداشت میں بچا کر رکھا تھا۔

'آپ نے کبھی سوچا کہ شمل جیسے ادیب کی کتابیں اتنی کم کیوں چھپتی ہیں؟'

'سب اسے ڈائجسٹ نہیں کر سکتے۔'

'لیکن وہ لڑائیاں تو سب کی لڑتے ہیں۔'

'— ہاں۔'

پھر اپنی ہی لڑائی کیوں نہیں لڑی شمل نے — ؟ میرا مطلب ہے اپنے ناشر سے؟'

جیسے بے جان سناٹے میں دہشت کی طرح کسی نے پتھر اچھال دیا ہو۔ لمحہ بھر کو مندیرا کا پورا جسم ہل گیا تھا۔

'میں ادیب نہیں؛ لیکن اس پورے معاملہ پر میں تبصرہ کرسکتا ہوں — ' شانتنو نے ارجن بان چھوڑا تھا — 'لکھتے لکھتے آپ کا ادیب ایک شرمیلا انسان بن جاتا ہے۔ دراصل وہ کسی کی لڑائی لڑنے کے لائق نہیں رہ جاتا۔ اپنی بھی نہیں۔'

اور اس کے ٹھیک دوسرے دن ہنستی ہوئی دھوپ میں دیسائی کے بنگلے میں گیٹ کھلتے ہی اس نے دوبارہ ایلیسیشن کے بھونکنے کی آواز سن لی تھی —

جنوری کی دھوپ کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ باہر لان میں کرسیاں لگی تھیں۔ دیسائی ایلیسیشن کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتا ہنس رہا تھا۔

'تو ملکۂ بنگال نے ایلیسیشن واپس کر دیا؟'

'نہیں شانتنو' — دیسائی ہنسا۔ 'ایک ایلیسیشن جاتا ہے، دوسرا آتا ہے۔ اچھی نسل کے کتوں کا شوقین ہونا چاہئے بس — '

چائے کی چسکی لیتے ہوئے اس نے دھیرے سے پوچھا — ' اور مندیرا والا معاملہ — ؟' دیسائی ہنس رہا تھا — 'تم کو معلوم نہیں، سمجھوتہ ہو گیا — ایسے معاملے اٹھتے ہیں اور بند ہو جاتے ہیں۔'

بریڈ کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس نے ایلیسیشن کی طرف پھینکا تھا، جسے ایلیسیشن نے ہوا میں ہی اچک لیا۔

سامنے، زمین پر دھوپ میں دو سائے بن رہے تھے — آنکھوں میں اچانک مندیرا کا چہرہ لہرایا — 'کوئی ہے — '

ایلیسیشن پلٹ کر دوبارہ بھونکا تھا۔ اور بدلے میں تازہ بریڈ کے کئی ٹکڑے دیسائی نے اس کی طرف اچھال دیئے تھے۔

●

گھر لوٹنے تک ایک عجیب سی خاموشی یا بوجھل پن اس کے پورے وجود پر سوار تھا۔

ماحول ایک بار پھر ویسا ہی خاموش اور بے جان تھا۔ سنے، گل بہری اور ٹیلی کے بے رس پھولوں کو دیکھتا ہوا وہ اپنے کمرہ میں آیا تو جیسے چونک گیا۔ اکیلے رہنے کی عادت کے باوجود کہیں ایک دھماکہ سا ہوا تھا۔ بتی جلائی — کھڑکی بند تھی...... لیکن کھڑکی کے پردے لہرا رہے تھے۔ اس نے پلٹ کر بستر کی طرف دیکھا۔ چادر پر ان گنت سلوٹیں ابھر آئی تھیں۔ چلتے وقت ایشٹرے میں وہ سگریٹ کو بجھانا بھول گیا تھا۔ وہاں سے ابھی بھی دھواں اٹھ رہا تھا...... کمرہ میں سجی ایک قطار سے لگی پینٹنگس جیسے یکا یک چلنے لگی ہوں۔ اچانک اس کے اندر کچھ حرکت سی ہوئی — سہمی ہوئی آنکھوں نے ایک بار پھر پلٹ کر کھڑکی طرف دیکھا — اور لہراتے پردوں کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی تیز چیخ نکل گئی — کوئی ہے — ہے —!'

ایک انجانے خوف کی ریہرسل

(ایک کہانی جمہوریت کے نام)

آج هم سبهی امریکه کا حصه بن چکے هیں/
اب کهیں کوئی جمهوریت باقی نهیں هے/

— ایک اخبار کے اداریہ سے

آپ غلط فهمی میں هیں که همارا پیچها کیا جارها هے.
آپ کو نهیں سوچنا چاهئے که هم سبهی دهشت گرد هیں۔

محسن حامد (Reluctant Fundamentalist سے)

آگے گڈّھا ہے

''آگے سڑک ٹوٹی ہے صاحب۔''

گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔ ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر ہم دونوں کی طرف دیکھا— 'گاڑی بیک کرنی ہوگی صاحب—' ڈرائیور ہنس رہا تھا— 'اصل بھارت تو جھٹکوں میں بستا ہے صاحب۔ آپ بھی جھٹکے کھاتے ہوئے چلیے۔ کیونکہ یہاں سے صرف ٹوٹی، دھنسی ہوئی سڑکیں ابھی آگے دس پندرہ کیلومیٹر تک رہیں گی۔ ابھی دو دن پہلے اس طرف گنا مزدوروں نے کافی ادھم مچایا تھا صاحب۔ اوران کی غلطی بھی کیا تھی۔ ڈیزل، بجلی مزدوری، بیج، کھاد سب کی قیمتیں تو آسمان چھو

گئیں صاحب۔ گنا مزدور آندولن نہ کریں تو کیا کریں......'

گاڑی آواز دیتی ہوئی، بیک ہوئی—— پھر جھٹکے سے پیڑوں کے بیچ راستہ بناتے ہوئے چلنے لگی۔

'آپ کو تو سب معلوم ہوگا صاحب۔ اس بار کا معاملہ ویسا نہیں۔ مزدور پہلی بار گنا کے کھیتوں میں آگ لگانے پر مجبور ہو گئے۔ اتر پردیش میں کسان ۲۱۰ بیگھا زمین کا گنا آگ کے حوالے کر چکے۔ میرٹھ میں بھی گنوں کی فصلوں میں کتنے ہی کسانوں نے آگ لگا دی۔ اس نے گھوم کر دیکھا—— سچ پوچھو تو ہم ڈر جاتے ہیں صاحب۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی سے۔ روز ہونے والے دنگوں سے اور...... وہ ہنسا تھا—— جمہوریت سے—— آپ کو ڈر لگتا ہے صاحب......؟

سامنے دور تک ننگے پیڑ کی قطاریں...... دھول بھری سڑکیں...... پیڑوں کے درمیان اوبڑ کھابڑ راستہ پر گاڑی چلانا آسان نہیں تھا—— نیلے آسمان پر بادلوں کے بہت سارے ٹکڑے جمع ہو گئے تھے۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا۔ صبح پانچ بجے ہم گھر سے چلے تھے—— کہاسے کی چادر نے سارے شہر کو اپنا شکار بنا لیا تھا—— گاڑی میں بیٹھنے سے قبل تک وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سردی کی وجہ سے دانت بج رہے تھے۔ گہری دھند کے باوجود 'ساتھی' کے چہرے کی نمی محسوس کی جاسکتی تھی۔ اس کی آنکھیں سہمی ہوئی تھیں اور پتلیوں میں کوئی ڈر بیٹھ گیا تھا۔ وہی ڈر، جسے گاڑی میں بیٹھنے سے قبل اس نے اپنے ہونٹوں سے ادا کیا تھا۔

'اسے گم ہوئے کئی روز گزر گئے ہیں......'

'پھر آپ نے گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کی۔'

'نہیں—— ' ایک بے حد سفاک اور تھرایا سا لہجہ—— ' آپ جانتے ہیں، اس کا نام اسامہ ہے......اور وہ......، کہتے کہتے اس نے اپنی پلکوں کو جنبش دی......'اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی نے اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا تھا......اور وہ ڈرنے لگا تھا......'

'مائی گاڈ—— لیکن کیوں......؟'

'بس ڈرنے لگا تھا......ڈر کی کوئی وجہ نہیں ہوتی...... چار سال کی عمر سے......'

تب ہم گاڑی میں بیٹھ چکے تھے——اور ہمارے ڈرائیور نے تب تک اپنے ہونٹوں کو

بند رکھا تھا— ہاں دو تین بار اس نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا تو میں نے اپنے ساتھی کی آنکھوں میں گہرے ہوتے ہوئے شک کو پڑھ لیا تھا—

میں نے ڈرائیور کو پیچھے نہ گھومنے کی تنبیہ کی تھی— اور ساتھ ہی میں نے اس کے چہرے پر ناگواری کے عکس کو دیکھ لیا تھا— اور اب میں اپنے ساتھ کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا— صبح کے سات بج گئے تھے۔ گاڑی کے شیشہ چڑھے تھے۔ گرم لبادے کے باوجود ریڑھ کی ہڈیوں تک ٹھنڈ اترتی جا رہی تھی......

'تو وہ آپ کا بیٹا ہے...... اور آپ نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج نہیں کرائی......' میرے لہجہ میں سختی تھی— 'صرف اس لیے کہ اس کا نام اسامہ تھا۔ اور اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی اترنے لگی تھی......'

'' آپ اسے معمولی بات سمجھ رہے ہیں......' اس بار اس نے شک کی آنکھوں سے مجھے گھور کر دیکھا تھا— 'دنیا کے کسی بھی ملک میں اس نام کا آدمی ہونا اور چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی کا اُگنا— نہیں آپ سنجیدگی سے میری باتوں کو نہیں لے رہے۔ اور معاف کیجئے گا میں نے پورے ہوش و حواس میں ایک اور لفظ کی ادائیگی کی تھی'...... کہ وہ ڈر گیا تھا— 'وہ ڈر گیا تھا۔ اور پھر ایک دن وہ غائب ہو گیا۔ اور معاف کیجئے گا— تمام ممکنات اور سوالوں کو سامنے رکھنے کے باوجود میں گمشدگی کی اطلاع یا ایف آئی آر درج کرانے پولس اسٹیشن گیا تھا۔

اور ممکن ہے، میری رپورٹ درج کر لی جاتی......

'پھر کیوں نہیں درج کرائی......'

'نہیں— ایسے نہیں سمجھیں گے آپ— میں بالکل ویسے بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ جیسا کہ یہ واقعہ میرے ساتھ پیش آیا— ایک تو بیٹے کی گمشدگی— اس کی ماں نے گھر پر روتے روتے اپنی جان ہلکان کر لی تھی— اور اس پر سے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میرا پولس اسٹیشن جانا— معاف کیجئے گا۔ پولس اسٹیشن جانا محض پولس اسٹیشن جانا نہیں تھا۔ اس میں 62 سال لگ گئے تھے— '

'62 سال— ؟' میں اس طرح چونکا جیسے گاڑی نے دوبارہ جھٹکے کھائے ہوں......

'اس کا چہرہ صفر میں ڈوبا تھا— 'ہاں، 62 سال— یہ صرف میرے بیٹے کی گمشدگی کا سوال نہیں تھا— خیر سے اس کا نام اسامہ تھا۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا...... اس کے چہرے پر......'

وہ ٹھہرا— میری طرف دیکھا— 'چونکیے مت۔ پورے 62 سال۔ آزادی سے اب تک اس ملک کی عمر گن لیجئے— گہرے سناٹے میں— میں نے انگریزوں کے کوڑے بھی کھائے۔ گولیوں کی آوازیں بھی سنیں— پھر وہ سب سہتا گیا...... یا وہ سب کسی فلم کے منظر کی طرح میری آنکھوں کے فریم میں ابھرتا رہا...... نہیں، معاف کیجئے گا— ان خوف زدہ لمحوں کی کہانی سے مجھ سے کہیں زیادہ آپ واقف ہوں گے— مگر اس ایچ او کے پاس جاتے ہوئے شاید میں اپنے لیے ایک مضبوطی قائم کر چکا تھا اور یہ میرے لیے یا میری زندگی کے لیے سب سے زیادہ چونکانے والا لمحہ تھا...... دو دن قبل اس ایچ او کے بیٹے کا انتقال ہوا تھا— اور یہ جاننا آپ کے لیے ضروری ہے— اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں اس کے اندر بیٹے کے درد کے ساتھ پہلی بار ایک انسان کو دیکھ رہا تھا— ایک ایسے انسان کو شاید جسے میں دیکھ ہی نہیں پاتا کہ اگر اس کا اپنا بیٹا دو دن پہلے نہیں مرا ہوتا۔ شاید وہ بہت کچھ کر چکا ہوتا— جو وہ مجھے ٹہل ٹہل کر بتا رہا تھا۔ ایس ایچ او نے سگریٹ سلگا لی تھی— کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر بیک وقت اداسی اور خوف دونوں کو پڑھا جا سکتا تھا— 'تو آپ کا بیٹا غائب ہے؟ دھوئیں کے چھلّے بناتا ہوا وہ ٹھہرا— اسامہ، قد پانچ فٹ دس انچ — چہرے پر ہلکی داڑھی— اور آپ چاہتے ہیں کہ اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کی جائے......

اس نے چھلا بنانا بند کیا— کچھ دیر تیز تیز ٹہلتا رہا— پھر رکا— 'وہ فائیلوں کے ڈھیر دیکھ رہے ہیں۔ جانتے ہیں ہم اپنے ناکامی پر کامیابی کی مہر کیسے لگاتے ہیں— ؟ اس نے ہنسنے کی کوشش کی تھی— دو دن پہلے میرا جوان بیٹا مر گیا۔ سمجھ رہے ہیں آپ— ہمدردی ہے مجھے آپ کے بیٹے سے۔ ورنہ دوسری صورت میں— ان ناکام فائلوں میں ایک فائیل کو اس کی کامیابی کی رپورٹ مل جاتی— ایسے— اس نے نشانہ لگایا۔ ان کاؤنٹر— سمجھ رہے ہیں آپ...... گجرات سے اعظم گڑھ اور دلی تک کے تار جوڑ دیتا...... اسامہ نام ہی کافی تھا۔ کچھ بھی کرنے کے لیے......

ریڑھ کی ہڈیوں میں برف جمتی ہوئی محسوس ہوئی۔ گہری دھند کے درمیان کانپتے ہوئے سورج کے طلوع ہونے کی گواہی مل چکی تھی— اب 'ساتھی' کی باری تھی۔

لیکن آپ اسے کیوں تلاش کرنا چاہتے ہیں......؟

اچانک خاموشی چھا گئی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے اس کی طرف مڑا— پھر گہری خاموشی میں ڈوب گیا— آخر میں اسے کیوں تلاش کرنا چاہتا تھا— ؟ یقیناً آپ کو میرے بارے

میں جاننا چاہئے— جیسے میں کون ہوں۔ کب پیدا ہوا— مجھے مسکرانے دیجئے— سلمان رشدی کے، مڈنائٹس چلڈرن کے اس کردار کی طرح جب ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء، رات کے بارہ بجے گھڑی کی دونوں سوئیاں آپس میں مل رہی تھیں۔ اور ٹھیک یہ وہی لمحہ تھا جب اس کے باپ کو ایک ٹھوکر لگی تھی (رشدی: مڈنائٹس چلڈرن کا ایک کردار)...... میں ہوا میں چھوٹتی آتش بازیوں یا آتش بازیوں سے پیدا ہونے والے خوف کا تذکرہ نہیں کرنا چاہتا— لیکن یہی وقت تھا جب میں پیدا ہوا— پھر ان 62 برسوں میں ایسی کتنی ہی آتش بازیوں کی زد میں آیا...... یا ان کا گواہ بنا— یا جیسے ہر بار ایسے حالات میں، میں آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا......

'تو کیا تم ڈر رہے ہو......؟'

'نہیں......'

'لیکن تم ڈر رہے ہو...... تم ذرا ذرا سی باتوں سے ڈر جاتے ہو...... تم ڈر جاتے ہو کہ تم اپنے ہی ملک میں بہت سارے لوگوں یا آنکھوں کے درمیان اجنبی بنا دیئے گئے ہو— تم اپنے پہناوے اپنے لباس سے ڈر رہے ہو...... تم ڈر رہے ہو کہ تمہارے چہرے پر گھنی ہوتی داڑھی کو کچھ گمنام آنکھیں بغور دیکھ رہی ہیں— تم ایک معمولی آتش بازی سے بھی ڈر جاتے ہو...... تم ڈر جاتے ہو کہ سپر اسٹار شاہ رخ خاں کو مذہب کے نام پر امریکہ ایئر پورٹ پر روک دیا جاتا ہے...... اور ایک آسٹریلین نوجوان ڈاکٹر کو اپنے لباس اور حلیے کی وجہ سے، نفرت کے کٹہرے میں کھڑا ہونا پڑتا ہے...... 9/11 سے لے کر 26/11 تک— افغان سے عراق، اور پاکستان سے لشکر اور طالبان تک...... تم بار بار ڈرتے رہے ہو...... اور شاید پہلی بار تم اس لڑکے میں اپنے ڈرنے کی وجہ تلاش کر رہے ہو......

'پتہ نہیں— ' آئینہ میں ایک ڈرا سہا چہرہ موجود تھا......

'سب پتہ ہے تمہیں۔ جیسے وہ لڑکا ڈر گیا تھا۔ اپنے نام سے— یا اپنے چہرے پر پہلی بار اگنے والی ہلکی ہلکی داڑھی سے......'

آنکھوں کے پردے پر محسن حامد کے ناول Reluctant Fundamentalist کے ہیرو چنگیز کا چہرہ ابھرتا ہے— 'میری داڑھی سے مت ڈریے۔ مجھے تو امریکہ سے محبت ہے'...... آئینہ میں ایک کمزور چہرہ جھانکتا ہے۔ مکالمے بدل گئے ہیں— 'میری داڑھی سے مت

ڈرے۔ مجھے اپنے وطن سے محبت ہے...... یہاں کی جمہوریت سے۔ آتش بازیوں سے...... اور......'

گاڑی اوبڑکھاڑ راستوں پر آگے بڑھ رہی ہے— میرا ساتھی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے...... میں بے رحم لمحوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہوں......

'ہاں تم بتا رہے تھے کہ وہ چار سال سے...... ڈرنے لگا تھا......؟

'ہاں جیسے......'

''کسی آہٹ سے، دستک سے...... کسی کی اونچی آواز سے— وہ رونا شروع کر دیتا اور دھویں سے...... تب گھر میں گیس نہیں آئی تھی۔ صبح اٹھتے ہی مٹی کے چولہے سلگ جاتے۔ چولہے سے اٹھنے والے دھویں اسے برداشت نہیں ہوتے تھے......

'کیا آپ نے کسی ڈاکٹر سے......'

اس نے میری بات درمیان میں ہی روک دی— ''نہیں— وہ دبلا پتلا تھا۔ اس کی آنکھیں ہر وقت سوچ میں ڈوبی رہتی تھیں۔ جیسے وہ دنیا اور اس کے نظام کو سمجھنا چاہتا تھا۔ بڑی گہری آنکھیں تھیں اس کی۔ مگر سامنے والے کی طرف دیکھتے ہوئے وہ آنکھیں جھکا لیتا تھا...... وہ بے حد ذہین تھا۔ عمر کے دسویں سال میں اپنے ملک پر ایک مضمون لکھنے کے لیے باضابطہ اسے اس کے اسکول سے ایک ٹرافی ملی تھی۔ اس نے اپنے ملک پر، ملک کے احسانوں پر ایک شاندار مضمون لکھا تھا— ہمیں بھی بلایا گیا تھا۔ وہ اسٹیج پر تھا۔ اسے ٹرافی دی جا رہی تھی۔ اور میں اس کا چہرہ پڑھ رہا تھا— اُف— بے حد گہری اور سہمی آنکھیں۔ کسی دس سال کے بچے کی ایسی سہمی اور خوف زدہ آنکھیں شاید میں نے پہلی بار دیکھی تھیں۔

'حیرت ہے......'

'وہ بولتا نہیں تھا— اور شاید آپ کو حیرت ہو کہ وہ اپنے ملک کے لیے کچھ نیا، کچھ بہت اچھا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک اچھا اسپورٹس مین تھا۔ اور شاید اسی لیے اسکول میں ہونے والے ہر ٹورنامنٹ یا کلچرل فنکشن میں اس کی شرکت ہوتی۔ وہ آگے ہی آگے رہنا چاہتا تھا مگر ہر بار ایوارڈ یا ٹرافی لیتے ہوئی اس کی آنکھیں— میں ہر بار اس کی آنکھوں میں پہلے سے کہیں زیادہ خوف کو پڑھ لیتا تھا— سنہ ۲۰۰۳ء تب اس کی عمر ہی کیا تھی۔ پڑوس کے ایک مکان میں آگ لگ گئی تھی۔ اس

نے ایک چھوٹے سے بچے کو بچایا تھا— سب اسے تلاش کر رہے تھے...... مگر وہ گھر میں چارپائی کے نیچے سہما سا چھپ گیا تھا......

''تو اس نے کچھ بتایا نہیں آپ کو...... کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ وہ کیا سوچتا رہتا ہے......''

'ہاں بتایا اس نے...... ابھی کچھ دن پہلے— گمشدگی سے شاید دو ایک روز قبل...... اس نے ایک خواب کے بارے میں بتایا تھا۔ ایک ڈراؤنا خواب...... جو اسے کئی دنوں سے مسلسل پریشان کیے جا رہا تھا— ٹھہریے، میں کچھ دیر کے لیے اسامہ بن جاتا ہوں۔

اور وہ خواب آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

خوف اور اسامہ

تمہارا نام؟

اسامہ عبداللہ......

'اُسامہ—؟' ہنسنے، ٹھہا کہ لگانے کی آواز...... اسامہ...... ہا...... ہاء، ماں باپ کو کوئی اور نام نہیں ملا؟'

'یہ تو ماں باپ جانیں......'

'امریکہ میں ورلڈ ٹریڈ ٹاور توڑنے کے بعد یہاں بھی پہنچ گئے...... جاؤ، اوباما تمہیں تلاش کر رہا ہے۔'

'مجھے کیوں تلاش کر رہا ہے؟'

'جان سے مارنے کے لیے...... ہنسنے کی آواز...... ہاء، ہا...... اسامہ نام ہے اور پوچھتے ہو، امریکہ کیوں تلاش کر رہا ہے۔ بش تلاش کرتے کرتے ہار گیا۔ اسے کیا پتہ، تم یہاں چھپے ہو......

'میں کہیں نہیں چھپا، دراصل مجھے کہیں چھپنے کی ضرورت بھی نہیں ہے......'

'ہوں......' ایک لمبی ہوں، کے بعد ٹھہا کے رک گئے...... سالے ہم سے زبان لڑاتا ہے۔

'نہیں۔'

'پھر یہ کیا تھا......؟

'کیا ہم اپنے بچاؤ کی کوشش بھی نہیں کر سکتے—؟ اچانک وہ کہتے کہتے ٹھہر گیا تھا—

لیکن سوال پوچھنے والا انسپکٹر ابھی بھی اس کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا تھا...... سرمہ لگی آنکھیں، چہرے پر دو پلّی ٹوپی، ہلکی سی داڑھی۔ کرتا پائجامہ...... جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں وہ اب تک پکڑے گئے تمام دہشت گردوں سے اس چہرے کو ملانے کی کوشش کر رہا ہو۔

'تم کراچی گئے ہو؟'

'نہیں؟'

'پاکستان میں کہیں بھی؟'

'نہیں۔'

'اچھا۔ کشمیر......؟'

'نہیں......'

'اچھا...... تم عبداللہ بھٹ سے کتنی بار ملے؟'

'عبداللہ بھٹ...... یہ کون ہے؟'

'جو پوچھا جائے وہی بتاؤ، کتنی بار ملے؟'

'جب جانتا ہی نہیں تو ملنے کا سوال کیا؟'

'اچھا جاوید ملک سے تمہاری فون پر کتنی بار بات ہوئی......؟'

'یہ جاوید ملک کون ہے؟'

'تو، اسے بھی نہیں جانتے — انظار شیخ؟ لطیف عجمی؟'

'میں ان میں کسی کو نہیں جانتا......'

دھماکوں کے درمیان

ساتھی کے چہرے پر خاموشی تھی۔ ''شاید اب میں آسانی سے اس کی تمام کیفیت کا تجزیہ کر سکتا ہوں — دو دن پہلے کالج میں اس کی دو لڑکوں سے کہا سنی ہوئی تھی۔ شام کے وقت سائیکل سے آتے ہوئے ایک پولس والے نے اسے روک کر کچھ پوچھا تھا — شاید میں اس کے چہرے کے مسلسل اتار چڑھاؤ کو بخوبی پڑھ رہا تھا — جیسے ایک سال پہلے 26/11 — اور اس کی برسی سے محض کچھ روز پہلے اس کا غائب ہونا — مجھے اس کا تجزیہ کرنے دیجئے — وہ اس حادثے سے باہر نہیں نکل سکا۔ اور جیسا کہ ایسے مریضوں کے ساتھ عام بات ہے، ایسے مریض

Traumatic stress Disorder کے شکار ہو جاتے ہیں — ٹھہریے — میں آپ کو بتاتا ہوں، جیسے وہ خوفزدہ ہو کر گھٹنوں میں اپنے سر کو چھپا لیتا — گھبراہٹ اور خوف سے وہ ہماری طرف یوں دیکھتا تھا، جیسے کوئی تیز دھماکہ ہمیں اس سے الگ تو نہیں کر دیگا — ؟ جیسے وہ جاگتے ہوئے بھی خوفزدہ خوابوں کی زد میں رہتا تھا۔ جیسے اس دن...... ٹی وی دیکھتے ہوئے اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی تھی...... مجھے معاف کیجئے گا۔ پہلی بار اس نے گالی دی تھی۔ ایک بھدی گالی — میں مہذب انداز میں بتاتا ہوں اس نے کیا کہا تھا — اس نے کہا تھا۔'' ہم جینا چاہتے ہیں ایک خوشحال جمہوریت میں۔ لیکن کچھ لوگ جمہوریت کی قبر کھود رہے ہیں......''

'نئے چیلنج، سائنسی انقلاب اور تیزی سے بدلتی تکنالوجی کے درمیان ہم آج بھی جمہوریت کی آس لگائے بیٹھے ہیں — عجیب سا ملک ہے یہ...... یہاں اس کی قبر کھودنے والے بھی ہیں اور بچانے والے بھی...... وہ میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا — پھر بھی جتنا بچا پاتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ ہر بار ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ مل جائے گا نا...... میرا بیٹا...... اسامہ......' اس کے چہرے پر سختی تھی۔ میں نے سمجھایا تھا اسے — ابھی ہلکی ہلکی اس داڑھی کی ضرورت نہیں۔ پاگل مت بنو...... مگر وہ کسی کی سنتا ہی کب تھا......

دھوپ نکل گئی تھی — ہوا میں دھول اڑ رہی تھی۔ گاڑی پیڑوں کی قطار سے ہوتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی — سناٹے میں لفظ گم ہو گئے تھے......

'تو آپ کو کیسے پتہ چلا کہ وہ......'

'گمشدگی کے بعد ہم نے ہمت نہیں ہاری — ہم اس کی تلاش میں بہت ساری جگہوں پر گئے۔ پھر ابھی دو دن پہلے ہمارے ایک پڑوسی نے بتایا — وہاں دھماکے ہو رہے ہیں...... چٹانیں ٹوٹ رہی ہیں۔ ڈینامائیٹ کی سرنگیں بچھی ہیں...... بہت سارے مزدور کام کر رہے ہیں...... اور ان مزدوروں میں......'

ایک دھماکہ ہوا تھا...... آگے کچھ فاصلے پر کچھ لوگ نظر آ رہے تھے...... کچھ حرکتیں تھیں۔ ادھر اُدھر بھاگتے ہوئے لوگ تھے۔ کھلا میدان تھا — اور پیڑوں کی قطار کے پاس پھاوڑے لیے زمین کھودتے ہوئے کچھ مزدور اپنا کام کر رہے تھے۔ ذرا فاصلے سے آتی ہوئی دھماکوں کی آوازیں

اب قریب آگئی تھیں — گاڑی کے شیشہ گرادیے گئے تھے — آخر اس پوری تلاش کا مقصد کیا تھا — ؟ ہم کیوں تلاش کرنے نکلے تھے؟ کنز یومر ورلڈ...... گلوبل وارمنگ کے اس عہد میں، ایک بے حد مہذب دنیامیں — جس کے ختم ہونے کی پیشن گوئی سے ساری دنیا ڈری ہوئی ہے۔ جہاں ہالی وڈ ۲۰۱۲ جیسی خوفناک تباہی کے مناظر کو کمزور انسانی آنکھوں کے سامنے رکھتا ہے۔ وہیں ایک دوسرا فلمساز ایک نوجوان لڑکی اور ویمپائر کی انوکھی محبت کو دکھا کر داد تحسین وصول کرتا ہے — ایک ختم ہوتی ہوئی دنیا اور ایک ویمپائر کی محبت — والیٹر نے کہا تھا — خدا نہیں ہوتا تو ہم اسے بنا لیتے۔ محبت نہیں ہوتی تو...... ہم اسے بنا لیتے — ؟ بے رحم پیشن گوئیوں کے درمیان انسانی محبتیں بھی اب خون سوچنے والے ویمپائر کے پاس گروی پڑی ہیں......

ڈرائیور نے زور سے بریک لیا۔ کچھ چیختے ہوئے لوگ ہماری گاڑیوں کی طرف سرعت سے بڑھے تھے۔ وہ زور زور سے ہاتھ ہلا رہے تھے — ان کے کپڑے پیلے رنگ کے تھے — سر پر پیلے رنگ کے ہیٹ تھے — آگے درختوں اور زمینوں پر چاروں طرح ڈینجر زون کے بورڈ آویزاں تھے —

ہم گاڑی سے اتر آئے۔ وہ ہمیں گالیاں دے رہے تھے...... 'یہاں چاروں طرف ڈینامائٹ بچھا ہے — راستہ بند ہے۔ چار دن پہلے سے ہم نے لاؤڈ اسپیکر پر آس پاس کے تمام گاؤں میں اعلان کرادیا تھا۔ ابھی دو دن پہلے پانچ اسکول کے بچوں کی موت ہوگئی — اور صبح بھی کچھ باہری لوگ...... وہ دیکھیے......'

دوسرا آدمی بھدی بھدی گالیاں دے رہا تھا...... ساتھی کے چہرے پر ناامیدی اور ناکامی کا ملا جلا رنگ غالب آگیا تھا۔ میں اس کی گالیوں سے پریشان تھا۔ میں سمجھانا چاہتا تھا — 'گالی مت دو...... کچھ گم ہوگیا ہے۔ ہم کسی کی تلاش میں آئے ہیں۔ یہاں اکثر کچھ نہ کچھ گم ہو جاتا ہے۔ تلاش تو کرنا پڑتا ہے نا......؟ میں اسے ملک کی، جمہوریت کی باتیں سمجھانا چاہتا تھا۔ لیکن وہ چیخ رہے تھے۔

'یہاں قبریں کھد رہی ہیں۔ وہ دیکھو......'

پانچ چھ مزدور، ہاتھ میں پھاوڑا لیے گڈھا کھودنے میں لگے تھے...... پیڑوں کے درمیان سے آگے دور تک پہاڑوں اور چٹانوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ نظر آرہا تھا......

اچانک ہوا ایک بار پھر تیز ہوگئی تھی۔ سرد لہر جسم میں اترتی جا رہی تھی...... چاروں طرف ڈینجر زون اور 'خطرہ' کے بورڈ کے درمیان جیسے ہم بے بس کھڑے تھے — لاؤڈ سپیکر پر چٹان کے گرائے جانے کی وارننگ دی جا چکی تھی...... دور بہت سے بھاگتے مزدوروں کا جمگھٹ دکھائی دے رہا تھا — ایک بھیانک تیز آواز — لڑھکتی گرتی چٹانیں — دھماکے سے بے نیاز پھاوڑے سے گڈھا کھودتے مزدور......

ہمیں وارننگ دی جا رہی تھی......

''آپ لوٹ جائیے۔ سنبھل کر جائیے — آپ آگے نہیں جا سکتے — کسی سے مل نہیں سکتے — یہاں تو روز ہی کسی نہ کسی کی جان جاتی ہے۔ روز ہی گڈھا کھونا پڑتا ہے......''

چٹانوں کے گرنے لڑھکنے کا سلسلہ جاری ہے...... ہم دوبارہ گاڑی کی طرف واپس آگئے ہیں۔ ڈرائیور اپنی جگہ اسٹیرنگ سنبھالے بیٹھا ہے...... ساتھی خاموش ہے...... شاید اتنے سارے چہروں کے بیچ اس داڑھی والے چہرے کو وہ کھوج نہیں سکا ہے......

کانوں میں اب بھی دھماکوں کی آواز گونج رہی ہے۔ اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ واپس لوٹنا ہے...... اچانک مجھے خیال آیا۔ میں نے اس بچے کی عمر تو پوچھی نہیں......

بے حد سرد ماحول میں، میرے تھرائے ہوئے لفظ گونجے تھے...... 'اچھا اس کی عمر کیا ہوگی؟ میرا مطلب ہے کب پیدا ہوا تھا وہ......؟'

یہی کوئی پانچ...... بولتے بولتے وہ ٹھہرا — نہیں...... چھ دسمبر۔ اب سترہ سال کا ہوگیا ہے......، اس کے لہجے کی برف پگھلی تھی...... تلاش ابھی ختم نہیں ہوئی...... وہ میری طرف دیکھ رہا تھا...... 'ہم اس کی تلاش آگے بھی جاری رکھیں گے...... کیوں......؟'

گاڑی میں بیٹھنے تک چٹان کے ٹوٹنے کی دوسری وارننگ لاؤڈ سپیکر پر دی جا رہی تھی — اس بار ہم نے تیزی سے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تھے۔

●❖●

بارش، جنگل اور وہ

'نہیں، محبت یہ نہیں ہوتی ہے۔'
'نہیں، محبت وہ بھی نہیں ہوتی ہے......'
'ٹھہریئے۔ محبت کے بارے میں آپ جو کچھ بھی کہیں گے، وہ جلد بازی ہوگی۔ آپ نے محبت کی ہے۔ محبت کو دیکھا ہے، آپ نے؟'
کافی ہاؤس، میز کے شور شرابے کے درمیان میں اپنے دوستوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہوا بولا — جبکہ ایسا کرتے ہوئے 'مجھے' او ہینری کی مختصر ترین کہانی کا 'بھوت' محسوس کرنے کی غلطی' وہاں بیٹھے میرے تمام دوستوں نے کی تھی۔
تبھی تو، ایک مسکرایا تھا — 'محبت کو دیکھا ہے، کہہ کر غائب تو نہیں ہو جاؤ گے؟ ہو جاؤں گا۔ اگر ایک سگریٹ نہیں پلاؤ گے۔'
ذہن میں ٹرین کی سیٹیاں گونج رہی تھیں — پتہ نہیں، کسی خالی کمپارٹمنٹ میں — بھائیں، بھائیں کرتے سناٹے — ٹرین کی سیٹیوں کے شور کے درمیان او ہینری کا وہ کردار اب تک موجود تھا یا نہیں — لیکن ایک معمولی سگریٹ کا کش، دھوئیں کے مرغولے، آنکھوں میں اُتری یاد، اور کسی حسین چہرے کا قرب محسوس کرتے ہوئے ٹھنڈی رومانی ہوا کا لمس مجھے ایک نئی دنیا میں پہنچانے کے لئے کافی تھا —

•

نہیں، تب یہ سوچنا آسان نہیں تھا۔ تب یہ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا — کیا محبت ایک

بار ہی ہوتی ہے اور دوسری بار — ؟ دوسری بار کیا ایک آسودہ حال مرد میں محبت کی جگہ ہوس کی ان دیکھی سونامی لہریں لے لیتی ہیں — ؟ اچھا مان لیا کوئی ہے، جس نے محبت کی — نباہ بھی کیا اور پھر شادی کے بعد — ؟ آگ کے دریا میں ایک دوسری شکل نظر آتی ہے تو — ؟ ایک دوسرا جسم، دوسرا چہرہ — نہیں — نپولین سے نہرو تک مجھے تاریخ کی سرنگوں میں جانے کی ضرورت نہیں۔ مگر شاید محبت سو شکل بدلنے کے بعد بھی محبت ہی رہتی ہے۔ اگر آپ ویسے ہی بھیگتے ہوں، ویسے ہی ڈوبتے ہوں اور ہر بار ویسا ہی محسوس کرتے ہوں تو......

چھپ سے، ایک معصوم سا چہرہ کوندا تھا آنکھوں میں۔

●

'نوڈلس کھلاؤ گے؟'

'نہیں۔'

'کیوں؟'

'میں نوڈلس نہیں کھاتا۔'

'مت کھاؤ۔ مگر کھلا تو سکتے ہو۔ ہا...... ہا...'

وہ ہنسی تو جیسے پھول بکھر گئے۔ مگر اُس کی ہنسی مجھے پھوٹی آنکھوں نہیں بھائی۔ کھلکھلانا بند ہوا تو اُس نے آہستہ سے میرے ہاتھوں کو چھوا، جیسے انگلیاں گن رہی ہو۔ آگ کی ایک لپٹ اٹھی۔ لیکن اُس کی نازک عمر سے گذرتے ہی سرد ہو گئی۔

'کیوں۔ کیا ہوا۔'

'کچھ بھی تو نہیں۔'

'پھر ہاتھ کیوں چھڑایا — ؟'

'بس۔' مجھے اس کی گھورتی آنکھوں سے وحشت ہو رہی تھی۔

'بس نہیں، ڈر گئے تھے...... ہا... ہا...' اس کی آنکھوں میں غضب کی شرارت پیدا ہوئی۔

پھر وہ زور سے تالی بجا کر ہنسی...... ڈر گئے...... ڈر گئے......

'ہاں ڈر گیا تھا، لیکن تم یہ سب کرتی ہی کیوں ہو۔'

'پہلے تم بتاؤ' تم ڈرتے کیوں ہو......

میرے اندر جلنے والی 'اگنی پریکشا' کو سمجھ پاتی ہوئی وہ زور زور سے ہنس پڑی— 'ایک دم سے آگ بن جاتی ہوں نا میں۔ ایک ایسی لڑکی، جو تمہاری گود میں کھیلی ہے— اب جسے چھوتے ہی تم تھرتھراہٹ اور 'گلٹ' کے درمیان کا سفر شروع کر دیتے ہو— سنو۔اب میں تمہاری گود میں نہیں سما سکتی۔ ذرا اٹھانے کی کوشش کرو مجھے۔'

•

شانتا کو اس لیے کوئی شکایت نہیں رہی اُس سے کہ وہ ہماری شادی کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ ہمارے پڑوس میں— باپ پینٹر تھے۔ ایک بڑے آرٹسٹ— عام طور پر چھوٹے شہروں میں ایسے آرٹسٹ اپنی تمام تر ممکنات کے باوجود اپنے لیے جب ایک بڑا آسمان اور تلاش نہیں کر پاتے تو فرسٹریشن کو محسوس کرنے لگتے ہیں— ڈھلّن کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ اخبار، رسائل، کتابوں کے ڈھیر اور چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی— وہ سمجھتا تھا کہ صرف اُسے میں سمجھتا ہوں۔ اپنی بڑھی ہوئی داڑھی کو کھجلاتا ہوا وہ کسی فلاسفر میں بدل جاتا— ''نئے صارف سماج میں ایک دن اپنے فن کے لیے یہ کہ پریشانی تو پیدا ہونی ہی تھی۔ پیسوں کی حکمرانی ہوگی تو فن اپنی پہچان کھو دیگا۔ ہم جیسے کہاں رہیں گے، جس کے پاس ڈیوشن اور کمیٹ مینٹس کے سوا کچھ نہیں ہے......'

میں اُسے ایم ایف حسین جیسے فنکاروں کا حوالہ دیتا— جو کروڑوں میں کھیل رہے تھے، تو ڈھلّن اچانک بجھ جاتا— سب پیسوں کا کھیل— فنکار کی روح تک گیروی پڑی ہے۔ کتنے بنتے ہیں حسین؟ بڑے بڑے آرٹ سینٹرس اور نمائش گاہوں تک کتنوں کی چیز پہنچ پاتی ہے۔ نمائش میں آنے والے کتنے لوگ فن کی پرکھ رکھتے ہیں۔ صرف بکتے ہیں نام۔ بڑے ناموں کی بولی لگتی ہے اور کسی پینٹنگ، کنڈوم یا انڈرویئر کی طرح گھر کی سجاوٹ کا ایک دانشورانہ عمل سمجھ کر گھر لے جاتے ہیں چند خریدار...... ڈرائنگ روم میں آرٹسٹ کے شاہکار کو سمجھنے کی کوشش نہیں جاتی قیمت بتائی جاتی ہے۔ فنکار صرف بکنے کی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ ابھی حال میں سنا، حسین کو کسی نے 35 کروڑ دے کر ایک سال کے لئے خرید لیا...... ڈھلّن غصے میں تھا— 'پیسوں کی طاقت نے احتجاج کی طاقت ختم کر دی ہے۔ اور ایک دن...... نئے نظام میں تمام فنون، صرف بکنے کا سامان بن کر رہ جائیں گے۔

ڈھلّن کے جانے کے بعد ساکشی آگئی۔ شانتا باہر گئی تھی۔ آتے ہی مجھے دیکھ کر اس کے

چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوئی......

''تمہارا باپ ہر وقت غصے میں کیوں رہتا ہے، میں نے پوچھا۔''

'وہ ساری دنیا سے لڑتے رہتے ہیں۔'

'مگر کیوں؟'

'اُنہیں اچھا لگتا ہے......' کہتے کہتے وہ ٹھہر گئی تھی...... اس کی آنکھیں سنجیدہ لگیں۔ چہرے کا رنگ جیسے اچانک بدل گیا—ایک سرخ رنگ اس کے چہرے پر ہوا کے جھونکے کی طرح آیا اور اس نے نظر جھکالی۔

'باپ ساری دنیا سے ناراض رہتا ہے اور تم......؟''

ساکشی دھیرے سے ہنسی—'میں تو بس محبت جانتی ہوں۔ یہ لفظ ہی مجھے دیوانہ کر دیتا ہے۔ اڑنے کا من ہوتا ہے...... آسمان چھونے کا۔ تتلیاں بن جانے کا...... اور...... بارش کا جھرنا......' وہ میری طرف دیکھ رہی تھی...... اور تم......؟'

—میں نہیں جانتا—'

''سب جانتے ہو تم...... مگر ڈرتے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیوں ڈرتے ہو۔ بیٹی کی عمر کی ہوں تمہاری...... یہی نا...... گر بیٹی تو نہیں نا......'' وہ ہنس رہی تھی۔ میں خود نہیں جانتی ایسا میرے ساتھ کیوں ہوا۔ مگر شاید چھوٹے پن سے ہی تمہاری عادت پڑ گئی تھی اور پھر اچانک ایک دن...... آئینہ دیکھتے ہوئے آئینے میں تمہیں پایا تو حیران رہ گئی۔ تم موجود تھے آئینے میں۔ میری طرف دیکھتے ہوئے...... گہری آنکھوں سے۔ کنپٹی کے بال تھوڑے سے سفید نظر آئے مجھے...... جی چاہا...... پاپا کا برش اٹھاؤں اور اُنہیں کالے سے پینٹ کر دوں۔ پھر دیکھا تمہیں—لگا، کالے سے زیادہ سفید میں جم رہے ہو تم...... اپنی پوری مردانگی میں اور میچوریٹی میں—''

کمرہ جیسے خاموش اور بوجھل ہو گیا۔ ہوا رک گئی۔ وقت ٹھہر گیا۔ بدن میں ایک تھرتھراہٹ سی ہوئی۔ ساکشی کچھ آگے بڑھی تھی۔ اب اس کے چہرے پر شرم وحیا کا ذرا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ ایک محبت کرنے والی مضبوط عورت کا جنم ہوا تھا اس میں— جو اپنے محبت کے حق کے لئے لڑ سکتی تھی۔ یہ حق بیوی سے بھی چھین سکتی تھی۔ اس لئے کہ ان سب کا جواب تھا اس کے پاس— دھیرے سے اُس نے میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں سے چھوا اور جیسے صرف انگلیوں کے لمس سے ایک کنکپی سی دوڑ گئی ہو...... کسی گہرے نشے کی طرح اُس نے ہاتھوں کو چوم لیا...... 'اُس

کی آنکھوں میں روشنی کے انگنت ستارے جھلمل کر رہے تھے۔ مانو، مت مانو...... تم بھی محبت کرتے ہو مجھ سے...... بولو کرتے ہو یا نہیں......'

اُس کے ہونٹ چپکے سے میرے ہونٹوں پر آ گئے...... جیسے چھنا کا ہوا۔ کسی نئے کھلے گلاب کے احساس میں بھی اتنی تازگی نہیں ہوتی۔ نہ اتنی گرمی، نہ اتنی جلن، نہ اتنی آگ...... اور اسی لمس کے ساتھ شانتا کے احساس نے گناہ کا احساس بھی کرایا تھا۔ جھٹکے سے اپنے جسم کو الگ کیا تو ساکشی مجسم سوالی بنی، آنکھوں میں غصہ لئے پوچھ رہی تھی۔

'مجھے میرے حق سے محروم کیوں رکھتے ہو' وہ غصے میں تھی۔ کیوں کیا الگ مجھے— جبکہ تم بھی یہی چاہتے تھے۔ سچ بولنا سیکھو— سب کے لئے سچ بولتے ہوئے اپنے آپ سے جھوٹ کیوں بولتے ہو؟ کہہ دو میرا آنا اچھا نہیں لگتا۔ یا اس طرح میرا چومنا...... لیکن تم ڈرتے ہو۔ اس ڈر کو خود سے الگ کیوں نہیں کرتے تم؟ ایک سچ شانتا ہے تو ایک سچ میں ہوں۔ شانتا کا کوئی سچ نہیں ہے، یہی نا؟ اور شانتا کا اگر کوئی ایک سچ ہوتا تو؟ کیا کر لیتے؟ یا کیوں کچھ کرنا چاہئے تھا تمہیں؟'

ساکشی کی آنکھیں میری آنکھوں میں اُتر گئی تھیں— سارے سچ الگ ہوتے ہیں۔ یہ بھی مجھے بتانا پڑے گا تمہیں۔ اور یہ بھی کہ محبت ایک فطری عمل ہے، محبت کی نہیں جاتی— 'صرف تم سے اس لئے پیار نہیں کروں کہ تم میرے باپ کی عمر کے ہو، یا میرے باپ کے دوست ہو، ایسا تو کسی مذہبی کتاب میں بھی نہیں کہا گیا...... پھر کیوں نہ کروں تمہیں پیار، کیوں نہ چاہوں۔'

دیوار پر عرصے سے رکی ہوئی پینڈولم گھڑی جیسے چلنے لگی ہو۔ ایک بار کو لگا، کمرے میں زلزلہ کا جھٹکا آیا ہو...... در دروازے، کھڑکیاں سب جھول رہے ہوں...... اندر جیسے ایک گہرا سناٹا پھیل گیا تھا— اور سناٹے کی متعدد شاخیں جیسے زندہ ہو گئی تھیں— کمرے میں آئے زلزلے کی زد میں—

آدتیہ کپور کا کنفیشن

میں، یعنی آدتیہ کپور۔ میں نہیں جانتا، ایسی کوئی کہانی اگر آپ کے ساتھ شروع ہوئی ہوتی تو آپ کیا کرتے۔ خاموشی سے اندر ایک 'گلٹ' کو چپ چاپ بڑا ہوتے دیکھنا کیسا ہوتا ہے؟ آپ مجھے یہ دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ میرا بیٹا ہے آلوک۔ دہرہ دون میں پڑھتا ہے۔ گیارہ سال

کا ہے۔ساکشی صرف سات سال بڑی ہے اس سے۔دونوں سامنے ہوتے ہیں تو بھائی بہن لگتے ہیں۔دونوں بھائی بہنوں کی طرح جھگڑا بھی کرتے ہیں۔اب اُسی دن کی بات ہے......آلوک کو تلاش کرتی ہوئی وہ کمرے میں آ گئی— ہمیشہ کی طرح ہوا کے رتھ پر سوار— گھر میں آلوک کی موجودگی کا احساس میرے 'گلٹ' کو اور بڑھا دیتا ہے۔ساکشی نے دھیرے سے میرے ہاتھوں کو تھام لیا......

'کہہ دو تم مجھے پیار نہیں کرتے......'

'نہیں کرتا......'

'آلوک کی قسم؟'

'آلوک کی قسم......' آہستہ سے میرے منہ سے نکلا اور جیسے ایکدم سے چونک گیا۔کہیں اندر ساکشی کے لیے خوشگوار ہوا کے کچھ جھونکے ہوئے تو...... یہ آلوک کی قسم کیوں کھالی میں نے...... ہے بھگوان...... یہ مجھے کیا ہو گیا......'

دوسرے دن صبح آلوک سے لڑتی ہوئی وہ میری طرف دیکھ کر ہنسی تھی— 'قسم سے آزاد ہو جاؤ۔آلوک کے لیے سو روپے کا پرساد چڑھا کر آ رہی ہوں میں......'اس کے سفید دانت موتیوں کی طرح باہر نکل کر آ گئے تھے......

'کیسا پرساد......' شانتا باہر نکل آئی تھی۔

'مندر گئی تھی...... آلوک کی لمبی عمر کے لئے بھگوان کو پرساد چڑھا دیا......

تنہائی کے لمحوں میں ایک بار پھر وہ میرے سامنے تھی— 'جھوٹی قسم مت کھایا کرو۔پاپ لگتا ہے۔بار بار پرساد چڑھانے کے لیے پیسے دوگے مجھے—اپنی دوسری پتنی کو— چھوٹی پتنی کو؟'

●

ساکشی ہنستے ہوئے بھاگ گئی تھی......'میں' یعنی آدتیہ کپور...... وہ ٹھہاکے ابھی بھی میرا تعاقب کر رہے ہیں۔خاص کر اُس کے آخری لفظ......'میرا بھی بیٹا ہے وہ...... میں نے جنم نہیں دیا تو کیا ہوا......'

جیسے اندر کتنے ہی گلیشیئر ایک ساتھ ٹوٹتے بہتے جا رہے ہیں......

نہیں، تب یہ سوچنا شاید آسان بھی نہیں تھا کہ محبت کیا بس پہلی بار ہوتی ہے۔ اور دوسری بار—؟ گھر یا خاندان میں بٹ جانے کے بعد بھی کیا ایک گمنام سی خواہش کہیں باقی رہ جاتی ہے— کہیں کوئی اندر دبی ہوئی 'چور' خواہش— جو گیلی لکڑی میں آگ کے شعلے سی بھڑک جاتی ہے— نہیں، تب شاید کچھ بھی سوچنا آسان نہیں تھا۔ شانتا کے لئے ساکشی ہر بار ایک چھوٹی سی بچی تھی— جو بچپن میں روتی ہوئی، اپنے گھر سے بھاگ کر خاموشی سے اُس کی گود میں سما جاتی— تب کی یادوں کی ایک لمبی دنیا آباد— ایک چھوٹی سی بلّی تھی— کٹی— جاڑے کے دنوں میں کٹی چپ سی اس کے لحاف سے سما جاتی۔ ساکشی اس سے کہانیاں سنتی تھی، ایک بار کہانیاں سنتے ہوئے کٹی کی جگہ ساکشی لحاف میں گھس آئی تو پہلی بار چونکا تھا وہ— ساکشی کے ہاتھ گرم تھے۔ چہرے کا رنگ بدلا تھا۔ وہ تھوڑا جھجکی تھی۔ تب تیرہ کی تھی ساکشی۔ پورا جسم خاموشی سے جیسے اس کے جسم پر ڈال دیا— اس کے ہونٹ سوکھے پڑے تھے...... کھڑکی کے پچھواڑے ایک جنگل آباد تھا...... شانتا ہاتھوں میں چائے لے کر آئی، تو آدھی نیند میں سوئی ساکشی کو دیکھ کر بولی...... 'ہماری بھی بیٹی ہوتی تو......' شانتا شاید پہلے 'مس کریج' کو یاد کرتے ہوئے لوٹ گئی تھی...... لیکن 'ہماری بھی بیٹی ہوتی تو'...... اس لفظ نے جیسے اندر ایک آگ سی لگا دی تھی۔ کہیں کونے میں بیٹھی کٹی نے آہستہ سے میاؤں کیا تھا۔ اُس نے کٹی کی طرف دیکھا— ساکشی کو لے کر آنکھوں میں واضح طور پر ایک غصہ سا جھلک رہا تھا۔ میرے اندر کنکپنی سی تھی— آہستہ سے ساکشی کے ہاتھ میرے سینے تک آگئے تھے اور...... میں...... اس عجیب سی حالت کو لے کر شاید کسی نفسیاتی دباؤ میں تھا— کھڑکی کھولی۔ اندھیرے میں گھنا جنگل آباد تھا۔ جنگل کے ایک طرف دو تین چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں۔ اور کچھ دوری پر ایک چھوٹی سی مسجد۔ لیکن اس وقت جیسے گھنے جنگل کی ویرانی نے مجھے اپنے میں ڈھک لیا تھا......

کیا یہ میرے اندر کسی 'لولیتا' کی واپسی تھی۔ رات کے وقت کسی لمحے شانتا کو اپنی بانہوں میں لئے دیر تک ساکشی کا چہرہ آنکھوں کی اسکرین پر فریز تھا۔ ایک ٹک۔ جیسے ستاروں کے کارواں کے درمیان بس ایک چہرہ ٹھہر گیا ہو— بس گیا ہو...... یا پھر شانتا سے مباشرت کے وقت جب اچانک چھوٹی سی 'لولیتا' کا چہرہ آنکھوں میں کوندتا تو جیسے اپنے بنائے گئے اخلاقیات کے خول میں ننگا ہو جاتا— شانتا غائب ہو جاتی— اندھیرے میں کہیں ساکشی ہوتی۔ ساکشی کی شرارتی انگلیاں— جوان سانچے میں آہستہ آہستہ ڈھلنے والا اس کا توبہ شکن جسم ہوتا— اچانک جیسے

ہزاروں کی تعداد میں چیونٹیاں میرے اندر داخل ہو جاتیں۔ جسم یکا یک آگ سے برف بننے لگتا تو شانتا کروٹ لے کر پوچھتی...... کیا ہو گیا— ممکن ہے بڑھتی عمر کو لے کر یکس کے لئے میرے خاموش رویئے کو۔ لے کر، وہ اپنے سوالوں کی گواہ تو بن جاتی— لیکن اُس کے جسم سے ہٹنے کے بعد بھی ساکشی لہراتی، بل کھاتی مجسم سوال بنی اپنی بڑی بڑی خوفزدہ آنکھوں کے ساتھ، رات کے سناٹے میں بھی مجھے دیکھ رہی ہوتی—

'ڈرتے کیوں ہو۔ میں بھی ایک سچ ہوں۔ جیسے ایک سچ شانتا ہے۔ میں ندی کو مانتی ہوں۔ کیونکہ اس میں لہر ہے، جوش ہے، روانی ہے— مجھے بہنا اچھا لگتا ہے— مگر عمر کے احساس کو نہیں مانتی میں......'

•

ساکشی کے بڑے ہونے کے احساس تک، کتنی ہی کہانیاں اس کی زندگی میں شامل ہوتی چلی گئیں— کبھی کوئی شادی بیاہ— ساکشی کا نئے کپڑے پہن کر سب سے پہلے اس کے پاس آنا— شانتا کا رسوئی میں ہاتھ بٹانا— مگر عام طور پر کھانا کھلانے کے لئے وہ ہر بار شانتا سے لڑ جاتی— مجھے 'کھلانے دو نا'...... ایک بار پیار سے شانتا نے کہا تھا— 'میرے سارے حق چھینتی جارہی ہے وہ......'

تب چھن...... سے ہوا تھا......

اُس رات پھر بستر پر سانپ بنتے ہاتھوں کو شانتا نے یکا یک احتجاج میں بدل دیا......

'شاید اپنی بٹیا بھی اتنا نہیں کرتی، جتنا ساکشی کرتی ہے......'

باہر گھنا جنگل آباد تھا۔

سانپ بنتے ہاتھ...... چھپکلی کی طرح دیوار سے گرے...... سرد ہو گئے...... وہ ایک بار پھر اپنے محاسبہ کے پُل سے گزر رہا تھا— وجود میں دہشت طاری تھی—

'......آدتیہ کپور...... یہ سب کیا ہے۔ پروورٹیڈ تو نہیں ہو رہے تم...... ساکشی تمہاری بیٹی کی طرح ہے...... ساکشی کی آواز حملہ کرتی...... 'طرح نا...... بیٹی تو نہیں ہوں،' آدتیہ کپور...... آواز پھر حملہ کرتی...... جیسے سنسان جنگل آنے والی تیز ہوا کے تھپیڑوں کے درمیان سلگتا ایک جسم آہستہ آہستہ سرد پڑ جاتا ہے۔

اس کے ٹھیک دوسرے دن کا واقعہ...... شانتا سویرے ہی ناشتہ سے فارغ ہو کر چلی گئی تھی۔ پڑوس میں کوئی پوجا پاٹھ تھا۔ ساکشی جیسے انتظار میں تھی۔ شانتا کے باہر نکلتے ہی جسم لہراتی کمرے میں حاضر۔ یہ ٹھیک وہی وقت تھا، جب وہ ٹاویل باندھے غسل کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔ کھٹکا ہوا اور سامنے ساکشی کھڑی تھی۔

ہوا رُک گئی۔ جیسے وقت ٹھہر گیا۔ ساکشی اب سترہ کی ہو گئی تھی...... وہ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھی اور اچانک جیسے میرے اندر کوئی شعلہ سا لپکا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک گناہ کا احساس— آگے بڑھنا چاہا تو ساکشی سامنے آکر دیوار کی طرح تن گئی...... اس کی آنکھیں جل رہی تھی...... ہاتھ کانپ رہے تھے...... گالوں، ہونٹوں پر تھرتھراہٹ تھی۔ اُس کے ہاتھ آگے بڑھے۔ ننگے سینے پر سانپ سے رینگے— میں نے یکا یک آنکھیں موند لیں— جیسے یکا یک زلزلہ کا احساس ہوا ہو— زمین میں دراڑ پڑ گئی ہو— مکان ہلنے لگا ہو۔ ساکشی کے پیاسے ہونٹ میرے ہونٹ پر آ گئے اور یکا یک آدھی رات کے سناٹے میں شانتا کے بولے گئے جملوں کی آندھی چل پڑی...... شاید اپنی بٹیا بھی اتنا نہیں کرتی جتنا کہ ساکشی...... کرتی ہے۔

ہوا رک گئی...... ساکشی کے ہاتھ انگارہ بن گئے تھے۔ دہکتے آگ کے شعلے— لیکن جیسے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو گئی تھی۔ اپنی ہی آگ سے گزرتا ننگا سا، لڑکھڑاتا۔ ساکشی کو ذرا سا دھکا دیا تو وہ جیسے امربیل' کی طرح لپٹ گئی— اور دوسرے ہی لمحہ— میں جیسے گناہ اور پچھتاوے کی آگ کے درمیان تھا— میں نے ایک تیز تھپڑ لگایا تھا۔ تھپڑ کی گونج ہوئی تھی۔ تیزی سے ساکشی ہٹی— غور سے اُس کی طرف دیکھا— پھر تیزی سے ہنستی چلی گئی۔

'لو آج حق بھی لے لیا۔'

'حق......'

'تمہارے تھپڑ— اس نے چہرہ گھمایا...... اس کے گال لال ہو رہے تھے۔ آگے بڑھ کر اس نے سچ مچ میرے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ پھر تیزی سے پیچھے ہٹی— 'اب مٹاؤ خود کو— اس نے گال کی طرف اشارہ کیا— یہ تم ہو۔ تمہارا نشان— میں اسے زندہ رکھوں گی۔ وہ ہنس رہی تھی...... 'جاؤ نہا لو...... مگر ایک بات کہوں گی۔ ڈرتے ہو تم۔ لیکن سچائی یہی ہے، سوچتے ہو میرے بارے میں— شاید سارے کے سارے لمحے— آزاد نہیں ہو پاتے میرے احساس سے۔ اور نہ ہو پاؤ گے کبھی۔'

وہ جانے کو مڑی — پھر ٹھہری — 'دنیا بدل رہی ہے آدتیہ۔ تم بھی بدل جاؤ۔'

'آدتیہ'...... آج پہلی بار اس نے میرا نام لیا تھا۔ آدتیہ۔ یہ نام ...... جیسے ذہن میں گونج رہا تھا۔ میں شاور کے نیچے کھڑا تھا۔ پانی میں بھیگتا ہوا۔ شاور سے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ سر پر پڑ رہے تھے — مگر اس کی آواز لگاتار حرکت میں تھی ...... آدتیہ ...... آدتیہ ...... آدتیہ ......

لفظ بازگشت کر رہے تھے ...... بھیگے ننگے بدن میں یہ گونج بھیانک حد تک اپنے 'ظلم' اور بربریت' کا احساس کرا رہی تھی ......

●

میری زندگی میں آنے والی تبدیلی کو شاید شانتا نے کبھی نہ سمجھ پانے کا من بنا لیا تھا۔ لیکن کیا سچ مچ کوئی تبدیلی میرے اندر آئی تھی؟ کسی گناہ کے عمل سے گزرتے وقت کتنی ہی بار اپنے ہی خیالوں کا قتل ہوتے دیکھتا رہا — چھوٹی چھوٹی باتوں میں ساکشی اب اپنے پیار کا حق مانگنے لگتی تھی۔ مجھے لگتا تھا، اس کشمکش کو میرے یا ساکشی کے علاوہ بھی سارے' سمجھ رہے ہوں گے — جیسے آسمان، زمین، میرے بیڈ روم میں لگا آئینہ — میرے گھر کے جاگتے کونے کترے ...... جہاں ساکشی ہر بار اپنے جوان ہونے کے احساس کے ساتھ مجھے محبت کا سبق بھی پڑھا جاتی تھی — شاید وقت کے بہاؤ سے کمزور ہوا تھا میں۔ اس کا لمس ایک نہ چاہنے والی خوشی دینے لگا تھا — مگر تبھی مجھ میں' یا میرے اندر دوبارہ روشنی ہو جاتی — اور جیسے آگ کا گولا برف کی سلّیوں کے درمیان داخل ہوتا ہوا سرد سا ہو جاتا۔ مجھے تعجب یہی تھا کہ گھر کے کونے کترے سے دیواروں تک کو خبر ہونے کے باوجود شاید اس سچ کا احساس کسی انسانی جسم کو نہیں تھا — نہ آس پاس کے لوگوں کو — نہ میرے گھر نہ ساکشی کے گھر والوں کو — سوچتا تھا، ایسی بہت سی کہانیاں وقت کے صفحات پر بے رحمی سے پھیل جاتی ہیں پھر ختم ہو جاتی ہیں — ان دنوں ڈھلّن اچانک ہی ساکشی کی شادی کو لے کر فکر میں پڑ گئے تھے۔ کچھ بیوی کا بھی دباؤ تھا۔ کچھ ٹوٹتی صحت اور زندگی سے ہارنے جیسی مایوسیوں کا ...... کہ اب جلد ہی ڈھلّن ساکشی کی ذمے داری سے بری ہونا چاہتے تھے۔

یکا یک کہیں ڈال سے ایک پتہ ٹوٹا۔ کوئی خاموش سی چیخ گونجی ...... اور گھنے جنگل سے آتی سرسراتی ہوا نے جیسے اندر تیز طوفان اٹھا دیا — آنکھوں سے کچھ فاصلے پر کھڑی ساکشی سہمی ہوئی ایک ٹک اُس کی طرف دیکھ رہی تھی — چوکی پر تکیے سے ٹیک لگائے ڈھلّن سر نیچا کئے آہستہ

آہستہ اپنے الفاظ کی برف بتا رہے تھے......

''فن کی قدر و قیمت بدل گئی— محاورے بدل گئے— دنیا اکیسویں سے بائیسویں صدی میں داخل ہوگئی۔ مگر...... دوسرے کو کب تک الزام دیتے رہیں— ہم ہی نہیں بدلے— نظریئے بدل گئے— رنگ اور کینوس بدل گئے...... ہم بھی تھوڑا بدل جاتے تو...... کھوں...... کھوں......''

ڈھلّن کو کھانسی اٹھی تھی— آج فن مصوری ایلیٹ طبقے کی چیز ہوگئی ہے— اور ہم ابھی بھی قدیم آرٹ کے طور پر اُسے ڈھوئے جا رہے ہیں— نئی ذہنیت کی ذرا سی روشنی اپنے آرٹ کو دی ہوتی تو...... شاید ابھی اتنا بڑھاپا نہیں آتا...... کھوں...... کھوں...... ڈھلّن ٹھہرے...... اپنی بربادی اور ناکامیوں کے درمیان میری اپنی زندگی تو کٹ گئی مگر ساکشی......

ساکشی دیوار کے سائے سے لگی کھڑی تھی......

ڈھلّن دھیرے سے بولے تھے'— ایک لڑکا نظر میں ہے۔ پینٹر ہے۔ اتفاق سے پچھلے ہفتہ ملاقات ہوئی۔ وہ میری طرح نہیں— لیکن مجھے گرو مانتا ہے— اس کی اُڑان لمبی ہے۔ سوچتا ہوں...... ساکشی کا......'

●

جیسے ایک کے بعد ایک گولے چھوٹتے چلے گئے۔ ساکشی دیوار سے لگ گئی۔ جب میں نے اس طرف نگاہ کی۔ محسوس ہوا، وہ اپنے احساسوں کی جھاگ میں کانپ رہی ہو— چہرا پیلا پڑ گیا ہو۔ شانتا باورچی خانہ سے چلی آئی تھی۔

''بھیا اچھا کیا آپ نے۔ اچھے لڑکے ملتے کہاں ہیں۔ دیکھو تو کیسے شرما گئی......'

ساکشی تیزی سے بھاگی تھی— میں بے حس اور حیرت زدہ تھا— بھلا میرے سوا اس کے آنسو کس نے دیکھے تھے۔ لیکن وہ آنسو، عام آنسوؤں کی طرح مجھے کمزور نہیں لگے۔

میں یکا یک خاموش ہوگیا تھا۔ یکا یک پہلی بار لگا، جیسے کسی نے میرے اندر زور سے مکا مارا ہو۔ ساکشی کو لے کر اب تک ایسا کوئی احساس میرے اندر کبھی نہیں جما— مگر اس وقت اچانک غیر متوقع طور پر اس کی شادی کی بات کو لے کر......

ڈھلّن چلے گئے تو میں ایک بار پھر کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا— باہر جنگل آباد تھا۔

درخت ہل رہے تھے۔ جنگل سے آتی ٹھنڈی ہوا، مجھے آنے والے وقت کے بھیانک تھپیڑے کا قصہ سنا رہی تھی— مگر مجھے کیا خبر تھی— کہ جنگل کی آگ اتنی تیزی سے بھی بھڑک سکتی ہے۔

اور آخر میں بارش

اس دن بارش ہو رہی تھی۔ پیٹ پیٹ کر مسلا دھار بارش اور یہی وہ وقت تھا، جب اس کہانی کا پردہ اٹھنے والا تھا— بارش مجھے بے حد پسند ہے۔ بارش کی ہزاروں پیاری یادیں ہیں میرے پاس۔ بارش آج بھی ایک خوبصورت فینٹیسی ہے میرے مجھے کسی یوٹوپیا یا کسی بے حد خوبصورت دنیا میں پہنچانے کے لیے— بارش میرے لئے صرف ایک بارش نہیں، بلکہ میرے اپنے جذبات کے رم جھم جھرنے میں بھیگنے جیسا پیارا احساس ہے— جیسے سمندر کی لہریں ہوتی ہیں...... سناٹی، اندھیری رات میں ساحل پر کھڑے سمندر کی اٹھتی لہروں کو پتہ نہیں کبھی آپ نے دیکھا ہے یا نہیں۔ ان کے شور سنئے— اور سناٹے میں دور سے چلی آ رہی لہروں کو یکا یک اچھال لیتے ہوئے دیکھئے— کچھ یکا یک 'اچھلا' تھا میرے اندر— میرے پورے وجود کو جھنجھوڑتا ہوا— سمندر کی لہروں کی طرح۔ اور اس دن کی خوبی یہ تھی کہ مسلا دھار بارش ہو رہی تھی' اور جیسے زندگی کا سوال نامہ تیار کرنے والے نے میرے لیے اگنی پریکشا کے ایسے سوال تیار کیے تھے کہ مجھے خود پر تعجب تھا۔

اور اس واقعے کے ایک دن پہلے یا تو سب کچھ معمول پر تھا یا سب کچھ معمول پر نہیں تھا— ہاں، اس دن بارش کے اشارے مل چکے تھے۔ اس دن کئی واقعے سرزد ہوئے— ڈھلن ساکشی کی شادی کی تاریخ رکھ آئے تھے— دو مہینے بعد شادی تھی— سب کچھ میرے گھر پر ہی تھا— بار بار، کچھ فاصلے پر بیٹھی اپنے ناخنوں کو چباتی ساکشی، پلٹ کر میری طرف دیکھ لیتی۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ اس دن صبح سویرے فون کی گھنٹی نے ایک منحوس خبر بھی سنائی تھی۔ شانتا کے اکلوتے چاچا گزر گئے تھے۔ وہ صبح سے روئے جا رہی تھی۔ آلوک کو لے کر تین بجے کی گاڑی پکڑنی تھی۔ تیسرا واقعہ مجھ سے جڑا تھا۔ مجھے بخار تھا۔ شانتا کو یہ بھی فکر تھی کہ گھر پر کوئی نہیں ہوگا۔ میری دیکھ بھال کون کرے گا۔

'بھائی صاحب، یہ تو کچھ بھی نہیں جانتے، گھر میں کون چیز کہاں رکھی ہے۔ انہیں کچھ بھی نہیں پتہ۔ میں تو کل ہی چل دوں گی۔ مگر آج رات......'

شانتا، سورگیہ چاچا کی یاد میں پلّو سے آنکھیں پوچھ رہی تھی — ڈھلّن نے پلٹ کر دیکھا تھا — ٹھیک یہی وقت تھا جب جنگ کی طرح بارش نے، نگاڑے کی تھاپ پر، اپنی پہلی موجودگی کا احساس کرایا تھا — کڑکڑاتے بادلوں کی گونج اٹھی تھی۔ لیکن بادلوں کی گھڑگھڑاہٹ میں ساکشی کے برف ہوتے لفظ بجنے لگے تھے —

'تم جاؤ دیدی۔ میں ہوں نا۔ آج رات میں یہیں رک جاؤں گی۔ ان کی پوری طرح سے دیکھ بھال کروں گی۔'

'لو...... پرابلم ہی سالو......' ڈھلّن ہنسے —

شانتا محبت سے مسکرائی — بس ساکشی ہے تو مجھے کوئی فکر نہیں۔ ساکشی انہیں سنبھال لے گی۔

ساکشی کا چہرہ جذبات سے عاری تھا — سر جھکائے، ہاتھوں کے ناخن اپنے رس بھرے ہونٹوں سے کترتی......

پھر ایک ساتھ کتنے ہی بادل گرج اٹھے۔

میرے اندر سمندر کی لہریں پہلے سرد تھیں لیکن جیسے جنگ کا بگل بجنے کے بعد — ان لہروں کا جوار بھاٹا اٹھنا شروع ہو گیا تھا۔

ڈھلّن چلے گئے۔ دو بجے آلوک کو لے کر شانتا چلی گئی۔ میں اندر چلنے والی کشمکش کو سنبھالتا آگے بڑھا تو مجھے باہر کا دروازہ بند کرنے کی آہٹ سنائی دی — یہ ساکشی تھی — اور اب پورے گھر میں صرف ہم دونوں تھے — اور یہی وہ لمحہ تھا جب بارش کی تھوڑی تھوڑی بوندیں برسنی شروع ہو گئی تھی۔

●

میں کمرے میں آ گیا...... سانسیں پتہ نہیں کیوں تیز تیز چل رہی تھیں۔ دروازہ کھلا رکھا تھا۔ ساکشی کے ہونے کا احساس مجھے اندر تک برانگیختہ کر رہا تھا — شاید میرا بخار بڑھ گیا تھا — پیشانی جل رہی تھی۔ کنپٹیاں سلگ رہی تھی...... میں ہر آہٹ پر کان لگائے ہوا تھا...... ایک دو...... لیکن ساکشی نہیں آئی...... کہاں رہ گئی۔ پاؤں میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ اٹھا...... چل کر ذرا باہر آیا۔ باہر چوکے پر ساکشی اوندھی لیٹی تھی...... وہ رو رہی تھی...... اس کی سسکیاں مجھے اندر تک چوٹ پہنچا

رہی تھیں۔ بارش دھیمی ہو رہی تھی...... ساکشی سے ذرا سے فاصلے پر، چھجے سے پانی ٹپک رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اندر کے بخار کو بہنے سے روکا— ساکشی کے پاس گیا تو اندر دبا لاوا پھٹ جائے گا۔ جیسے کوئی جوالا مکھی ہوتا ہے...... سویا ہوا جوالا مکھی— مجھے لگا، میرا لمس پاتے ہی پھٹ جائے گی وہ...... چھجے کے پاس والا برامدہ بھیگ گیا تھا...... میں نے اپنے پاؤں واپس کھینچے...... بستر پر آ گیا...... لیٹ گیا......

سامنے دیوار گھنٹی ٹن...... ٹن...... ۳ کے گھنٹے مار رہی تھی— پینڈولم جھول رہا تھا۔ اچانک جیسے پورا جسم ایک پینڈولم ہو گیا— وہ آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

اس کے ہاتھوں میں چائے تھی۔ چائے پاس والی میز پر رکھ دی— دوا کے ٹیبلیٹ اس کے ہاتھ میں تھے— پانی گلاس اور ٹیبلیٹ لے کر وہ پاس آئی۔ آہستہ سے پیشانی کو چھوا اور چونک گئی۔

'دوا کھا لو۔ جانتی ہوں سوئے نہیں ہو— ناٹک مت کرو— تیز فیور ہے۔'

میں نے دیکھا، اس کی آنکھیں رونے سے پھول گئی تھیں— اس نے آسمانی رنگ کی شلوار پہن رکھی تھی۔ آسمانی بوٹے والا جمپر...... اس کے ہاتھ بے حد پیارے تھے— پہلی بار اس کے ہاتھ سے دوا لیتے ہوئے جیسے میں اس کے جسم کو دیکھ رہا تھا— جوانی کے سارے رنگ اور آگ اور اُس کے بدن میں سمٹ آئے تھے— گورا رنگ، لمبے بال، لانبی گردن...... بے حد نازک اٹھے ہوئے ہونٹ— مجھے دیکھتا پا کر اس نے نظریں جھکا لیں۔ پھر ٹھہری نہیں۔ کمرے سے باہر نکل گئی۔

میرے اندر جیسے اتھل پتھل مچی تھی۔ ایک بھیانک کشمکش...... ہر لمحہ اپنے ہی اندر کی آگ سے لڑتا، الجھتا— کوئی دو گھنٹے گزر گئے— اُٹھ کر برامدے تک گیا تو پایا ساکشی اسی حالت میں سو گئی تھی— جیسے تھوڑی دیر قبل اُسے روتی حالت میں دیکھ کر آیا تھا...... اس کا سینہ روشن تھا— شلوار اور جمپر سے جیسے آگ کی جھانس اٹھ رہی تھی...... پاؤں بے حد خوبصورت۔ انگلیاں جیسے تراشی گئی ہوں— بارش تھوڑا سا رُکی تھی...... لیکن تھوڑی دیر بعد ہی بادلوں کی گڑگڑاہٹ شروع ہو گئی۔ اس بار اس گڑگڑاہٹ میں جوش بھی تھا— ایسا لگتا تھا جیسے اب بارش ہوئی تو رکے گی نہیں۔

سات بجے ساکشی دوبارہ اٹھ گئی— میرے لیے روٹی کے پھلکے لے کر آئی— مجھے احساس تھا مجھ سے کہیں زیادہ جدوجہد سے وہ دوچار ہو گی— لیکن وہ چپ کیوں ہے؟ آج ساری

رات اسے یہیں رہنا ہے— لیکن ساکشی کہاں سوئے گی— ساکشی چپ کیوں ہے۔ کیا نئی الجھنوں سے اُس نے سمجھوتہ کرلیا ہے؟

لیکن شاید نہیں۔ اب سوئے ہوئے آتش فشاں کے جاگنے کا وقت تھا— رات کے نو بج گئے تھے— ساکشی مجھے کھانا کھلا چکی تھی اور دوا بھی— باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ بارش کی بوندیں ایک عجیب سا سنگیت پیدا کر رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا دروازہ کھولا۔ باہر جنگل آباد تھا۔ گیلا جنگل...... تبھی بجلی چمکی تھی۔ اور جنگل اندھیرے میں چمک گیا تھا۔ ڈراونے پیڑ پودے...... تبھی آہٹ ہوئی— ہاتھوں میں تکیہ لیے ساکشی میرے بستر پر آئی تھی— تکیہ میرے تکیے کے پاس رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں تعجب سے دیکھتا۔ اس نے میری زبان بند کردی۔

'تمہارے ساتھ سوؤں گی...... میرے پاس صرف آج کا دن ہے۔'

بجلی تیزی سے چمکی تھی۔

باہر جنگل آباد تھا۔ رہ رہ کر بجلی چمک جاتی—

'ایک دن کے لیے تم مل گئے...... ایک دن کے لیے تمہارا گھر مل گیا...... جانتے ہو یہ سات گھنٹے کس طرح کاٹے ہیں میں نے؟ اکیلے رہ کر بھی تمہارے ساتھ۔ چوکے پر لیٹی لیٹی تمہارا احساس کرتی رہی— پور پور میں......'

اس نے چنری کنارے ڈال دی— شانتا کے وارڈ روب کی طرف اس طرح بڑھی جیسے اس کا وارڈ روب ہو— اور یہ گھر، یہ کمرہ اس کے لیے بالکل بھی اجنبی نہ ہو— وارڈ روب سے اپنے لیے بلیو رنگ کی نائٹی نکال لی— 'تھوڑا ڈھیلی ہوگی۔ ہے نا؟ ساکشی زور زور سے چیخی تھی— بولتے کیوں نہیں ہو تم...... زبان کیوں سل گئی ہے تمہاری۔'

نائٹی کو چہرے کے پاس لے جاکر وہ پھپھک کر رو پڑی—

'دو مہینے بعد میری شادی ہو جائے گی۔ مجھے برش اور کینوس کی دنیا میں نہیں جانا تھا— کیوں جانے دیا مجھے— ؟تم کیوں نہیں رکھ سکتے تھے مجھے؟'

باہر ایک بار پھر بجلی زور سے چمکی تھی۔

ساکشی سامنے آکر ٹھہر گئی— اس کا جسم جل رہا تھا...... آگے بڑھ کر اس نے میرے ہونٹوں پر اپنی آگ رکھ دی—

اس کے جسم سے 'جھاس' اٹھ رہی تھی— مجھے مکمل کردو۔ ادھورا نہیں رہنا مجھے۔ بھگوان

کے لیے اپنے اور میرے درمیان آج عمر کے چھلکے کو لے کر مت آنا...... زندگی دو مجھے...... مکمل کر دو مجھے......'

پیچھے پلٹ کر کھلی کھڑکی سے بارش میں بھیگتے جنگل کو دوبارہ نہیں دیکھ پایا— شاید بجلی چمکی تھی— یا زور سے ان جنگلوں پر گری تھی بجلی— سارا جنگل آگ کے شعلوں میں جل اٹھا تھا جیسے...... میں بے حد کمزور تھا اس لمحہ......

یا شاید میں اسی لمحہ کے لئے پیدا ہوا تھا......

●

آپ نے محبت کو دیکھا ہے کبھی— نہیں سچ بتائیے گا— دیکھا ہے محبت کو—؟ او ہینری کے بھوت کی طرح اچانک میں گم ہو گیا تھا— بھیگا جنگل آباد تھا۔ اور اس جنگل میں بارش رنگوں میں ساکشی نے میری جگہ لے لی تھی......

پھر کتنے ساون...... کتنی خزاں گذر گئی— مجھے کچھ یاد نہیں—

اور شاید یاد رکھنا ضروری بھی نہیں—

●❖●

بازار، طوائف اور کنڈوم

بازار

پہلے بازار اِس طرح نہیں پھیلا تھا۔

وہ بازار کے، اِس طرح پھیلنے پر اُداس تھا۔ پہلے بازار میں اتنی بھیڑ نہیں ہوا کرتی تھی۔ پہلے بازار میں اِتنی ڈھیر ساری دکانیں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ پہلے دکانوں میں اِتنے سارے کام کرنے والے مزدور یا 'چیزیں' نہیں ہوا کرتی تھیں۔ پہلے گلیاں اِتنی تنگ نہیں تھیں۔ سڑک پر آدمی آرام سے گزر سکتا تھا۔ آج کی طرح نہیں کہ پیچھے سے آنے والی بھیڑ آہستہ آہستہ آپ کو آگے کی جانب دھکا دے رہی ہے اور جسم پر پڑنے والا 'بوجھ'—— بازار کی بھیانک شکل کے سامنے ہر لمحہ آپ کو بے بس اور لاچار کرتا جا رہا ہو——!

پہلے بازار میں اچھے آدمی ہوا کرتے تھے۔ دیسی چیزیں ملا کرتی تھیں۔ اِس بار بازار میں غیر ملکی اشیاء کی باڑھ آئی ہوئی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ بازار کی شکل ہی بدل گئی تھی۔ وہ اِس شہر میں دو تین برس کے بعد آیا تھا۔ دو تین برس میں شہر کا چہرہ اتنا بدل جائے گا، اُسے یقین نہیں ہو رہا تھا۔ جو دکان والے اُسے دیکھتے ہی آواز دے کر بلاتے —— چائے پلاتے —— سامان خریدتے —— انہوں نے جیسے اُسے پہچاننے سے ہی انکار کر دیا تھا——

نہیں، اُسے پختہ یقین تھا۔ یہ وہ لوگ نہیں تھے۔

''پھر اُن کے بیٹے ہوں گے؟''

نہیں بیٹے بھی نہیں۔ بازار کے ساتھ، اخلاق، زبان اور لوگ بھی بدل گئے تھے۔ شاید اِسی لئے اُس کے دیسی برانڈ کو دیکھ کر کچھ لوگ ہنسے تھے۔

'یہ کیا ہے......؟'

'وہی جو ہمیشہ سے ہم سپلائی کیا کرتے ہیں۔'

ہنسنے کی آواز—— ''معنی، دیسی ہے—— '' پھر ہنسنے کی آواز۔ ''نہیں—— نہیں چلے گا۔''

''نہیں چلے گا——؟''

''لیکن دور دراز، گاؤں، قصبوں کے لوگوں کو تو......''

''جواب میں کہا گیا—— ''اب دور دراز کچھ بھی نہیں ہے۔ گاؤں، قصبے—— سب لوگوں کو غیر ملکی چیزیں پسند ہیں—— اور ہاں—— بازار میں ہم وہی کچھ فروخت کرتے ہیں، جس کے آرڈر آتے ہیں—— جو سکہ چلتا ہے، ہم وہی لیتے ہیں——

اِس بار ہنس کر کہا گیا تھا—— ''بازار بدل گیا ہے۔ تم بھی اپنے کو بدل ڈالو۔''

●

وہ جیسے سناٹے میں تھا—— حوصلہ پست ہو چکا تھا۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ وہ آتا تھا۔ سامان فروخت کرتا تھا۔ رات گئے ہوٹل میں آرام کرتا تھا—— بازار کے درمیان دو ایک 'دھندے' کی دکانیں تھیں۔ اُن میں سے کسی ایک طوائف کو پٹا کر لے آتا۔ ساری رات عیش کرتا۔ پھر دوسرے دن بڑا مال آرڈر لے کر اپنے گھر روانہ ہو جاتا۔

مگر اِس بار بازار نے جیسے اپنا مکمل چہرہ ہی تبدیل کر لیا تھا—— اُس نے سوچ لیا تھا—— یہ بازار اب تمہارا نہیں رہا۔ تمہیں اپنے لئے چھوٹے بازار تلاش کرنے ہوں گے۔ جہاں تمہارے سکے، تمہارے 'ٹکسال' چلتے ہوں۔ جہاں سستی دیسی سامانوں کی خرید و فروخت اب بھی ہوتی ہو—— اُس نے گھبرا کر واپس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن لوٹنے سے قبل آج کی رات ہوٹل میں وہ آرام سے اور کچھ کچھ 'عیش' سے گزارنا چاہتا تھا—— ایک عدد طوائف کے ساتھ—— اُس نے واپسی کا پروگرام انتہائی خوبصورتی سے ترتیب دیا تھا۔ 'دھندے' کی جگہ تلاش کرنے میں اُسے دشواری نہیں ہوئی اور ایک بار پھر وہ چونک گیا تھا۔

●

پہلے یہاں دو تین چھوٹی چھوٹی دھندے کی دکانیں ہوا کرتی تھی۔ اب اِنہیں توڑ کر

ایک بڑے بازار میں تبدیل کیا جا چکا تھا —— رنگین بورڈ۔ خوبصورت غالیچہ۔ گھماؤ دار سیڑھیاں۔ ریموٹ سے کھلنے والا دروازہ۔ دروازے کے اندر کھلنے والی جنت کی کنجی —— اوپر نیچے خوبصورت، حسین وجمیل، جنت کی اپسراؤں کو لے کر آتی جاتی نرم ونازک کانچ کی تعمیر شدہ ایک ایسی لفٹ —— جس کے آر پار کا تمام 'جغرافیہ' آسانی سے دیکھا اور پڑھا جا سکتا تھا —— ہر طرف پاگل اور مدہوش کرنے والی عطر کی مہک —— شاندار صوفے —— وہ اِس نئے بازار کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا تھا —— اچانک 'وہ' نظر آ گیا —— وہ —— وہ بالکل نہیں بدلا تھا۔ پہلے وہ اِس دھندے میں 'دلاّ' کہلاتا تھا۔ سر پر ترچھی ٹوپی —— پاؤں میں لنگی —— منہ میں پان، گلے میں لال رومال اور ایک گندہ سا کُرتا —— پچھلے دو تین برسوں میں وہ جانے کتنی کتنی بار اِسی 'دلّے' سے اپنے لئے طوائف کا انتخاب کر کے، اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اُسے تعجب اِسی بات پر تھا —— بازار کے ساتھ 'دلاّ' بھی بدل گیا تھا اور اس کے طور طریقے بھی —— 'دلاّ' سفاری سوٹ میں تھا۔ بال 'ہیئر بیونگ' سے، قائدے سے سیٹ کرائے ہوئے —— دلّے کے ساتھ کچھ بے حد خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ ایک لڑکی پر جیسے اُس کی نظر ایسے چپک کر رہ گئی کہ ہٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی —— وہ کسی فلمی ایکٹریس سے زیادہ خوبصورت تھی —— لیکن اِس وقت وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی —— دلّے کا چہرہ بھی دوسری طرف تھا —— ایک لمحے کو اس نے سوچا —— بازار بدل گیا ہے۔ اور یہ طوائف بازار بھی —— دلاّ بھی بدل گیا ہے۔ بہتر ہوگا، وہ چپ چاپ یہاں سے کھسک لے۔ دلاّ بھی اُسے کہاں پہچانے گا۔

مگر دوسرے ہی لمحے دلّے کی نگاہیں اُس کی جانب گھوم گئی تھیں —— اُس کی آنکھوں میں پہچان سے زیادہ ایک شکاری کی چمک آ گئی تھی ——

'آیئے صاحب......'

'جی......' وہ ہکلا رہا تھا۔

''اب غریب خانے میں آ ہی گئے ہیں تو، شوق فرما کر ہی جانے دیں گے ہم......''

دلّے نے انتہائی مہذب انداز میں اُسے سیلوٹ مارا —— آیئے۔ یہاں...... یہاں تشریف رکھئے۔ اُس نے لڑکیوں کو وہیں رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر اُس کی طرف گھوما۔

'سب کچھ بدل گیا...... کیوں......؟'

'ہاں۔'

'لیکن آپ نہیں بدلے صاحب ـــــ یہ جگہ نہیں بدلی ـــــ وہ کسی فلاسفر جیسے انداز میں، گہری سوچ میں ڈوبا ہوا کہہ رہا تھا ـــــ ' جگہ نہیں بدلتی صاحب، بس رنگ بدل جاتے ہیں۔ روپ بدل جاتا ہے ـــــ اور بازار تو بدلنے کے لئے ہی ہوتا ہے صاحب......'

'تم بھی تو بدل گئے......؟'

'نہیں...... میں...... وہی دلاّ......' وہ قہقہہ مار کر ہنسا ـــــ صرف کپڑے بدلے ـــــ کپڑے بدلے۔ اِس لئے زبان بھی بدلنی پڑی۔'

اِس درمیان وہ اپسرا جیسی خوبصورت لڑکی دلے کی طرف گھومی تھی ـــــ

'میرے لئے کیا حکم ہے۔ یا سونے جاؤں؟'

'نہیں...... ابھی ٹھہرو...... وسندھرا......'

'و......سُن......' وہ جیسے اِس نام کے نشے میں ڈوب گیا۔ ایک بے حد پیارا سا خوبصورت چہرہ ـــــ ایسے خوبصورت چہرے بھی دلے کی جنت میں مل سکتے ہیں، اُس کے لئے سوچنا بھی مشکل تھا۔ ایک بڑے بازار کی اپسرا کا مطلب تھا ـــــ 'مہنگی ہوگی۔' اُس کی جیب سے کہیں زیادہ مہنگی ـــــ انگور کھٹے ہیں ـــــ کھٹے انگور اُس جیسے تاجروں کے لئے نہیں ہیں، جسے بازار میں یہ کہہ کر ننگا کر دیا گیا ہے کہ اُس کے 'مال' بازار کے قابل نہیں ہیں ـــــ اُس کے لئے تو کوئی دیسی، 'قصبی' ہی چلے گی۔ مگر اِس بڑے بازار میں کیا ایسی قصبی ملے گی ـــــ؟ اُس کے سوچنے کا سلسلہ ٹوٹ گیا ـــــ دلاّ اُسی اپسرا کے بارے میں اُس سے پوچھ رہا تھا۔

'صاحب۔ یہ چلے گی......؟'

'یہ......'

'ہاں، اِسی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'

'مگر یہ تو......'

'میں نے کہا تھا نا۔ گھبرایئے مت صاحب۔ بس آپ کے پسند کرنے کی دیر ہے۔'

اپسرا جیسی لڑکی ابھی بھی دوسری طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اُسے فکر ہی نہیں ہو کہ ایک بڑے بازار کے ایک چھوٹے سے حصے میں اُس کی بولی لگنی شروع ہوگئی ہو ـــــ دوسری لڑکیاں اپنے اپنے کمروں میں لوٹ گئی تھیں۔ لفٹ کے اوپر نیچے جانے کا سلسلہ جاری تھا ـــــ کولڈ ڈرنکس کی بوتل کے درمیان ـــــ اِس جنت نما کمرے میں ـــــ جنت جیسی 'حور' کے

لئے —— لڑکھڑاتے ٹوٹتے الفاظ میں اُس نے اپنی بولی بڑھائی —— اور ایکدم سے چونک گیا۔ 'بولی' ایک مقام تک آکر سمجھوتے میں بدل گئی تھی۔

''بازار میں ہم اپنے ہر طرح کے گاہک کا خیال رکھتے ہیں صاحب۔ لڑکی اب آپ کی ہے۔ آپ چاہیں تو یہاں بھی کمرہ ہے۔ ہوٹل جانے کی فیس الگ سے...... قبول......؟''

'قبول!'

معاملہ طے ہو چکا تھا۔ کسی روبوٹ کی طرح 'وہ' اُٹھ کر اُس کے سامنے کھڑی تھی۔ بالکل علاء الدین کے جن کی طرح —— اُس کے قدموں میں بچھ بچھ جانے کے لئے تیار۔

'میرے آقا! کیا حکم ہے۔'

پھر اُس نے دیر نہیں کی۔ ٹیکسی پکڑی اور ٹیکسی اُس کے ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئی۔

طوائف

ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے میں نور ہی نور پھیلا تھا۔ وہ آج کی رات کو کچھ کچھ 'تاریخی' یا یادگار بنانا چاہتا تھا۔ پتہ نہیں کہاں سے اُس کے اندر ایک شاعر آ گیا تھا۔ شاعر —— وہ اِس شاعر کو، جنت سے اُتری ہوئی اپسرا کے سامنے کچھ زیادہ ہی 'قرینے' سے پیش کرنا چاہتا تھا۔ حقیقت میں اِس طرح سے رومانی وہ کبھی نہیں ہوا —— 'مال' کی سپلائی۔ آرڈر۔ گاڑی اور بسوں کی تھکان —— پھر ایک عدد ویشیا کا ساتھ —— جنگلی پن کا مظاہرہ اور ایک ٹھنڈی ندی کا بہاؤ۔ لیکن —— یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔

لڑکی، شہزادیوں کی طرح بستر پر لیٹ گئی تھی —— مخمور آنکھیں —— گہری جھیل کی طرح لگ رہی تھیں۔ سنگ مرمر کی طرح شفاف، چمکتا ہوا بدن۔ ایک لمحے کو اُس نے کہا بھی۔

'کپڑے اُتاروں؟'

'نہیں۔ ابھی نہیں...... ابھی تو رات پڑی ہے......'

لڑکی نے کندھے اُچکائے۔ اُس کی باہیں ننگی تھیں —— گوشت کا ایک بے حد حسین ٹکڑا۔ جینس کے پینٹ اور سلیولیس ٹی شرٹ میں اُس کا 'مغرور بدن' انگاروں کی بارش کر رہا تھا۔

ایک لمحے کو وہ ٹھہر گیا۔ لڑکی اُسی کی طرف دیکھ رہی تھی —— اُس کی پریشانی یہ تھی کہ

بات کہاں سے شروع کروں۔ مطلب کہاں سے رومانی ہوا جائے۔ وہ سوچ میں گرفتار تھا۔ اتنا بڑا شہر—— پھیلتا ہوا—— تیزی سے بڑھتا بازار—— آلودگی—— شور—— شروعات شہر سے ہی کرنی چاہیے۔

اب وہ مطمئن تھا۔ ہونٹ گول ہو گئے۔ آنکھوں میں نشہ پیدا کیا۔ اپسرا کے چہرے کی طرف دیکھا اور لگا—— الفاظ کے 'فوارے' چلنے خود بخود شروع ہو گئے ہوں......

''تمہارا شہر...... تمہیں یاد ہے—— پیڑ پودے...... کھلکھلاتا ہوا گلشن...... گیت گاتی ہوئی ٹھنڈی ہوا...... یہ سب مجھے میرے اپنے لگتے تھے۔ جیسے ہوا صرف میرے لئے جھوم رہی ہو...... درخت صرف میرے لئے گا رہے ہوں...... اور شہر—— میں یہیں پیدا ہوا ہوں...... اسی مٹی سے—— یا پھر 'پنر جنم' کا کوئی گہرا لگاؤ ہوگا۔ میں کبھی یہاں بزنس کے خیال سے نہیں آیا—— بس۔ یہاں کا—— یہاں کی آب و ہوا بار بار مجھے اپنی طرف کھینچ لاتی تھی۔ جیسے شہر بین بجا رہا ہو...... میرے لئے...... بلا رہا ہو مجھے...... تمہیں آنا ہی ہوگا اور دیکھو——''

'یہ شہر میرا نہیں ہے——'

لڑکی نے درمیان میں ہی بات کاٹ دی۔ جیسے ہوا رُک گئی۔ 'بین' کا بجنا بند ہو گیا۔ سرسراتے پیڑ خاموشی میں بدل گئے—— گیت رُک گیا......

وہ ایکدم سے چونکا—— 'تمہارا نہیں، مطلب......؟'

'مطلب میرا نہیں ہے......'

'پھر——؟'

'میں ابھی حال میں آئی ہوں۔ پھر کہاں جاؤں گی۔ کہہ نہیں سکتی......'

'چلو...... کوئی بات نہیں......'

آگے بڑھ کر اُس نے کھڑکی کھول دی—— کھڑکی سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آ گئے تھے۔

'ٹی وی چلا دوں......؟'

'نہیں—— اُس کی آواز خاموش لہروں کی طرح 'ساکت' تھی۔

وہ بھی کچھ دیر تک کھڑکی سے باہر بے مطلب دیکھتا رہا۔ جیسے اپسرا سے دوبارہ گفتگو کے لئے نئے لفظ تلاش کر رہا ہو—— اُس نے آئینہ میں اپنا جائزہ لیا۔ سفید کرتا، پائجامہ۔ آنکھوں کا

نشہ ابھی اُترا نہیں تھا۔ ہونٹ ابھی بھی گول تھے۔ اندر رومانی انسان موجود تھا۔ 'شہر' والا کارتوس تو فیل کر گیا۔ جانے دو۔ کیا ہوا۔ لڑکی اب کھڑکی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو وہ اُٹھی۔ لہرا کر کھڑکی کے پاس کھڑی ہوگئی___ جیسے کشتی کے 'بادبان' کھل گئے___ ہوا کے رتھ پر ایک خوبصورت سا چہرہ، 'جھولے' جیسا جھول رہا تھا۔

'وسو......' اُس کی آواز میں نشہ تھا...... وسندھرا...... کتنا پیارا نام ہے...... تمہیں پتہ ہے وسو...... دلّے نے___ نہیں معاف کرنا مجھے___ پہلے ہم اُسے اِسی نام سے پکارتے تھے...... چلو، چھوڑو اِس بات کو۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔ دلّے نے جیسے ہی تمہارا نام لیا...... و...... سن...... دھرا...... پتہ ہے...... مجھے کیا لگا...... کبھی تم نے ریگستان میں، خاموشی کی ریت پر چلنے والے اونٹوں کی گھنٹیاں سنی ہیں___ نہیں۔ میں مندر یا گرجا گھر کی گھنٹیوں کی بات نہیں کر رہا...... ریت کی اُڑتی آندھی میں، ایک قطار سے چلے آرہے، اونٹوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں...... جیسے 'جلترنگ' بجتا ہے...... جیسے دنیا کے سب سے میٹھے ساز نے تمہارا نام پکارا ہو۔ و...... سن...... دھ...... را...... جیسے___'

'وسندھرا میرا نام نہیں ہے___'

وہ کھڑکی سے ہٹ گئی تھی۔ میں نے جائزہ لیا۔ وہ خاصی لمبی تھی۔ ایک خوبصورت اور پُرکشش جسم___ لیکن جیسے، دھیمی دھیمی آنچ پر جلتے پگھلتے جسم کی اُسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔ وہ اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی___

'تمہارا نام نہیں......' میں اٹک رہا تھا۔ لفظ ٹوٹ رہے تھے___

'ہاں......'

'مگر دلّے نے تو......'

'ہاں' وہ ہر روز نام بدل دیتا ہے......'

ہر روز...... مطلب تمہارا اپنا کوئی نام نہیں'۔

وہ گہری سوچ میں گم تھی اور ایک ٹک میرے چہرے کو تکنے لگی تھی___

'تم سونا چاہتی ہو تو......'

'نہیں'___ اس کے الفاظ میں سختی نہیں تھی___ وہ سب کچھ ایک روبوٹ کی طرح

کررہی تھی...... 'تم نے خریدا ہے مجھے۔آج کی رات کے لئے۔ مجھے حکم ہے، میں وہی کروں جو تم چاہو گے......'

کہنے کے لئے تو اس کے پاس متعدد سوالات تھے— زندگی اور مجبوری سے جڑے سوالات— یہاں، اِس منزل تک کی تکلیفوں سے الجھے ہوئے سوالات— مگر ایسے 'بے رحم' سوالوں کی شروعات سے ایک اچھی، خوبصورت اور رومانی رات کا ستیاناس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر بڑی ادا سے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ 'قلوپطرہ، مونالیزا سے لے کر جنیفر لوپیز تک کتنے ہی نام ہونٹوں تک آکر ٹھہر گئے— یہ جسم، یہ لباس...... وہ اُس کے لباس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آج جینس تو ہر دوسری تیسری لڑکی پہنتی ہے۔ سلیولیس فینسی شرٹ تو سبھی پہنتے ہیں...... مگر اتنا بولتا ہوا لباس...... چوائس کتنی اچھی ہے— ہیرا اپنی قیمت پہچانتا ہے۔

ہوا تیز ہوگئی تھی۔ کھڑکی کے پٹ ڈول رہے تھے— وہ آہستہ سے بولی۔

'کھڑکی بند کردو......'

'اچھا۔'

وہ اپنی جگہ سے اُٹھا۔ کھڑکی سے، بادلوں کے کچھ ٹکڑوں کے درمیان، آنکھ مچولی کھیلتا ننھا سفید چاند آگیا تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی وہ تیزی سے مڑا۔ چاند اپسرا کے لباس میں گُم تھا...... سفید ٹی شرٹ، بادل کے ٹکڑوں میں تبدیل ہوگئے تھے۔ چاند اِن ٹکڑوں میں سمٹ آیا تھا......

اپسرا دھیرے سے ہنسی—

'کیا دیکھ رہے ہو......'

'تمہارا لباس......'

'لِ...... باس— ' اپسرا کہتے کہتے رُک گئی۔

'کتنا خوبصورت۔ کتنا پُرکشش ہے۔ جیسے......'

اُس کی کھنک دار ہنسی نے ایک بار پھر کمرے کا سکوت توڑ دیا تھا— 'یہ لباس بھی میرا نہیں ہے۔'

'مط...... لب۔'

اپسرا چپ تھی— ''مطلب میرا نہیں ہے۔ کل والی پارٹی نے دیا تھا۔ گفٹ۔ ایک

رات کا تحفہ...... کچھ سر پھرے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ قیمت کے ساتھ ساتھ گفٹ بھی دے جاتے ہیں...... پاگل۔''

•

باہر جیسے ہوا کا شور رُک گیا۔ بند کھڑکی سے بادلوں کے ٹکڑے، جیسے دُھواں بن کر کمرے میں سمٹ آئے۔ گھپ اندھیرا۔ نمی کی پتلی سی چادر۔ پھر جیسے دھیرے سے چادر ہٹی۔ اندھیرا ختم ہوا۔ بادل کھڑکی سے باہر لوٹ گئے۔ وہ فکر مند تھا —— کیسی لڑکی ہے۔ نام بھی اپنا نہیں —— لباس بھی نہیں —— شہر بھی نہیں......

باہر جیسے ڈرم پیٹے جارہے ہوں۔

وہ یکایک چونک پڑا تھا۔ لڑکی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر یکایک اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب وہ اس کی آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہوا پھر سے تیز ہوگئی تھی...... وہ.. بستر پر دوبارہ لیٹ گئی تھی...... اُس کے ہاتھ بارش بن گئے تھے...... اپنے ہی جسم پر مچلتے ہوئے ——

'ہوا تیز ہے...... ہے...... نا......'

'ہاں......'

اُس نے ایک جھٹکے سے جینس ہوا میں اُڑا دی......

'کھڑکی کے پٹ ڈول رہے ہیں......'

'ہاں......'

سفید ٹی شرٹ، اس کے مخملی بدن سے الگ ہو چکی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک آگ تھی۔ نہیں جل مچھلی...... نہیں جل مچھلی نہیں...... فرانس کی شِنگو رافش کے بارے میں اُس نے سنا تھا —— ایک پانی میں تیرنے والی عورت —— بستر جیسے ہوا میں اُڑ رہا تھا...... ایک بے حد حسین چہرہ۔ لمبی گردن۔ قلوپطرہ کی طرح، تنا ہوا حسین، گٹھا ہوا جسم —— جیسے کمان سے تیر چھوٹنے بھر کی دیر ہو۔ دو ننگے پاؤں —— جیسے پانی میں لہراتی دو ننگی حسین ڈالیاں......

گفتگو کا سناٹا، اُس کے حسین مچلتے جسم نے توڑ دیا تھا...... وہ کانپ رہا تھا۔ جذبات کی تپش میں —— بہتے سیلاب میں —— ٹھنڈے پانی اور گرم آگ میں...... وہ اُڑ رہا تھا...... نہیں بہہ

رہا تھا—— یہ لڑکی۔ نہیں ویشیا۔ نام بھی نہیں۔ شہر بھی نہیں۔ لباس بھی نہیں...... مگر یہ حسین جسم...... یہ حسین چہرہ......

سمندر میں چھلانگ لگانے سے پہلے وہ اُسے خوش کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ لڑکی اُس کے سوالوں سے بوجھل ہوگئی ہے۔ مگر اب آخری سوال—— آخری ہتھیار...... بستر پر آگ کا دریا بہہ رہا تھا...... اُس نے آگ کے دریا کو مدہوش ہو رہی آنکھوں سے دیکھا۔ آنکھوں میں خمار چھا گیا۔ ہونٹ گول ہوگئے۔ وہ ایک بار پھر رومانی تھا۔

''یہ...... تمہارا چہرہ...... تمہارا جسم...... تم یقین کروگی۔ وسو...... یا جو بھی تمہارا نام ہو...... تم یقین......'

''یہ جسم میرا نہیں ہے، یہ چہرہ میرا نہیں ہے......' وہ کسی روبوٹ کی طرح اپنا پرس کھول رہی تھی—— 'ہاں۔ چونکومت۔ اِس میں کچھ بھی چونکنے جیسا نہیں ہے......''

وہ ایک لمحہ کو رُکی——

باہر طوفان یکا یک تیز ہوگیا تھا۔ کھڑکی کے پٹ تیز تیز بجنے لگے تھے—— جیسے ابھی ہوا کا زور، پوری طاقت سے کھڑکی کے پٹ توڑ ڈالے گا۔ وہ کہہ رہی تھی......

'سنو...... اِس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے۔ یہ چہرہ، یہاں تک—— ماں بتاتی تھی—— اُس کا ہے—— یہاں...... یہاں سے یہاں تک یہ والا حصہ میرے باپ کا...... ماں میری ہاتھ کی انگلیوں کے بارے میں بتاتی تھی کہ...... ماں کہتی تھی پیر تو بالکل اُس کے جیسے...... اور یہ حصہ...... ماں کہتی تھی...... ماں کا ایک بوائے فرینڈ تھا......''

تیز ہوا سے کھڑکی کی سٹکنی ٹوٹ کر گر گئی تھی۔ وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا رہی تھی—— ہا...... ہا...... یہاں بھی تم ہار گئے......'

بچوں کی طرح پرس میں ہاتھ ڈال کر اُس نے کنڈوم نکال لیا تھا——

''یہ میرا ہے۔ اِسے میں ساتھ لے کر چلتی ہوں......''

وہ بچوں کی طرح 'کنڈوم' کو پھونکنے، پھلانے کی کوشش کر رہی تھی—— کمرے میں یکا یک طوفان بڑھ گیا تھا۔

●❖●

ٹیشو پیپر

آپ کو کیا لگتا ہے، سیکس...... ! نہیں۔ میں سیکس کے بارے میں ہی پوچھ رہا ہوں— اور بالکل بھی سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ بھلا سیکس کے نام پر اس طرح چونکنے یا بھنویں سکوڑنے کی کیا ضرورت ہے— ؟ آپ گھبرائے ہوئے بھی لگتے ہیں— اور بے حد الجھن بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں جیسے میں نے کوڑھ یا ایڈس جیسی بھیانک بیماری کے بارے میں پوچھ لیا ہے۔ نہیں— اتنا سخت بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے صرف میرے اس سوال کا جواب دیجئے...... کہ کیا سیکس کے بغیر آپ رہ سکتے ہیں؟ کیا سیکس کو زندگی کا حصہ بنائے بغیر آپ ساری عمر گذار سکتے ہیں؟ سیکس کتنا بستا ہے آپ میں؟ نہیں اتنا غصہ مت کیجئے۔ اس چینی فلسفی وانچو کی طرح— جو کہا کرتا تھا، آنکھ کھلنے کی کہانی بس ناف کے نیچے ذرا سا پائجامہ سرکنے کی کہانی ہے— اور اس کہانی سے ہی ہم سماج، مذہب، معاشیات اور اخلاقیات تک کے اصول اور قانون بُنتے رہتے ہیں— سب ایک مقدس پانی کے قطرے کی کرامت...... اور آپ پائجامہ اتارنا نہیں چاہتے تو آپ کے آدمی ہونے پر شک کیا جا سکتا ہے— نہیں، ہنسئے مت۔ وانچو کو اس وقت بھی اچھی نظر سے دیکھا نہیں گیا۔ اور شکر تھا کہ وہ یونان کی جگہ چین میں پیدا ہوا ورنہ سقراط کے چاہنے والوں کی طرح اسے بھی زہر کا پیالہ پینا پڑتا جاتا......

اب آپ غصے سے دیکھ رہے ہیں۔ اور جناب، یہ کوئی مناسب بات نہیں ہے— ناف کے نیچے پائجامہ سرکنے کی بات پر اتنا برا منہ بنانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے— مذہبی، مقدس کتابوں سے مندروں تک— ایک دوسرے میں گم، عورت اور مرد کی ہزار تصویریں جو اشتعال پیدا کرتی ہیں...... اور ایک انجانی سی بھوک بھی— جو قدم قدم پر آپ کو بے چین کیے رہتی ہے—

نہیں، غصہ مت ہوئیے...... ایک بار میرے کہنے سے مقدس عمارتوں کو ہی دیکھ لیجیے — مسجد کے گنبد، کراس کے نشان یا شیولنگ — ایک ساتھ محبت، عقیدت اور انسانی جسم سے وابستہ بھوک کی نشاندہی کرتے ہوئے — آپ کی مذہبی کتابیں بھی ان کے ذکر سے خالی نہیں ہیں — ایک دن اچانک ناستر ودوموس کی طرح سیکس کی تیسری آنکھ کھل گئی اور اس کہانی نے جنم لے لیا —

مقام دہلی مہانگر، جمنا پار کا پریت وہار انکلیو —

کردار: پچاس کی عمر میں پہنچے کامتا بابو اور ان سے دس سال چھوٹی ان کی بیوی...... سلیکھا۔ اور سلیکھا کا ایک قریبی رشتے دار — وجیندر۔ جسے وہ چھوٹا بھائی کہتی ہے۔ عمر یہی کوئی 28-30 کے آس پاس۔ تین کمروں والے اس فلیٹ میں ایک کمرہ اس کا بھی ہے۔ نوکری کی کوشش میں لگا ہے۔ تھوڑی سی دوڑ بھاگ — اور باقی بچا وقت کمپیوٹر — دماغ پریشان ہو تو چیٹنگ سے بہتر کوئی چیز نہیں — اور دیکھیے، اس وقت بھی وہ یہی کر رہا ہے —

اس کی آنکھیں نشے میں ہیں — اپسراؤں کا رقص جاری ہے۔

وجیندر

وجیندر کی آنکھیں نیٹ پر جم کر رہ گئی تھیں۔ رنگ برنگی پریوں کی قطار جیسے نیٹ سے نکل کر کمرے میں آگئی ہو۔ دعوت نظارہ دینے کے لیے...... یاہو چیٹنگ باکس پر وہ شاید اب تک دنیا کے تمام ممالک کی اپسراؤں سے مل چکا تھا — اور ان اپسراؤں کے بارے میں اس کا علم حیران کرنے والا تھا۔ ایران کی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں...... فلپائن کی...... بیچارا غریب ملک...... جلد ہی 'کیم' پر آکر کپڑے اتارنے لگیں گی۔ دوست بنانے میں جلد باز۔ پھر آپ سے پیسے مانگے گی۔ کالج میں پڑھتی ہے۔ فیس دینے کے پیسے نہیں۔ اور پاکستان...... کچھ تو شرافت کی پتلیاں اور کچھ آپ کے پوچھنے سے پہلے ہی پوچھیں گی۔ ?Do you have cam اور دوسرا سوال ہوگا۔ ڈویو لائک سیکس چیٹ — کیم روشن...... دنیا گلوبل ہو کر ایک چھوٹے سے کمرے میں اپنی رنگینیاں بکھیرنے لگتا...... کپڑے اترنے لگتے اور — آسٹریلیا، سنگاپور، چین، جاپان، اور اپنا پڑوسی ملک نیپال...... جب تک نوکری نہیں ہے...... وجیندر کے پاس ذہنی اور جسمانی بھوک کی تکمیل کا بس یہی ایک ذریعہ تھا — اور اس کے باہر —

لیکن وجیندر جانتا ہے۔ حقیقت کی زمین ہر بار دوسری ہوتی ہے۔ سخت، تکلیف دہ۔

اس گھر میں جیسے وہ اچانک ہی اجنبی ہو گیا ہے۔ بہت کچھ بدل رہا ہے۔ بڑے شہروں میں یوں تو زندگی بسر کرنے کے طریقے آہستہ آہستہ بدلنے لگتے ہیں۔ پھر اچانک ایک دن مہانگر تہذیب کا راکشش آپ کو نگلنے چلا آتا ہے۔ وجیند رسب کچھ دیکھ رہا ہے۔ یا اسے یوں کہیں کہ اپنی حدود میں رہ کر وہ سب کچھ دیکھنے پر مجبور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ کچھ بول نہیں سکتا۔ منہ نہیں کھول سکتا۔ اسے لگتا ہے نیٹ کی یہ پریاں نہ ہوتیں تو شاید اس گھر میں اس کا دم گھٹ گیا ہوتا...... سلیکھا کو وہ دیدی کہتا ہے۔ بچپن سے کہتا آیا ہے مگر اسے لگتا ہے، اچانک دیدی، گھر میں آئی تبدیلی کا شکار ہو کر شاید نئی تہذیب کے پل یا کسی نئے راستے پر نکلنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ مگر کیوں؟

سلیکھا

عام بیویوں جیسی ہی ایک بیوی— مگر جب خواہشات اندر سے سر نکالتی ہیں تو شاید آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھتیں۔ ایسی ہی کسی دبی خواہش نے جب پہلی بار سر نکالا تو ایک انجانی محبت کو جنم دیا۔ پھر شادی بیاہ کے بعد نوکری— فلیٹ اور بڑھتی خواہشات بھیانک شکل اختیار کرتی گئی— تھوڑا صبر کریں۔ کیونکہ خواہشات کے اسی بھیانک جنگل سے اس کہانی کی شروعات ہوئی—

کامتاناتھ یعنی میں

سچی بات یہ ہے کہ یہ کہانی میری ہے۔ میں یعنی کامتاناتھ — مجھے لگتا تھا، شاید سب کچھ بدل رہا ہے لیکن بدلنا تو ایک فطری عمل ہے۔ پھر بدلنے میں ڈر کیسا؟ لیکن آپ رشتوں کے بدلنے کا درد نہیں جانتے— یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ شاید میں اس طرح تفصیل سے نہیں بتا پاؤں، جیسے مصنف یا جذباتی قسم کے لوگ مرچ مصالحہ لگا کر آپ کو بتا سکتے ہوں— یہ ہنر میرے پاس نہیں ہے۔ پھر بھی پچاس سالہ زندگی کی ایک ایک تفصیل میرے پاس ہے۔ ٹھیک ویسے ہی، جیسے کوئی دکاندار اپنے آٹے چاول کی قیمتیں یاد رکھتا ہے۔

شاید میں اس بھیانک ڈراؤنے خواب سے باہر نکل آیا، جیسا ابھی کچھ دن پہلے میرے ساتھ ہوا— ایک عجیب سا ڈراؤنا خواب— یقین کرنے کی ہمت نہیں ہوتی کہ کیا سچ ایسا میرے ساتھ ہو سکتا ہے—؟ میں پریکٹیکل نہیں ہوں— اصول پرست یا آدرش وادی بھی

نہیں — لہٰذا اس تفصیل میں، جواب میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں، ممکن ہے کچھ آگے پیچھے یا اونچ نیچ ہو جائے تو اس کے لیے میں ابھی سے آپ سے معافی چاہوں گا — چلیے زیادہ وقت نہ لیتے ہوئے میں تھوڑی سی تفصیل ڈائری کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

4 / اگست 2007

مجھے لگ رہا ہے...... میرے اندر کچھ ہو رہا ہے — دفتر سے گھر آنا صرف ایک مجبوری ہے۔ کیونکہ اب یہاں سلیکھا نہیں ملتی۔ سلیکھا کی خوشبو بھی نہیں۔ سلیکھا کے آجانے کے بعد بھی اس کا احساس نہیں ہوتا۔

7 / اگست

سوچتا ہوں، کیا محبت کبھی اُداس یا تھکن کا شکار ہو سکتی ہے —؟ سلیکھا کئی دنوں سے کافی لیٹ آ رہی تھی۔ رات کے بارہ ایک بج جاتے۔ آنے کے بعد بھی ہم میں بات نہیں کے برابر ہوتی۔ شاید زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب ازدواجی زندگی صرف نبھائے جانے کی چیز بن جاتی ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میں رومانی آدمی کبھی نہیں رہا۔ اس لیے سلیکھا کی جسمانی خوبصورتی بیان کرنے کے لیے بھی میرے پاس لفظ نہیں ہیں — نہیں جانتا۔ ایک وقت ہم نے لو میرج کیسے کی۔ (اس کی تفصیل آگے آئے گی) مگر اب زندگی کے اس پت جھڑ میں کوئی بھی رومانی مکالمہ مجھے چھو بھی سکتا — کبھی سوچتا ہوں، شاید سلیکھا کے ذہنی طور پر تقسیم ہونے کا یہی راز رہا ہو......

1 / ستمبر

رات کے دو بج گئے تھے۔ سلیکھا کے انتظار میں آنکھیں پریشان ہو رہی تھیں — لیکن میں مطمئن تھا۔ اس کی تاخیر کی کوئی وجہ حادثے سے نہیں جڑ سکتی — میں کھڑکی پر کھڑا تھا۔ باہر رات سو گئی تھی۔ گاڑی رکی تھی۔ سلیکھا کے ساتھ ایک اسمارٹ سا شخص اترا تھا — اس نے سلیکھا کو اپنی بانہوں میں لیا اور ایک گرم بوسہ دیا...... میں کھڑکی سے ہٹ گیا۔ شاید اس منظر کا تانا بانا تو میرے اندر پچھلے کئی مہینے سے بُنا جا چکا تھا — اگر آپ خاموش ہوتے ہیں اور اندر تک صرف لہولہان ہونا جانتے ہیں تو سمجھ لیجیے — آپ اپنی تمام ذہنی اور جسمانی سطح پر نامرد ہو چکے ہیں۔

شاید میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔

سنہرے رنگ کا خوبصورت سا بیگ لہراتی وہ کمرے میں آئی تو سارا کمرہ خوشبو سے معطر ہوا تھا۔اس کے وجود میں ایک تھرکن سی تھی وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔اور یہ بیگ بھی اس سے پہلے میں نے اس کے ہاتھ میں نہیں دیکھا تھا۔اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔

'آج نہیں پوچھو گے، کہ میں کہاں تھی اتنی دیر—'

میں نے نظر نہیں اٹھائی......سناٹے میں اس کے اس جواب کو محسوس کرتا رہا۔اچانک وہ ہنسی— 'دہلی والے ہونے لگے ہو— تھوڑا تھوڑا بدلنا بھی سیکھ رہے ہو۔چلو اچھا ہے۔یہ ایٹی کیٹ تمہارے اندر آجائے گا تو پھر جینا آسان ہو جائے گا۔'

وہ پھر خاموش رہا۔شاید یہی اس کی غلطی تھی۔سلیکھا چیخی تھی۔

'مجھے ہرٹ کر رہے ہو تم۔بولتے کیوں نہیں۔دیر رات آکر کوئی گناہ نہیں کیا میں نے......'

شاید وہ پہلی رات تھی میرے لیے— جب ایک گہری خاموشی کا احساس ہوا تھا اپنے اندر— ممکن ہے بولنا چاہا ہو۔لیکن اندر کے اندھیرے نے بولنے ہی نہیں دیا۔اندر ہی اندر گھٹتی رہی آواز۔

22 / ستمبر

ہوم لون کا انٹرسٹ ہمیشہ ہی وقت پر دینے میں ناکام رہا۔پہلے صرف فون کی گھنٹی بجتی تھی۔اب فون پر وارننگ بھی دی جانے لگی۔یاد آیا، پہلے ہم اندر لوک میں تھے۔کرائے کے مکان پر— سلیکھا کی جاب ہو جانے کے بعد سے ہی اس نے اپنے گھر کا راگ الاپنا شروع کر دیا تھا۔فون پر ہر وقت بجتی گھنٹیوں میں ایک سریلی آواز پرائیوٹ بینک والوں کی بھی ہوتی ہے۔سر......آپ کو ہوم......گاڑی وغیرہ کے لیے لون تو نہیں چاہئے۔تبھی پرم جیت ٹکرایا تھا۔ایک سکھ نوجوان— سارے کاغذات کی خانہ پری اسی نے کی۔سلیکھا اور میرے آئی کارڈ، ایڈریس پروف، تین سال کے انکم ریٹرن......اس کا اپنا کمیشن الگ......ان سب سے فارغ ہو کر بینک کے افسر سے ملنا تھا۔وہ ایک خوبصورت سی پچیس سال کی لڑکی تھی۔کچھ اہم اور رسمی باتیں— اور چند دنوں کے بعد پرمجیت کی محنت رنگ لائی۔لان سیکشن ہو گیا۔پہلے ہی پریت وہار کالونی کے ایک

فلیٹ کی بکنگ سلیکھا کرا چکی تھی۔ بینک سے آیا ملازم اس فلیٹ کی تصویر لے جا چکا تھا۔ اٹھائیس لاکھ کا لون۔ پرجیت کا فائیو پرسینٹ کا کمیشن — اور ہر مہینے بینک انٹرسٹ کے بیس ہزار روپے — سلیکھا اور مجھے ملا کر کر مہینے کے پینتیس ہزار ہو جاتے تھے۔ اب ہر مہینے کے بیس ہزار بینک انٹرسٹ میں چلے جا رہے تھے — بینک لون کے لیے بھی پرجیت کو شروع میں دینے کے لیے کچھ پیسوں کی ضرورت پڑی تھی۔ سوچتا ہوں، اپنا مکان آپ کو کتنی شرطوں پر حاصل ہوتا ہے۔ جب آپ اپنا سکھ چین سب کچھ ان شرطوں کے نام گروی رکھ دیتے ہیں۔

23 ستمبر

صبح صبح باہر گدھ منڈراتے دیکھے تو ڈر سا گیا —

'گدھ کیوں آئے — ؟'

آئے ہوں گے...... خود سے کہا۔

مگر کیوں؟ ایسے تو نہیں آتے — ؟

ٹھیک یہی وقت تھا، جب سلیکھا باہر آ کر بولی تھی...... جا رہی ہوں۔ آج دفتر میں کام بہت ہے۔ شاید زیادہ وقت لگ جائے۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے بھی نہیں رکی کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں یا نہیں — آج اس نے سلیولیس شرٹ پہنی تھی اور جینس۔ میں نے غور کیا اس نے اپنا پہناوا بھی چینج کر لیا ہے — شاید پہناوے کے ساتھ بہت کچھ۔ تھوڑی دور جانے کے بعد وہ پلٹی۔

' اور ہاں — میں نے موبائل کا سم، چینج کر دیا ہے۔ وہ بینک والے بہت پریشان کرنے لگے ہیں — لینڈ لائن کا فون مت اٹھانا — مگر ہاں — دو مہینے کا انٹرسٹ ہے۔ وہ ٹھہری — کسی دوست سے مانگ لونا — 'ایک بار پھر وہ بیگ ہلاتی نظروں سے اوجھل تھی۔

میرے اندر کی بے چینی بڑھ چکی تھی۔ شاید اب دماغ میں پٹاخے بھی چھوٹنے لگے تھے اور ہر گزرنے والے وقت کے ساتھ ان چھوٹتے پٹاخوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔

26 ستمبر

پڑوس میں وِل نام کے آدمی نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کی بیوی اسے چھوڑ کر دو دن پہلے بھاگ گئی تھی۔ کالونی میں پولس آئی تھی۔ کافی لوگوں سے پوچھ تاچھ ہوئی۔

28/دسمبر

کافی دنوں بعد وجیندر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ آج وہ رات کو یہیں رکے گا۔ مگر دوسرے دن صبح ہی چلا جائے گا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ رہا تھا— میرے چہرے پر پھیلی خاموشی کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وجیندر کے ہونٹ نفرت سے سکڑے ہوئے تھے۔

'مجھے پتہ تھا، ایک دن تم بیمار پڑ جاؤ گے۔ اندرلوک کیا برا تھا— مانا کہ کرائے کا گھر تھا۔ مگر یاد کرو۔ اف...... اس نے مجھے ہلانا بند کر دیا— یہاں کی فضا صرف بیمار کر سکتی ہے تمہیں۔ اور تم بیمار ہو گئے— اب چلو یہاں سے—

میں نے اس کی طرف نگاہ اٹھائی۔ شاید میں بہت کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر میرا ذہن مفلوج تھا۔ لفظ اندر ہی گھٹ گئے تھے۔ لگا، کچھ دنوں سے مسلسل چلنے والی پریشانی نے، مجھ سے میرے سارے لفظ چھین لیے ہوں۔

وجیندر دوسرے دن صبح ہوتے ہی چلا گیا۔ شاید اگر میرے اندر کی زبان کو وہ سمجھ پاتا تو وہ رک سکتا تھا۔ مگر پتھروں کے، گونگے درو دیوار کے درمیان جہاں چین کی دو سانسیں لینا مشکل ہوں، بھلا کون رک سکے گا—؟

29/ستمبر......

ہوم لون کے لیے مسلسل کئی بار فون آئے۔ دہلی اور ممبئی دونوں شاخوں سے— میں نے فون ضرور اٹھایا۔ لیکن میری آواز ہی جواب دے گئی تھی— صبح 11 بجے باہر ڈمرو کی آواز نے مجھے جگایا— کھڑکی کھولی۔ کبھی کبھی کالونی میں ایسے کھیل تماشہ کرنے والوں کو بڑی مشکل سے کسی کے کہنے پر اندر آنے کی پرمیشن دے دی جاتی ہے— وہ ایک بندر والا تھا۔ کالونی کی کچھ عورتیں تماشا دیکھ رہی تھیں۔ بندر والا ڈگڈگی بجاتا بندروں کا کھیل دکھا رہا تھا۔ اس کے ساتھ جمورا بھی تھا۔ جمورا یعنی ایک چھوٹا سا دس سال کا بچہ۔ بندر سے تھوڑا ہی بڑا— اور بندر کی طرح ہی کودتا پھاندتا اپنے کھیل دکھانے میں محو تھا...... میں بس ایک ٹک بندر اور اس بچے کو دیکھے جا رہا تھا— اندر ایک بے چینی سی تھی۔ ڈمرو کی آواز یکا یک بری لگنے لگی۔ وہ بچہ یکا یک مجھے پپیٹ یا کٹھ پتلی جیسا

دکھنے لگا تھا— محسوس ہوا، بندر نہیں— اسے نچایا جارہا ہو۔ اور بندر والے کے ساتھ رہتے رہتے— شاید اپنے انسان ہونے کے احساس کو مار کر، اس نے خود کو ایک بندر ہونے کی سانچے میں ڈھال لیا ہے۔

اس وقت بندر، بندر نہیں بلکہ وہ ہے— وہ بندر اندر ہلچل مچارہا تھا— آگے کھیل دیکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی— اپنے بستر تک آنے تک جیسے دماغ آگ کا انگارا بن چکا تھا— میں مسلسل اپنے سر ہلا رہا تھا۔ جیسے سارا نظام ہی بدتر ہو اور اس سارے نظام کو خراب کرنے میں صرف سلیکھا کا ہاتھ ہو— نہیں، شاید آپ یقین نہیں کریں، اس وقت میرے اندر کچھ عجیب سی کارروائی چل رہی تھی۔ میں اپنے ہی سوال و جواب میں الجھا ہوا تھا—

سوال: بندر والا کیوں آیا—؟

جواب: سلیکھا لائی۔

سوال: بندر والے نے روٹی کھائی—؟

جواب: سلیکھا نے نہیں دی۔

سوال: کالونی میں کسی کو بھی آنے کیوں دیا جاتا ہے؟

جواب: سلیکھا قصوروار ہے۔

سوال: کشمیر میں برف کیوں گری؟

جواب: سلیکھا جواب دہ ہے۔

سوال: چار دہشت گرد مارے گئے؟

جواب: سلیکھا جانتی ہے۔

سوال: پالیوشن بہت بڑھ گیا ہے؟

جواب: سلیکھا قصوروار ہے۔

آپ سمجھ سکتے ہیں، جیسے میرے آخری نشانے پر صرف سلیکھا تھی— لیکن میں بولنے سے معذور تھا۔ سننے سے بھی— میرے جسم کے اندر عجیب سے کیمیائی ردعمل ہو رہے تھے— جیسے شاید اس کیمیائی عمل کو سمجھ پانا اب میرے لیے آسان نہیں تھا۔ مگر اس پورے عمل میں، میں صرف ایک بے زبان جانور بن گیا تھا— شاید میرے اندر اس قدر اندھیرا اور سناٹا اکٹھا ہو چکا تھا، جس کے بارے میں، میں خود بھی نہیں جانتا تھا، کہ اس بے حد گہرے سناٹے اور اندھیرے کا خاتمہ کیسے

ممکن ہے؟ بستر...... بستر سے بالکنی...... پھر بستر...... اندر جیسے دھماکے چل رہے تھے— کبھی مسکراتا، جیسے ملک، سیاست اور سازش کے ہر ایک پہلو سے کوئی واقف ہے تو صرف میں— میں اندر ہی اندر ہنس رہا تھا۔ شاید میں اس وقت اس دنیا کا ذہین ترین انسان تھا— اور میں اس دن، کسی بات پر دیر تک ہاتھوں کی انگلیوں سے اشارہ کرتا، کچھ بتانے یا کہنے کی بھی خود سے کوشش کر رہا تھا— پھر کچھ بڑبڑاتا۔ مگر لفظ، شاید لفظ نہیں تھے— لفظ کہاں تھے— میں نے نظر اٹھائی۔

ذہن میں اب بھی پٹاخے چھوٹ رہے تھے— دروازے پر سلیکھا کھڑی تھی— اور میں سلیکھا کی جانب ایسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی چھپکلی، گلاس، سامنے کی دیوار یا اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو دیکھ رہا ہوں— اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے کہ شاید اُس کی آنکھوں میں ماند پڑی ہوئی چمک کے ساتھ ایک نفرت رہ گئی تھی— گہری نفرت— جیسے اس کی الجھی الجھی سی آنکھیں مجھے ایک نفسیاتی مریض یا پاگل سمجھ رہی ہوں— شاید وہ چیخی بھی تھی—

'ناٹک بند کرو...... سنا تم نے......'

وہ وہیں کھڑی رہی۔ میری طرف آگے نہیں بڑھی۔

'مجھے ڈراؤ مت— سنا تم نے— ایسا کیوں کر رہے ہو— پاگل ہو گئے ہو کیا؟ نہیں، تم ناٹک کر رہے ہو۔ بینک کے لیے کسی کو فون کیا—؟ ناٹک مت کرو۔ اسکیپ ہے یہ تمہارا— ذمے داریوں سے بچنا چاہتے ہو— سنو! زیادہ پاگل پن کرو گے تو چلی جاؤں گی تمہیں چھوڑ کر۔ یونو، میں نہیں سہنے والی تمہارا ڈرامہ— ' لفظ غائب تھے۔ اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے، اس وقت سلیکھا ایلس ان ونڈر لینڈ کی بلّی بن گئی تھی۔ میں بلّی کی مونچھوں کو دیکھ رہا تھا۔ سلیکھا غائب تھی۔ بلّی کی مونچھیں میرے سامنے تھیں اور ان مونچھوں کو دیکھ کر میں ہنس رہا تھا۔ شاید سلیکھا مجھے ہنستا دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔

30 رستمبر 2007

سلیکھا صبح جلد اٹھ گئی۔ شاید رات والے کا متاناتھ کو برداشت کرنا اس کے لیے ناممکن سا تھا— صبح وہ کب اٹھی، تیار ہوئی۔ شاید میں یہ سب جاننا بھی نہیں چاہتا تھا یا میرے پاس سوچنے لائق اس وقت کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ صبح ساڑھے سات کے آس پاس میں نے صرف اس کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ وہ سفید جھینے سوٹ میں تھی۔ گھبرائی سی— آہستہ سے میرے کمرے کا

دروازہ کھول کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی تو میں نے 'سیمل' کے پیڑ پر بیٹھے بندروں کی طرح اسے دیکھ کر اپنی کھیسیں نپوڑ دیں —— ایک چیخ کے ساتھ اسے دروازے سے بھاگتا دیکھا میں نے —— مگر شاید ٹھیک سے کچھ یاد نہیں کہ ایسا کیسے ہو گیا تھا۔ شاید بچپن کے احساس آپ کے اندر کہیں رہ جاتے ہیں —— بچپن، گھر کی دیوار کے اس پار کھنڈر میں وہ سیمل کا پیڑ —— جنوری فروری کی خوشگوار ہواؤں میں سیمل سے روئی اڑاتے بندر۔ میں اُنہیں مارنے کو ہاتھ ہلاتا تو وہ زور سے اپنی 'دولتی' چلاتے ادھر سے اُدھر پھاندنے لگتے —— شاید انسان ہونے کے تمام احساسوں کے باوجود وہ 'ڈارون' کا جانور اندر ہی ہوتا ہے...... سلیکھا کے جانے کے بعد بھی شاید یہ 'بندر' آزاد تھا۔ یا چھپک رہا تھا۔ یا شاید سب کچھ بھول گیا تھا۔ کارنس پر چڑھ گیا۔ یہاں ایک قطار سے دوا کی خالی شیشیاں پڑی تھیں...... اب میں اُنہیں پھینک رہا تھا۔

'لے کلبل آ...... پکڑ......' یہ کلبل آ کون تھا —— ؟ اچانک دماغ میں دھول میں سنا چہرہ کیسے آ گیا —— ؟ جبکہ شاید میں نیم بیہوشی کی حالت میں تھا۔ دماغ سو رہا تھا...... پر بوا کا بدمعاش بچہ کلبل آنکھوں کے آگے تھے......

'لے...... سالے پکڑ...... آم پکڑ۔ لے یہ امرود پکڑ...... لے نا...... ایک دو تین سات...... شیشیاں دھائیں دھائیں زمین پر گر کر ٹوٹتی رہیں —— آنکھوں کے آگے لال دھندلی پرچھائیاں پھیل گئیں تھیں۔ دماغ جل رہا تھا۔ کارنس سے نیچے کودنے تک میں زور سے چیخا تھا...... اور شیشیوں کی ٹوٹی کرچیاں میرے پاؤں کو زخمی کر چکی تھیں......

نیم بیہوشی کی حالت میں تھا۔ اس لیے دروازے کے اندر آتے وجیندر کی زوردار چیخ بھی شاید میں نہیں سن پایا تھا۔ اب سوچتا ہوں، وجیندر اس وقت اچانک نہیں آیا ہوتا؟ کیا من کی آنکھیں ہوتی ہیں —— ؟ یا روح کے اندر 'ٹیلی پیتھی' کا کوئی وائر ہوتا ہے، جو کہیں نہ کہیں میرے لیے وجیندر کے احساس سے بھی وابستہ تھا......

شام، دونوں پاؤں میں پٹیاں بندھی تھیں —— وجیندر میرے پاس بیڈ پر بیٹھا تھا۔ میری آنکھوں میں جھانکتا...... جیسے اس لمحے کے دردناک منظر کو اپنی گہری حساس آنکھوں سے، ایک نئی دلیل کے 'ٹیسٹ ٹیوب' میں ڈال رہا ہو۔

'سنو چچو...... میرے کمرے میں آنے تک شیشے کے ہزاروں ٹکڑوں کے درمیان تمہارا جسم ایسے پڑا تھا، جیسے تاج محل کی تعمیر کرنے والے کاریگر کام سے تھک کر سنگ مرمر کے مرمریں

چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے درمیان آرام کر رہے ہوں— تمہارے پاؤں سے خون نکل رہا تھا...... اور یہ خون شیشے کے چھوٹے چھوٹے ان گنت ٹکڑوں سے نکل کر دھول میں پیوست ہونے کی تیاری کر رہے تھے— سنو، جیو— دیکھومت— ایسے مت دیکھو مجھے— تب پہلی بار لگا، تالستائے کوانا کارنینا کی بیوفائی میں بھی کیسی وفاپرست عورت نظر آئی ہوگی— یا پھر دوستووسکی کا وہ ایڈیٹ جو پرنسز کی محفل میں شرمایا شرمایا سا، ایلٹ کلاس کے لوگوں کے درمیان آتا ہے— اور بے وقوفوں کی طرح ہاتھ سے شراب کا گلاس چھوٹ جاتا ہے...... تم ایک بیوقوف نظر آرہے تھے— یا شاید ایک بے حد نیک آدمی— جس نے اپنے من کی شانتی کے لیے شیشے اور خون کا ملا جلا روپ چنا تھا— 'وجیند رلہروں کی طرح شانت تھا— 'بے حد شریف لوگ شاید سب سے بے رحم ہوتے ہیں۔ بے حد شریف لوگ خود ہی اپنی پریشانیوں کے خیمے لگاتے ہیں، اور زندگی کے پریشان کن سفر میں بھی بے حد شرافت سے گزر جاتے ہیں— بے حد شریف لوگ صرف خود سے پیار کرتے ہیں یا خود سے ڈرتے ہیں— اپنی ضروری خواہشات سے 'کام واسنا' کی تکمیل تک وہ بے حد شرافت سے خود ہی دائرے کھینچتے' بناتے اور توڑتے رہتے ہیں۔ وہ بے حد ڈراؤنی آواز میں بولا تھا— سلیکھا میری بہن ہے تو کیا ہوا؟ ہے تو ایک عورت نا؟ عورت کو مرد میں شرافت نہیں، بھرے بھرے بالوں والوں والا ایک ریچھ چاہئے— ایک وحشی آدمی......

اس نے دھیرے سے بتایا— ابھی کچھ دنوں تک یہیں رہوں گا۔ ڈرو مت— تمہارے لیے رہوں گا۔ اور ہاں— تمہارے لیے ایک سرپرائز پیکج ہے۔ آگے بڑھ کر اس نے بیگ سے وہ پراسرار آلہ کھول لیا تھا پھر مین سوئچ میں پلگ لگاتے ہوئے بولا تھا— ہم جس عمر کے بھی ہوں، تھک جاتے ہیں— گلوبل گاؤں کا سب سے بڑا تحفہ ہے— تھکان— سائبر سے کال سینٹر تک— آنکھوں سے جسم تک— ہم صرف خون کی جگہ تھکان لے کر زندگی کی ریس میں آگے بڑھنے کا ناٹک کرتے ہیں— جاگنگ پارک سے لافٹر کلب، 'یوگ' سے رام دیو کی چھوٹی چھوٹی ورزش یا دونوں انگلیوں کے ناخونوں کو آپس میں رگڑنے تک— ہم صرف اپنے حصے کی تھکان اتارنا چاہتے ہیں— پھر یہ تھکان اچانک ایک بند کمرے میں ہمارے لیے خوشیوں کے ہزاروں دراوزے کھول دیتی ہے...... اور دوسرے ممالک کے، ہم سے زیادہ تھکے ہوئے پرندے، تھکن مٹانے کے لیے اپنے لباس اتارنے لگتے ہیں...... پینٹی اتاروں، برا......؟ تم وہ دکھاؤ گے— مسٹر وجیندر......؟ میں پوری طرح سے ننگی ہوں۔ تمہارا انتظار کر رہی ہوں...... ہاٹ

چیٹ، سیکس...... ننگے جسم...... ننگی باتیں...... اس لمحہ میں لگتا ہے، طالبان جیسے مجرموں کے ہاتھوں ایٹم بم لگ گیا ہو— تہذیب ختم...... دنیا کا خاتمہ— صرف ایک بدنما جسم رہ گیا ہو...... اور جانوروں جیسا ننگا ناچ...... ہم ایک بے حد، مہذب صدی میں سارے کپڑے اتار کر داخل ہو گئے ہیں......'

وہ پراسرار آلہ کھل گیا تھا، جسے ہم آگے لیپ ٹاپ کے نام سے جانیں گے، مگر اس وقت وہ صرف ایک آلہ تھا۔ بیگ سے ہٹتے ہی، باہر نکلتے ہی میں رقص کرتی انگلیوں کے ساتھ ایک پر اسرار پردے کی رنگین روشنیوں کو دیکھ رہا تھا— لیکن لفظ؟ دماغ صفر تھا۔ آنکھیں بیجان...... اور جسم کسی لاش کی طرح— میں دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہیں دیکھ رہا تھا— سنتے ہوئے بھی کچھ نہیں سن رہا تھا......

رات سلیکھا دیر سے آئی— اس نے صرف وجیندر سے میرے بارے میں سنا۔ پھر اپنے کمرے میں چلی گئی— شاید ایک وقت آتا ہے، جب ہم ایک دوسرے کے ساتھ ہی جینا اور مرنا چاہتے ہیں— اور شاید ایک وقت آتا ہے، جب یہ رسمیں دھند میں ایسے کھو جاتی ہیں، جیسے کبھی ماضی کا حصہ بھی نہ ہوں— جیسے دو جسم ایک دوسرے کے لئے اُداس ہو کر— ایک دوسرے نظر چرانے لگتے ہیں۔

اسی رات— ایک واقعہ اور ہوا— بارہ بجے کے آس پاس آنکھیں کھل گئیں۔ ذرا سا ہوش آیا تھا— سر کے پچھلے حصے میں دنادن نگاڑے بج رہے تھے...... دونوں پیروں میں پٹیاں بندھی تھیں۔ پھر بھی سہارا لیتے ہوئے اٹھ بیٹھا— دوسری طرف زمین پر وجیندر سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے گونج رہے تھے۔ ڈری ڈری سلیکھا کا چہرہ آنکھوں کے پردے پر تیر رہا تھا۔ بچوں کی طرح دل تالیاں بجانے کو کر رہا تھا— خواہش ہوئی، سلیکھا کو دیکھوں— وہ کہاں ہے؟ صبح کیسے بھاگ تھی......؟

بھاگ سلیکھا......

اب دماغ میں میزائلیں چل رہی ہیں۔

بھاگ سلیکھا...... بھاگ...... لے...... دیکھ۔ بندر...... دونوں ہاتھوں کو بندر کی طرح

کر کے ڈراؤں — پاؤں کی پٹیاں بھول گیا۔ لنگڑاتے بستر سے اٹھا...... دماغ سائیں سائیں...... اسی حالت میں جانے کیسے طاقت آ گئی تھی۔ چلتا ہوا سلیکھا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ہاتھ کے پنجے پھیلائے...... دانت نپوڑے...... منہ سے بندر کی آواز نکالی — کاؤں...... کاؤں — کمرے کا اندھیرا۔ بستر پر سوئی سلیکھا...... تیز چیخ کے ساتھ، لائٹ جلا کر وہ دیوار سے لگی کانپ رہی تھی۔

چھوڑ دو مجھے...... چھوڑ دو۔

کاؤں...... کاؤں......

چیخ سن کر دروازے میں داخل ہوا وجیندر ہنس رہا تھا —

یہ کیا شرارت تھی جیجو؟

کاؤں...... کاؤں......

'او دیدی...... تم اتنی گھبرائی کیوں ہو......؟'

اچانک وجیندر کو قریب محسوس کرتے ہوئے وہ اپنا خوف بھول گئی تھی — سلیکھا کی دہاڑ گونجی تھی...... مہذب سماج میں پاگل کتوں کو شوٹ کر دیا جاتا ہے......

'یہ کتا نہیں ہے......'

'کاؤں...... کاؤں......'

'کتے سے بدتر ہے......'

'کاؤں کاؤں......'

وہ رو رہی تھی — 'بہت ہو گیا۔ اب اس سے میرا پنڈ چھڑواؤ وجیندر۔ یہ اپکار کرو۔ میں اس گھر میں نہیں رہ سکتی...... لمبی سانس لیتے ہوئے وہ بولی تھی...... میرے باس او برائے نے مکان کے لون بھر دیے ہیں۔ میں نے ایک دوسرا فلیٹ دیکھا ہے۔ وہ اس سے کم قیمت کا ہے......'

'پھر — ؟'

'اس کا پیسہ ایڈوانس میں لے کر بینک کا باقی قرض ادا کر دوں گی۔ پھر دوسرے فلیٹ میں چلی جاؤں گی —'

کاؤں...... کاؤں

شاید نیم بیہوشی کی حالت میں بھی بہت کچھ سن رہا تھا۔ بلکہ مسکرا رہا تھا — دماغ کا تناؤ اتر گیا تھا۔ صرف صفر ہی صفر...... بستر میں لیٹنے تک پاؤں بھاری بھاری لگ رہے تھے۔

'ڈیڈی تمہیں چھوڑ دے گی......'

کاؤں......کاؤں......

'او برائے نئے فلیٹ کے لیے اسے لون دلائیں گے۔ شاید کچھ اور بھی......'

کاؤں......کاؤں......

انسان بنو چچو...... پاگل پن تمہیں مار ڈالے گا......

بے دلی سے اس نے پراسرار آلہ کھول لیا تھا— شاید رات کے وقت، اس ڈراؤنے ناٹک سے باہر نکلنے کے لیے، وہ تھرکتی پرچھائیوں میں اپنی تھکن پیوست کرنا چاہتا تھا...... دماغ صفر ہوتے ہوئے بھی آنکھیں جاگ رہی تھیں...... اسکرین پر ننگی حسیناؤں کے جسم روشن تھے......

دماغ صفر ہوتے ہوئے بھی اندر کے اعضاء میں ایک کھنچاؤ محسوس کر رہا تھا......

3 / اکتوبر 2007

بعد کے دو دن بھی عجیب سے گزرے— اب سوچتا ہوں تو شاید آنکھوں کے آگے صرف ایک لال رنگ رہ گیا تھا۔ سامنے کی پرچھائیں اسی لال رنگ میں نہائی ہوئی لگتی تھی— شاید کوئی بھی آواز میرے کانوں سے نہیں ٹکرا رہی تھی— بس ایک ہلکی پِپ کی آواز...... آنکھوں کے آگے جیسے صرف ایک لال دائرہ— سامنے کا ہر ایک چہرہ ان لال پرچھائیوں میں سمٹ گیا تھا۔ دماغ بوجھل تھا۔ شاید دماغ کچھ بھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کھو چکا تھا۔ یہ وجیندر کے ذریعے لائی گئی دوائیوں کا نتیجہ تھا۔ جس نے مجھے گہری نیند سلا دیا تھا— لیکن دوا کا اثر کم ہوتے ہی وہ بندر پھر سے زندہ تھا۔

کاؤں......کاؤں......

سلیکھا مار ڈالے گی مجھے......

کاؤں......کاؤں......

بہت گندی ہے سلیکھا......

کاؤں......

اب یاد کرتا ہوں تو جیسے یادوں کے کسی حسین کشمیر میں— کسی ڈل جھیل کے کنارے— یا کسی حسین شکارے پر، یا کسی برف پوش وادی میں سلیکھا کے دھندلے پڑ گئے

چہرے کے نقوش مجھے پھر سے بے چین کر دیتے ہیں — تب میں پچپن کا تھا اور سلیکھا پچیس کی — لیکن وہ پیار میں عمر کی کسی حد کو نہیں مانتی تھی......

'مان لو اگر اُلٹا ہوتا تو — یعنی میں 35 کی ہوتی اور تم......؟'

اس کی آنکھیں سچ مچ کشمیر کی ڈل لیک بن جاتیں، جن پر چپو چلاتا میں محبت کے حسین شکارے کو بس دور تک بہتا ہوا دیکھتا رہتا......

شاید سب کچھ ایک طلسم کی طرح ہے — جینا ایک راز ہے — اور جیسا کہ اس چینی فلاسفر نے کہا تھا' — ماضی، تاریخ سے زیادہ صرف ایک 'مسٹری' ہے — ایک جادو کا ڈبہ، وہاں صرف ان چیزوں کو محسوس کرو، جو تم سے چھوٹ گئی ہے...... ایسے واقعات جو بے حد حسین تھے — یا شاید تم بھی، جب ماضی میں کسی کی انگلیاں پکڑے چل رہے تھے......

لیکن شاید آج کی سلیکھا میں وہ ماضی کہیں دفن ہو چکا ہے — اسے کسی شمشان، مرگھٹ یا قبرستان سے زندہ بھی کرنا چاہوں تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔

4/اکتوبر 2007

حالت ویسی ہی بنی ہوئی تھی — ڈاکٹر میری دماغی حالت کو لے کر فکر مند تھے۔ شاید کوئی بھیانک صدمہ — شوگر لیبل ہائی — بلڈ پریشر بھی ضرورت سے زیادہ بڑھا ہوا۔ اٹیک آسکتا تھا۔ برین ہیمبرج یا پھر...... وجیندر کو فکر تھی کہ میں آہستہ آہستہ موت کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ ورنہ اتنی ساری بیماریاں؟ یہ بیماریاں اچانک تو نہیں آئی ہوں گی۔ کیا میں برسوں سے اندر ہی اندر گھلتا جا رہا تھا؟ کیا سلیکھا کی وجہ سے......؟ تو کبھی اس سے کھل کر باتیں کیوں نہیں کی؟ دونوں بیٹھ کر اندر پسری اداسی کو ایک راستہ تو دے ہی سکتے تھے...... لیکن شاید ضرورت سے زیادہ کھل جانے اور اچانک 'پر' (پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے۔) مل جانے کی امید نے اسے ایک باغی عورت میں تبدیل کر دیا تھا — ایک ایسی عورت' جواب دوسرے کمرے میں سوتی تھی۔ اس سے گھریلو مسائل کے علاوہ کسی بھی مدعے پر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ نئے کپڑے، نئے موبائیل، نئی اڑان...... اور محض نبھائے جانے کے رشتے پر غور کرتا ہوا میں صرف ایک نامرد بھر رہ گیا تھا — اپنی ہی آگ میں جلتا۔ اپنی ہی تسلی یا تسکین سے خود کو بہلاتا یا اپنی عام خواہشات سے لڑتا، بستر پر شہید ہو جانے والا ایک نامرد......

اس رات میں نے ایک اور حرکت کی — رات گیارہ بجے تک سلیکھا نہیں آئی تھی۔ وجیندر پاس ہی بیٹھا اس پراسرار آلہ میں الجھا ہوا ایم اسکرین پر روشن پریوں سے دل بہلا رہا تھا۔

وہ کب کیسے کچن سے سبزی کاٹنے والی چھری لے کر سلیکھا کے بیڈروم میں پہنچ گیا، نہیں جانتا...... اندر نفرت کی تیز آگ، جیسے کسی جانور میں تبدیل کر رہی تھی......

اچانک آہٹ ہوئی۔ اور ماحول میں ایک تیز گونج گئی — وجیندر کا ہاتھ پکڑے سلیکھا آنکھیں پھاڑے چیختی...... لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوئی جیسے 'بابل' کے ہلتے مینار میں تبدیل ہو گئی تھی — سامنے میں کھڑا تھا — ہاتھ میں چاقو پکڑا تھا...... بستر کے تکیے اُدھڑ گئے تھے...... اس کی روئی بستر پر بکھری تھی......

وجیندر نے آگے بڑھ کر ہاتھوں میں چاقو لیا — اور مجھے لے کر سیدھے میرے کمرے میں آ گیا......

6/اکتوبر 2007

پچھلی رات والے واقعہ کی تفصیل مجھے وجیندر سے ملی۔

'وہ مینٹل ہو چکا ہے؟' سلیکھا روتی ہوئی کانپ رہی تھی۔

'نہیں دیدی......'

'وہ مجھے مارنے آیا تھا۔ تم نے دیکھا نا...... میرے بستر کی کیا شکل بنا دی اس نے۔ اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ وہ مجھ پر حملہ کر سکتا تھا۔'

'میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، ایسے لوگ حملہ نہیں کر سکتے۔'

'لیکن کیسے کہہ سکتے ہو......'

'کیونکہ جیجو جو کچھ بھی کرتے ہیں، تمہاری غیر حاضری میں کرتے ہیں — تمہارے سامنے ہمت نہیں پڑتی — اب دیکھو نہ دیدی۔ برسوں کی محبت کے بعد اگر وہ محسوس کرتے ہیں کہ اب تمہارے اندر محبت باقی نہیں رہ گئی ہے......'

'تو کیا یہ صرف میری غلطی تھی؟'

'نہیں دیدی۔ میں یہ نہیں کہہ رہا۔ شاید جو تمہارے لیے قابل قبول رہا ہو، وہ جیجو کے لیے نہیں رہا۔ جیسے نئی ہوا، نیا ماحول یا نئی اڑان......'

'اگر وہ نہیں بدلے، تو اس میں میری کیا غلطی......؟' سلیکھا چیخ رہی تھی — بس بہت ہو گیا۔ اب یہ آدمی جان بھی لے سکتا ہے میری۔ ڈاکٹر سے بات کرو اور اسے مینٹل ہاسپٹل بھجواؤ۔ اس سے آگے میں کچھ بھی نہیں سننا چاہتی......'

'جِجو کو ایک موقع اور دو دیدی۔ بس ایک موقع۔ کل میں ڈاکٹر راجیندر سے پھر بات کروں گا۔ اگر ضرورت محسوس کی گئی تو کسی سائکریٹس سے......'

'فالتو میں پیسہ برباد کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔' سلیکھا نے پانچ سو کے دو نوٹ اس کی طرف بڑھائے — ڈاکٹر سے بات کرو اور پاگل خانے میں مرنے دو بڑھؤ کو۔ 'ایسے بھی اس کے پاس جینے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا ہے......'

حیرت زدہ وجیندر اس خالی جگہ کو دیکھ رہا تھا، جہاں ابھی کچھ دیر پہلے دیدی کھڑی تھی — کتابوں اور ناٹک کے شوقین وجیندر کی آنکھوں سے جیسے اس وقت دنیا کا سارا ادب ایک ایک کر کے گزر گیا تھا — پھر ایک دن ہم، اسی بے رحم بازار کا حصہ بن جاتے ہیں — پھر محبت خاموش ہو جاتی ہے۔ پھر ہم بھی گم ہو جاتے ہیں۔

8/ اکتوبر 2007

تین چار دن گزر گئے تھے۔ پٹیاں کھل گئی تھیں۔ زخم کسی قدر بھر گیا تھا۔ وہ صبح عام صبح سے کچھ الگ تھی۔ وجیندر نے نیلی جینس اور سفید ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ دو دن پہلے اس نے سائکریٹس سے وقت لیا تھا۔ اس نے کیا پوچھا — کچھ یاد نہیں — میں نے کیا جواب دیا، شاید یہ بھی یاد نہیں — ڈاکٹر اور وجیندر کچھ دیر آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے — پھر ہم گھر چلے آئے۔ وجیندر زیادہ تر خود میں کھویا رہا۔ پرانی دوائیوں کی جگہ کچھ نئی دوائیاں آ گئی تھیں......اس دن ناشتے کے بعد وجیندر کچھ دیر تک غور سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

'میں کچھ دنوں کے لیے رک گیا ہوں جِجو۔ لیکن مجھے جانا تو ہوگا نا......اور اگر میں چلا گیا تو — ؟ تم دیدی سے آپسی مکالمے کے دروازے بھی بند کر چکے ہو......پھر — ؟ شاید دنیا اس لیے بے حد بری ہو گئی ہے کہ ہم سارے جذبوں کو ایک ایک کر کے ختم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ممکن ہے دیدی یہ سوچے کہ تمہیں مرنا ہی ہے — پھر تمہارے لیے وہ خود کو کیوں مارے؟ ایک نئی زندگی باقی ہے۔ اس کے پاس — جہاں تمہارے بغیر بھی، شاید تم سے زیادہ بہتر طریقے سے وہ اپنے لیے

تاروں بھرا آسمان چن سکتی ہے— مگر تم—؟ تم تو یوں ہی دیکھتے دیکھتے مر جاؤ گے......' وہ گھوما— اس کی آنکھیں نم تھیں— ہیمنگ وے نے کہا تھا— زمین کا ایک ٹکڑا بھی سمندر بہا کر لے گیا تو زمین کم ہو جاتی ہے۔ ایک بھی آدمی مرتا ہے تو، انسانی برادری میں کمی آ جاتی ہے— پھر کیوں مرنے دوں تمہیں—؟ یہاں کوئی جذباتیت، آدرش یا رشتے نہیں ہیں— شاید اسی لیے میں رک گیا...... زندگی بھر نہیں رک سکتا۔ پاگل مت بنو— میری بات سنو......

ٹہلتے ہوئے وہ دہاڑا تھا— 'سنو جیجو۔ چہرے کو شمشان بنانے سے کام نہیں چلے گا— جاگو۔ اٹھو، دیدی تمہیں پاگل کہتی ہے— لیکن میں جانتا ہوں تم پاگل نہیں ہو— اس نظام میں کون پاگل نہیں ہے۔ میں؟ دیدی یا تم؟ میں نظام کو قصوروار نہیں کہتا، کیونکہ یہ سسٹم ہم نے ہی تیار کیا ہے۔ جہاں ایک بڑا سا مین ہول ہے۔ گٹر...... اور ہم آہستہ آہستہ یہاں اپنا کوڑا ڈالتے جا رہے ہیں— اس سسٹم نے صرف ایک چیز سکھائی ہے— اڑنا ہو تو سامنے والے کے پر کاٹ دو— سب اپنی خواہش، اپنی آزادی اور اپنے آسمان کے لیے خود غرض ہو چکے ہیں— مگر جیجو، اس سسٹم میں مر جانا کوئی حل نہیں ہے— اور نہ یہ تمہاری عمر مر جانے کے لیے ہے......

وہ دوبارہ میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ ہنس رہا تھا— 'پینسٹھ سال کی عمر میں رچرڈ گیئر ہماری شلپا شیٹی کو کس کر سکتا ہے— ان کے جیمس بانڈ، زیرو زیرو سیون پچاس سے زیادہ عمر میں ہزاروں فٹ کی بلندی سے کودنے کا فیصلہ لیتے ہیں اور جیجو تم—

وہ مسکرا رہا تھا— سچ کہوں تو یہ دنیا بہت حسین ہے جیجو۔ مگر ان کے لیے جو جینا جانتے ہیں۔

اُس نے لیپ ٹاپ اوپن کیا...... چہرے پر مسکراہٹ تھی...... دیدی بری نہیں ہے— تمہیں چھوڑ کر اگر وہ کہیں اور اپنی خوشیاں تلاش کرتی ہے تو اس میں برا کیا ہے—؟ یہ تلاش تم کیوں نہیں کرتے— جب تم دونوں کے درمیان بے حد نراشا یعنی نا امیدی کے دن چل رہے ہوں گے، اس نے اپنی تلاش شروع کر دی ہوگی— ایک نئی زندگی۔ ایک نیا آسمان— ویسے صرف نبھائے جانے کو میں شادی شدہ جوڑے کی کمزوری مانتا ہوں— رشتے چل نہیں پا رہے تو اپنی مرضی سے اپنی نئی خوشیاں تلاش کر لو۔

لیپ ٹاپ پر اس کی انگلیوں کا رقص جاری تھا۔ اسکرین روشن تھا۔ اس نے یاہو میسنجر کھول لیا تھا...... ہاتھ چیٹ پر تیز تیز چل رہے تھے...... کوئی فلورایا، کوئی عینا، کوئی جسمین...... ڈڈیو

جسٹ ام...... می؟ ہائے۔ آئی ایم 18 ہاٹ فیمل — آئی ایم گیٹنگ نیکڈ اون مائی ویب کیم — وانا سی — لوکنگ فارسم کمپنی سیکسی —؟

وہ ہنس رہا تھا — دیکھو جیجو میں جانتا ہوں سب دیکھ رہے ہو تم — پاگل پن کا ڈھونگ مت کرو — دیکھو، یہاں سب اپنی تھکان مٹانا چاہتی ہیں۔ آپ کو ریلیکس کرانا چاہتی ہیں۔ آپ کے آن لائن ہوتے ہی سمجھ جاتی ہیں کہ آپ چاہتے کیا ہیں...... کبھی کبھی کارل مارکس، لینن اور دوستوو سکی کا ادب پھینک کر سب کچھ بھول جانے کی خواہش ہوتی ہے — کچھ دیر، دنیا بھر کی الجھنوں سے الگ، ان ہاٹ پریوں کے ساتھ...... وہ دیکھو جیجو...... اس نے سارے کپڑے اتار دیئے ہیں...... ہندوستان سے پاکستان، شری لنکا، نیپال اور ایران تک — یا پھر رومانس چیٹ روم کی یہ بنداس پریاں — جیسے دنیا میں صرف ایک چیز رہ گئی ہے — بھوک — یہ بھوک صرف وہیں نہیں ہے — ذرا اپنے انڈیا کے روم میں تو جا کر چیٹ کرو — سترہ سے ستر تک کی عورتیں جیسے سب کچھ بھول کر ہاٹ اور سیکس کا مزا لینا چاہتی ہیں۔ یہ اسکول اور کالج کی لڑکیاں پڑھتی بھی ہوں گی۔ کچھ سرکاری محکموں میں — کچھ ہاؤس وائف بھی ہوں گی — مگر کیوں جیجو......؟ کیونکہ دماغی الجھنوں اور دباؤ سے کچھ لمحہ ہم آزادی چاہتے ہیں — غلط یہ ہے کہ سیکس پر ہم کبھی بات کرنے کو تیار نہیں ہوئے — یہ لڑکیاں بھی ہاٹ چیٹ کے بعد سب کچھ بھول کر ایک عام لڑکی یا عورت میں تبدیل ہو جاتی ہوں گی۔ کچن میں چائے تیار کرتی ہوئی — یا کالج کے نوٹس تیار کرتی ہوئی — بھوک ہے تو بھوک کا اقرار کرتے ہوئے شرمندگی کیسی؟ جسم میں آگ ہے تو اسے ٹھنڈا کر کے کیسے جیا جا سکتا ہے —؟ یہاں تہذیب و روایت کی کوئی تھیوری کام نہیں کرتی۔ اس لیے میں کارل مارکس اور پریم چند کو پڑھتے ہوئے بھی ان کا ساتھ چاہتا ہوں کہ یہ مجھے آسانی سے حاصل ہو جاتی ہیں۔

ایک لمحے لے لیے میری پلکیں ہلی تھیں شاید...... اسکرین پر ننگی 20 سالہ لڑکی اپنے حسین، پرکشش، ننگے جسم کی نمائش کر رہی تھی — بس ایک لمحے کو...... بُم...... بُم...... بُم...... بُم...... آنکھیں پھر سکڑ گئی تھیں......

وجیندر لوٹ آیا تھا — میرے چہرے کے ری ایکشن کو دیکھتے ہوئے ہنس رہا تھا — 'سالے جیجو دیکھ...... نو...... یہاں یہاں ہاتھ رکھو...... کمپیوٹر کی طرح یہاں ماؤس نہیں ہے۔ بس

آپ کی انگلیوں کا لمس۔ دو چار بار پریکٹس کرو گے تو سب آجائے گا۔ پہلے تمہاری میل آئی ڈی بناتے ہیں...... پھر میسنجر پر چیٹ کرنا......

کچھ دیر تک وہ میرے بے حرکت ہاتھوں کو چلانے کی پریکٹس کراتا رہا۔ اب وہ خوش تھا— دیکھو دیکھو...... دیکھو۔ یہ گوگل ہے، یہ جی میل، یہ آرکٹ...... یہ فیس بک...... ساری دنیا تمہارے پاس ہے۔ اپنی تنہائیاں شیئر کرو۔ اپنی اُداسیاں بانٹو اور بھول جاؤ کہ دنیا کیا کہتی ہے...... کیونکہ دنیا تمہاری پروانہیں کرتی— اور نہ ہی دنیا تمہارے جسم کی بھوک سے واقف ہے— تم جلدی بوڑھے اس لیے ہوگئے کہ تم نے خود کو تمام خوشیوں سے محروم کرلیا تھا۔

پلکیں ایک لمحے کو پھر ہلی تھیں...... جیسے اچانک دماغ میں تیز سنسناہٹ سی دوڑ گئی ہو......

لیکن کیا وہ سب کچھ جو جیندر کہہ رہا تھا، کیا ممکن تھا میرے لیے— میں ایکیوریم کے باسی پانی میں رکھی بے جان مچھلی کی طرح مردہ تھا— سانسیں تو چل رہی تھیں، لیکن دماغ سے جسم تک سب کچھ ایک بے جان روح کی طرح سرد۔

16/اکتوبر 2007

اچھی بات صرف ایک ہوئی کہ اس درمیان میں 'وائلڈ' نہیں ہوا— ممکن ہے۔ یہ دوا کا بھی نتیجہ ہو۔ اس درمیان اکثر ایسا ہوتا جب وجیندر لیپ ٹاپ لے کر میرے سامنے ہی شروع ہوجاتا...... دنیا بھر کی پریوں کا رقص— چیٹنگ کرتے ہوئے اس کی تیز تیز چلتی انگلیاں...... وہ مجھے لگاتار ایک انوکھی دنیا کو جیتنے کے لیے پریکٹس کرارہا تھا......

اس دن وہ دیر سے آیا۔ لیکن اس سے پہلے ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ سلیکھا کسی مرد کے ساتھ آئی تھی۔ شام کے آٹھ بجے ہوں گے۔ میں صرف اتنا دیکھ سکا، دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے ہوئے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد وہ مرد باہر نکلا تھا— شاید سلیکھا اسے گیٹ تک چھوڑنے گئی تھی۔ واپس لوٹتے ہوئے میرے کمرے کے پاس آکر ٹھٹھکی وہ......

'اب طبیعت کیسی ہے تمہاری؟'

میں نے صرف چہرہ اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ ٹھہری نہیں۔ واپس لوٹ گئی— لیکن اس کے چہرے کی خوشی اس کے پورے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔

دوسرے دن صبح صبح فریش ہونے اور کپڑے بدلنے کے بعد وجیندر میرے پاس آ گیا۔

'سنو جیجو۔ میں ایک ہفتہ کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ یہ اپنی دوائیاں سمجھ لو۔ اور ہاں — اب تمہیں اپنا کیئر خود کرنا ہے — دیدی کھانا بھی نہیں دینے والی — گھر سے باہر نکلو تو ڈھیر سارے ڈھابے ہیں — پھل والے ہیں۔ جوس کی دکان ہے۔ زندگی قیمتی چیز ہے اور بہادری وہی ہے جو مرتے دم تک ہار نہیں مانے......

جاتے ہوئے وہ ٹھہرا...... اور ہاں۔ لیپ ٹاپ چھوڑے جا رہا ہوں۔ تمہیں اپنی آئی ڈی اور پاس ورڈ یاد ہے نا......

وجیندر کے جانے کے بعد بھیانک سناٹے کا احساس ہوا تھا — جیسے سلیکھا کے ہوتے ہوئے بھی ایک دم سے تنہا ہو گیا ہوں — کوئی بھی نہیں — زندگی کے راستوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دم تنہا...... دماغ میں ابھی بھی سنسناہٹ تھی۔ دکانیں کھلی تھیں...... باہر سڑکوں پر لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ گاڑیاں، ریہڑی والے — سجی ہوئی دکانیں — بہت دنوں بعد میں بغیر کسی سہارے کے اس حسین صبح کا احساس کر رہا تھا...... آنکھوں کو سورج کی روشنی چندھیا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سڑک پار کیا — کھانے کے لیے کچھ سامان خریدے اور گھر لوٹ آیا۔

یہاں ڈائری کے اوراق نہیں ہیں

زندگی کی اُن خاموش رضامندیوں کو، جہاں خود ہی ایک راستہ بن جاتا ہے — شاید میں نے بھی خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے ان نئے راستوں کو اپنی رضامندی دے دی تھی — آدمی کی اپنی ترقی کے راستے میں نہ لالچ ہے نہ بے حیائی — نہ تہذیب اور نہ ہی آگے بڑھنے کے راستے میں کوئی بھی شے کبھی رکاوٹ بنتی ہے — صرف ایک خاموش رضامندی — یہاں اس ڈائری کا خاتمہ ہوتا ہے، جو ایک ایسے انسان کے ذریعے لکھی گئی جو اپنی بیوی کے اُداس رویے سے ڈر کر — خود کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے ایکیوریم کی مردہ مچھلی کی طرح ہو گیا تھا — جسے ایکیوریم کے باسی پانی راس نہیں آئے تھے......

کامتا ناتھ کا کیا ہوا، اسے جاننے کے لیے آپ کو ذرا سا ٹھہرنا پڑے گا۔ یا پھر وجیندر کا

کیا ہوا؟ سلیکھا کیا اپنے نئے مکان میں چلی گئی؟ لیکن ان سب سے پہلے زندگی کے میں تیزی سے آنے والی تبدیلیوں کا سچ جاننا ضروری ہے— جہاں ہماری تہذیب میں صدیوں سے دبے ہوئے آتش فشاں کا دھماکہ ہوا تھا— آپ اسے اخلاقیات یا روایت کے ٹوٹنے سے مت جوڑیئے— یا یہ کہ سب کچھ اسی انداز سے چلتا رہا تو ہمارے اقدار کا کیا ہوگا؟ بس یہیں ہماری کہانی آپ کے صدیوں کے سنسکار سے لڑتی نظر آتی ہے— نیلے لیوائی جینس پہنے ہوئے وجیندر کو دیکھ لیجئے، جس کے لوبیس سے اس کے برانڈ انڈرویئر کو دیکھ کر اس کی گرل فرینڈ مسکرا سکتی ہے— اور اپنی گرل فرینڈ کی 'برا' کے بینگی اسٹریپ کو دیکھ کر وہ کہہ سکتا ہے— یس'ہم برانڈ کی دنیا میں وہ سب دکھانے میں جھجک محسوس نہیں کرتے جسے آپ صدیوں سے چھپاتے آئے تھے— وہ سیکس اور مسرت کی باتیں ایسے کر سکتے ہیں جیسے آپ بہاری کے دوہے اور غالب کی شاعری پر باتیں کر رہے ہوں— سیکس نئے ماحول میں اخلاقیات کی اپنی تعریفیں تیار کر رہا ہے، جہاں مرد عورت دونوں اپنا پورا ہوم ورک تیار کر کے ملتے ہیں— آرکڈیا کنڈوم کیسا ہو— ؟ سیکس کے بعد مارٹن لا کر دینا— یا پھر کمرے میں خوشبودار موم بتیوں سے ماحول بنانا— نہیں معلوم کہ کہانی کے ہیرو کامتا ناتھ نے اسے کس طور پر لیا— ڈائری کے آخری صفحات تک وہ اس پراسرار آلہ یعنی لیپ ٹاپ کے ذریعے، اس نئی تہذیب میں اپنی ذہنی تکلیف کے ساتھ داخل ہو گیا تھا— اور پھر جیسا کہ اس نے بتایا— دو دن لگے تھے اسے لیپ ٹاپ پر اپنی انگلیوں سے چھونے اور جگہ بنانے میں...... آہستہ آہستہ اندر تک تناؤ کم ہوا تھا— میسنجر کھولنے اور چیٹ روم جانے تک ایک دلچسپ ایکسپیرینس رہا— 50 سے زیادہ عمر کے آدمی کے ساتھ بھلا کون چیٹ کرنے کو تیار ہوتا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ تناؤ کم ہوتے ہی سوجھ بوجھ اور سازش کے جالے اپنا سر نکالنے لگے تھے...... جیسے اس نے میل بارن کی اس لڑکی کو اپنے بارے میں بتایا— میل 35 انڈیا۔ اور یہ کہ اس کے پاس کیم نہیں ہے۔

یہ وجیندر کے جانے کے بعد کی تیسری رات تھی...... کمرے میں نشلی بارش شروع ہو چکی تھی— وہ آدمی گم تھا، جو ابھی کچھ دن پہلے ڈارون کے بندر میں تبدیل ہو گیا تھا— یا پھر زمین پر بکھرے شیشے کے انگنت ٹکڑوں میں اپنا پاؤں شہید کر بیٹھا تھا...... دماغ کے جھنا کے بند تھے— لیپ ٹاپ اسکرین پر پریاں روشن تھیں...... ہاتھوں کی انگلیوں میں خون کی گردش بڑھ گئی،

تھی......

اس کے ٹھیک دوسرے دن تک اپنے ملک سے لے کر فلپائن تک کئی چیٹ فرینڈ بن چکی تھیں......اور جیسے اندر سے ایک مردہ روح نے پہلی بار ایکیوریم سے باہر آ کر اپنی زبان نکالی تھی۔

'وہ جینا چاہتا ہے۔'

اور جیسے اس دن، اس ہندوستانی عورت سے بات کرتے ہوئے وہ چونک گیا تھا — وہ ٹیچر تھی۔ عمر 37 سال۔ شادی نہیں کی تھی۔ وہ بتا رہی تھی۔

'تم نے اپنی عمر اوڑھ لی ہے — نکلو اس سے۔'

'لیکن کیسے......؟'

'کیونکہ عمر کوئی چیز نہیں ہوتی......'

'اگر میں کہوں کہ میں 52 کا ہوں......'

وہ ہنسی تھی......'تو تم ابھی نئے سرے سے جنم لے رہے ہو — اپنی عمر کو ریفریجریٹر میں ڈال کر باہر نکالو۔ کول......'

'زندگی اتنی کول بھی نہیں۔'

'ہے......لیکن پہلے عمر کو نکالو۔'

'یہ تمہارے ماضی میں نہیں بستی۔ ماضی میں صرف بھوت بستے ہیں — بھوت کو جسم سے جھاڑ دو — پھر اپنے جسم کو دیکھو۔ ایک نوجوان اپنی ساری توانائی اور آگ کے ساتھ جاگ رہا ہے تم میں۔'

پہلی بار، بہت دنوں بعد کاما تا ناتھ نے خود کو آئینے میں دیکھا......الجھے، سفید بال۔ بڑھی داڑھی......اور جسم کی جگہ......جیسے ایک بوسیدہ ڈھانچہ — اس ڈھانچے کو بدلنا تھا — وارڈ روب کھولا — لیوائس کی نیلی جینس نکالی۔ اس سے میچ کرتا، شرٹ — شیو کیا — جینس ٹی شرٹ پہن کر وہ ایک بار پھر آئینے کے سامنے تھا......

ٹھہریئے — ابھی اُسے، باہر نکلنا ہوگا — شاپنگ کرنی ہے۔ واپس آ کر دوبارہ لیپ

ٹاٹ پر بیٹھنا ہے۔ شالنی اور کیتھرین کو وقت دیا ہے اس نے۔

کہانی یہیں تک ہے۔

لیکن کہانی ختم نہیں ہوئی— کہانی ابھی جاری ہے— ممکن ہے آنے والے دنوں میں آپ مسٹر کامتاناتھ کو کسی کیتھرین، کسی ڈورتھی، مسز مہتہ یا مسز کھنہ کے گھر بھی دیکھ سکتے ہیں۔ یا ممکن ہے، وہ کسی کے ساتھ 'لیونگ ریلیشن شپ' کے مزے لے رہے ہوں— کچھ بھی ممکن ہے۔ وہ مسلسل خود پر توجہ دے رہے ہیں۔ بالوں میں کالی مہندی لگانا، مونچھوں کے بال رنگنا۔ صبح اٹھ کر جاگنگ کرنا۔

ایک دن وجیندر آ کر اپنا لیپ ٹاپ لے گیا— سلیکھا نئے گھر میں چلی گئی۔ جس وقت سلیکھا آخری بار ملنے آئی تھی، کامتاناتھ اس سوچ میں ڈوبے تھے کہ آرکڈ اور رجنی گندھا میں بہتر کون ہے—؟ اور کیا سر کے بالوں کو چھپانے کے لیے اُنہیں ایک اچھا سا ہیٹ لے لینا چاہیے—؟

اس لیے وہ پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھ سکے کہ جاتے وقت سلیکھا کی آنکھیں ذرا سی نم تھیں— شاید ماضی کے گھنے بادلوں کے ساتھ ایسے حادثے ہوتے رہتے ہیں— سلیکھا...... ذرا دیر کو ٹھہری— پھر نم آنکھوں کو پونچھنے کے بعد آگے بڑھ گئی......

اُنہیں پیچھے پلٹ کر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی—

●❖●

پارکنسن ڈزیز

''محبت / اپنی پوری آگ اور شدت سے /
زلزلہ کے تیز جھٹکے کی طرح ہلا دیتی ہے آپ کو اندر تک /
محبت اپنی تمام تر تمازت اور احساس کے ساتھ /
مسلسل آپ کو ہلاتی رہتی ہے......''

بوڑھا اور شرط

اس کمرے میں کھڑکی نہیں تھی۔ روشن دان نہیں تھا۔ کمرہ بند کرتے ہی ایرکنڈیشنڈ کی ٹھنڈک کے ساتھ بھیانک ڈپریشن کا بھوت، اچانک ہی شیشے کی چمچماتی زمین پر چلتے ہوئے اپنے پاؤں پھیلا لیتا تھا۔

'یو...... نو...... ہاءءہاءء'

وہ ہنس رہا تھا— وہ یعنی رمیش کالرا۔ 'میری ڈوانہ' کمپنی کے کال سینٹر میں اب اس کی حیثیت اور رتبہ میں اضافہ ہو چکا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک ایسی خوبصورت اُڑان تھی، جس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ اچانک کسی 'دانشور' میں تبدیل ہو جاتا تھا۔

•

'مین گیٹ، پھر برامدہ پار کرتے ہی وہ بوڑھا کمزور جسم دکھائی دے جاتا تھا۔ رمیش کے پرسنل کمرے میں داخل ہوتے ہوئے— وہیں جالی لگے دروازے کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا......
مگر وہ ہل رہا تھا...... نہیں، بادلوں میں پھنسے ہوائی جہاز میں بھی آپ ایسے نہیں ہلتے۔ سامنے کوئی

دشمن یا دہشت گرد اچانک آپ پر پسٹل یا بندوق تان دے تو...... تب بھی نہیں۔ شتابدی ایکسپریس کے پسینجر بھی ایسے نہیں ہلتے ہوں گے۔ سردی سے ٹھٹھرتی ویران راتوں میں، اور ذرا تھوڑی سی بارش ہو جائے تو...... تب بھی بے حد کم کپڑوں میں سمٹی ہوئی، بے چارگی اور مفلسی ایسے نہیں ہلتی آتی ہے، جیسے...... شاید اسی لیے رمیش کالرا کی ہر ہنسی مجھے وہیں لے جا رہی تھی — اُس ہلتے ہوئے بوڑھے کی طرف۔ جو آپ کی ہنسی' قہقہے سے بے نیاز صرف ہلے جا رہا تھا۔

'ہوءء، ہوءء' رمیش میری طرف مڑا — بوڑھے آدمی ہلنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اپنے لمبے تجربہ کی سڑک تک...... وہ سب کو اتنا ہلا چکے ہوتے ہیں کہ — ان کے پاس اس عمر میں پہنچنے کے بعد...... یونو...... صرف ہلنا ہی باقی رہ جاتا ہے......'

رمیش نے قہقہہ لگایا تھا۔ ایک زوردار قہقہہ۔ کسی پر جوش گھوڑے کی طرح ہنہناتے' ہلتے اس کے پورے وجود نے مجھے ایک ساتھ آج پیش آنے والے کتنے ہی واقعات کی یاد تازہ کر دی تھی۔

آج کا پورا دن ہی بوڑھوں کے نام تھا۔ جوان آدمی کے پاس اپنے سے زیادہ بوڑھی عمر کے قصے ہوتے ہیں — بوڑھوں میں ان کی کشش دراصل ان کے لیے ایک فکر اور چیلنج جیسی ہوتی ہے — دیکھو۔ تم بھی وہی ہونے جا رہے ہو۔ یعنی بس کچھ دنوں کے بعد۔ لاچاری کے پائیدان پر کھڑے۔ کچھ نوجوان اس 'دل دہلا' دینے والے قصے کو اس لیے بھی نہیں سننے کا بہانہ کر رہے ہوتے ہیں کہ وہ مستقبل کے سہمے ہوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بھی ڈر جاتے ہیں۔

رمیش نے پھر ٹھہاکہ لگایا — ''ہوءء ہوءء میرے جذباتی دوست۔ انہیں ٹھنڈک برداشت نہیں ہوتی۔ میرے بے حد جذباتی دوست...... اسی لیے وہ ہلتے رہتے ہیں۔''

''اوہ! یقینی طور پر میرے عزیز دوست۔ لیکن میں کہہ سکتا ہوں۔ ایک دن وہ اپنے اکیلے پن کی زندگی سے گھبرا کر اتنی زیادہ گرمی محسوس کریں گے...... کہ...... نہیں تم ہنس رہے ہو...... یقین کرو۔ میرے عزیز دوست۔ ان کا ہلنا بند ہو جائے گا......''

پہلی بار مجھے بھی اس بات کا احساس نہیں تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں یا جس جسم کو ابھی کچھ دیر پہلے میں نے یوں ہلتے ہوئے دیکھا تھا، اس کے بارے میں میرا یہ سوچنا — یقیناً رمیش کے لیے یہ ہنسنے والی بات تھی اور اس وقت وہ یہی کر رہا تھا۔

'ہوءء، ہوءء، یعنی تم بھی...... پورے مسخرے ہو یار...... وہ پیٹ پکڑ کر ہنس رہا تھا......

یعنی، آج بھی تم کسی کرشمہ یا جادو پر بھروسہ کرتے ہو؟

ہر عمل کا اس کے برابر اور برخلاف ایک ردِّ عمل ہوتا ہے — اس لیے کرشمہ تو ہوا تھا لیکن اس کرشمہ کا رنگ روپ مختلف تھا۔

جھوٹ کی سلطنت

بولتے ہوئے اس کی ناک ذرا سا سکڑ جاتی تھی۔ منہ سے ادا کیے جانے والے مکمل جملوں کے دوران تھوڑے سے لفظ اس کی سانسوں کے نام ہو جاتے تھے۔ آگے کے بال تیزی سے اڑنا شروع ہو گئے تھے۔ رمیش کالرا کی زندگی کے بہت سے موڑ ایسے تھے، جسے شاید صرف میں جانتا تھا۔ ذہین، مگر ذہانت کا غلط استعمال کرنے والا، پر وقار، اڑنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکنے میں کوئی جھجک نہیں۔ اس لیے جھوٹ اس کے لیے ایک مضبوط ہتھیار کے طور پر رہا۔ یعنی ایسے لوگوں میں آپ اس کا شمار کر سکتے ہیں، جو جھوٹ کو اپنے مستقبل کے منصوبوں کے طور پر بھی لیتے ہیں — رمیش کی شادی دلچسپ حالات میں ہوئی۔ بیوی ہائی فائی گھر کی تھی۔ ان دنوں رمیش کے جھوٹ بولنے کے دلچسپ سلسلے کا آغاز ہو چکا تھا۔ بچپن سے اس کے شاہانہ مزاج نے اسے بتایا تھا — اڑنا ہے تو گلا کاٹنا سیکھو۔ سیاسی نیتاؤں کے گھر کے چکر — کسی کو کام دلا کر کچھ پیسہ بنا لینا — پھر ڈسکو تھے۔ فائیو اسٹار ہوٹل لابی میں بے وجہ جا بیٹھنا۔ تھوڑی سی ہیرا پھیری نے سیکنڈ ہینڈ کار بھی دلوا دی — ایک خوبصورت سی ٹاٹا سفاری اسے کوڑیوں کے مول مل گئی۔ ہوا یوں کہ یہ سفاری ایک ڈاکٹر کی تھی۔ اور ڈاکٹر کے بندے کا ایک پھنسا کام ہمارے رمیش کالرا نے اپنی وزیر تک پہنچ کے حساب سے کرا دیا تھا۔ ٹاٹا سفاری کا ایکسیڈنٹ ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اسے منحوس سمجھ کر دوسری لینے کا فیصلہ کیا۔ اور اس طرح کوڑیوں کے مول یہ گاڑی رمیش کالرا کے پاس آ گئی۔ اور یہیں فائیو اسٹار ہوٹل میرانڈا کی لابی میں اچانک اس کی ملاقات مسکان سے ہوئی تھی — اسکرٹ، سلیولیس، بے بی شرٹ جس سے اس کا آدھا پیٹ نظر آ رہا تھا۔ سوالوں کا تبادلہ ہوا — رمیش نے دھیرے سے کہا — آئی اے ایس کا امتحان دیا ہے...... بس گوٹی فٹ تھی۔ تیر سیدھے نشانہ پر لگا تھا —

کپڑوں کی سمجھ بوجھ اچھی تھی۔ یہ لگاتار فائیو اسٹارس ہوٹل میں جانے کی وجہ سے ہوا، یا جو بھی وجہ ہو، مگر اچھی اسٹائلش انگلش اور اچھے پہناوے سے یہ یقین کرنا مشکل کہ بار بار ناک

سکوڑنے والا کالرا بھی آئی اے ایس بننے کا خواب دیکھ سکتا ہے۔

شاید یہی مسکان کے، کالرا سے قریب آنے کی کہانی تھی۔ اس کہانی میں آگے بھی بہت کچھ شامل رہا۔ جیسے مسکان کے بزنس مین والد سے ملاقات۔ ان کا دل جیتنا، ٹاٹا سفاری کی شاندار سواری— اور کالرا کا مخصوص اسٹائلش انداز۔

کہیں ایک بوڑھے اور لاغر جسم میں پرانی اور ختم ہوتی ہوئی تہذیب کے آثار باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ اخلاقیات کی پرانی نشانیاں کالرا کے باپ میں زندہ تھیں۔ وہ پرانے زمانے کے تھے۔ پرانے انداز سے سوچتے تھے۔ اس لیے اُن کے وجود میں یہ نشانیاں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی زندہ تھیں— دو کمرے والے ایک پرانے گھر میں رہنے والا رنویر کالرا' رمیش کے لیے ایک بوجھ یا دھبّے سے زیادہ نہیں تھا— بس، پیدا کرنے کے جرم نے اس ہونی یا 'کباڑ' کو تسلیم کرلیا تھا— ماں کا انتقال ہو چکا تھا۔ دو بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ شادی کے لیے ایک اچھے گھر کا بندوبست بھی کرنا تھا۔ بینک سے ایک بڑی لون پوری پلاننگ کے طور پر رمیش نے سینکشن کرا لیا— کہ بزنس مین کی سونا دینے والی مرغی کے آتے ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور یہی وہ وقت تھا، جب مکمل سورج گرہن لگا تھا— اور یہی وہ وقت تھا جب خاموش خاموش بیٹے کی حرکتوں کو دیکھتے سمجھتے، اس سے گالیاں کھانے والا باپ رنویر کالرا ہلنے لگا تھا— جیسے گھوڑے ہلتے ہیں۔ شاید یہ برسوں سے اندر دبی ہوئی خاموش چنگاریوں کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک ایسے مرض میں مبتلا ہو گئے— جوان کے خاندان یا ان کے آباء واجداد میں کسی کو نہیں تھا۔

بینک سے لون مل جانے کے فوراً بعد پریت وہار میں کالرا نے ایک کوٹھی بھی خرید لی اور اس کوٹھی کی بھی الگ کہانی تھی— یہ کوٹھی ایک بیوہ کی تھی، جس کے بیٹے غیر ملک میں آباد ہو گئے تھے۔ رمیش کے مسلسل آنے جانے اور چھوٹے موٹے کام کر دینے سے بیوہ پر رمیش کا جادو چل گیا تھا۔ بیوہ کو پریت وہار کی اپنی کوٹھی چھوڑ کر' روہنی کے چھوٹے سے گھر میں جانا تھا، جہاں اس کی ایک منہ بولی بیٹی رہتی تھی— اور یہیں سے دو مہینے بعد اُسے غیر ملک بیٹے کے پاس چلے جانا تھا۔ کوٹھی کی قیمت طے ہوئی۔ دو قسطوں میں پیسے ادائیگی کی بات ہوئی۔ ساری لکھا پڑھی کرتے ہوئے رمیش نے صاف بتا دیا کہ کوٹھی اپنے نام رجسٹری کرانے کی منشا صرف اتنی ہے کہ کل کو ادائیگی کے لیے جواب دہ وہی رہے۔ آدھی کہانی یہ ہے کہ بیوہ کو یہ ملک چھوڑنے تک آدھی ادائیگی نہیں ہو سکی— اور وہ رمیش کے نام ایک چھوٹا سا مقدمہ دائر کر گئی۔ لیکن ایسے کتنے ہی مقدمے اس کے نام چلے بھی

بند بھی ہو گئے۔

مسکان گھر آئی تو جیسے ایک کے بعد ایک دھماکے ہوتے گئے — لیکن رمیش کی اپنی دنیا میں اس کے آنے کے باوجود کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی — مثلاً مسکان نے پوچھا —

''تم آئی ایس کی تیاری نہیں کر رہے تھے —؟''

''نہیں۔''

''کیوں بولا جھوٹ؟''

''تم کو امپریس کرنے کے لیے۔''

کوٹھی کے ایک کمرے میں وہ بوڑھی جھریوں والا آچکا تھا — جس کے علاج پر پیسے خرچ کرنے کا خیال رمیش کے لیے ایسا ہی تھا، جیسے ریس کورس میں کسی مرے گھوڑے پر داؤ لگانے کا خیال —

مسکان کئی دنوں تک روتی رہی۔ بزنس مین باپ نے سمجھایا — اور اس طرح ساجھے میں ایک کال سینٹر میری ڈوانا کمپنی کی باگ ڈور اس کے ہاتھوں میں آگئی — اور یہ وہی وقت تھا، جب وہ اپنے حسین خوابوں کا جوا کھیلنے کے بعد شاید اپنے آپ میں خود ایک خواب بن گیا تھا — جذبات، محبت، اصول، رشتوں سے دور اس کے لیے سب کچھ پیسہ تھا۔ پیسوں کی ریس میں کسی بھی حد تک آگے نکلنے تک اس نے اپنے سارے دروازے کھلے رکھے تھے —

اور ان سے الگ، گھر میں اس بوڑھے اور لاغر جسم کی موجودگی تھی — جو سارا دن کرسی پر بیٹھا ہلتا رہتا تھا — اور میرے لیے اگر کہیں کوئی حیران کر دینے والی شئے تھی، تو بس بوڑھے رنویر کالرا کا مسلسل ہلتا ہوا جسم — جھریوں بھرے چہرے کے گوشت ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ آنکھوں سے عینک ہٹ گئی تھی۔ کرتا یا پانجامہ ڈھیلا ڈھالا — ایسا لگتا جیسے کسی 'بجوکا' کو کپڑے پہنا دیئے گئے ہوں — بے حرکت لنج پنج ہاتھ...... آنکھیں کہاں دیکھتی ہیں اور کہاں نہیں، تب یہ سب طے کر پانا مشکل تھا — لیکن کیا وقت کے ساتھ اس جسم میں کسی تبدیلی یا کرشمے کی کوئی امید کی جا سکتی تھی — شاید نہیں۔ اسی لیے اس چھٹی والے دن رمیش کے گھر آنے کے بعد میں پھر اس کمرے میں گیا، جہاں رنویر نامی 'بجوکے' کو کرسی پر ہلنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا — کافی دیر تک اُسے غور سے دیکھنے کے بعد میں تھوڑا فکر مند اور غصے کی حالت میں تھا۔

'ہاں، ہلو، ہل سکتے ہو تم۔ اس لیے کہ پورا ملک اس وقت ہل رہا ہے۔ جتنا ہل رہی

ہے۔ سرکار ہل رہی ہے، سیاست ہل رہی ہے، لوک سبھا سے سڑک تک سب کچھ ہل رہا ہے۔ اور جان لو تمہاری ان کمزور بنیادوں کو ہلانے کے لیے اب کسی زلزلہ یا سانحہ کی ضرورت نہیں — اس لیے کہ ملک سے انسان اور سماج سے سیاست، مذہب سے حکومت، تہذیب تک کوئی بھی چیز جامد نہیں — نہیں۔ سب ہلے جا رہی ہے۔'

'کوئی کرشمہ ہوا — ؟ ہوءء ہو......' میری ڈوانا کمپنی کا مالک اب میرے سامنے تھا — 'سنو ساتھی۔ کرشمہ صرف یہاں ہوتا ہے — وہ اپنے دماغ کی طرف اشارہ کر رہا تھا — اور ایک بار پھر یہ بتانے کو بے چین تھا کہ اب وہ میری ڈوانہ کمپنی کا ساجھیدار نہیں، بلکہ مالک بن چکا ہے — تھوڑی سی رشوت، تھوڑا سا جھوٹ، تھوڑی سی جعلسازی، اور ایک بار پھر مسکان کے بزنس مین باپ کو گہری شکست دینے کے بعد — اب اس کے تیور بدل گئے تھے۔ اس کا پرانا ساجھیدار یا پارٹنر مسکان کے باپ کا دوست تھا — اور یہ پارٹنر شپ اس نے مسکان کے والد کے کہنے پر ہی قبول کی تھی — مگر بقول رمیش کالرا...... ایک ایک کر کے آپ کو اپنی حفاظت دینے والی ساری اینٹیں ہٹانی پڑتی ہیں......

'اس سے تو آپ گر جائیں گے...... مطلب آپ خطرہ کے اندر ہوں گے۔'

'نہیں نا......' وہ ہنس رہا تھا۔ خود مختار۔ اپنی مرضی کا مالک — حفاظت کی ساری اینٹوں کے ڈھہتے ہی آپ ہوشیار اور اپنی حفاظت کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ کسی پر بھروسہ نہیں۔'

وہ کسی فلاسفر کے انداز میں کھڑکی کی طرف دیکھتا ہوا کہہ رہا تھا — 'وقت کے ساتھ خواب، محنت اور جدوجہد کے انداز بدل گئے۔ اس لیے کامیابی کی چابی کے لیے زمین بھی بدلنی پڑی — بدلتے ہوئے بازار کو دیکھنا پڑا اور اس کی تائید میں کھڑے ہونے کے لیے تھوڑا سا خود غرض بننا پڑا — دراصل یہ سب کچھ نیا نہیں ہے میرے دوست۔ دوسروں سے کچھ الگ ہٹ کر جینا، جیسا کہ میں چاہتا تھا — چاہتا ہوں، ہمیشہ سے — وہ دھیرے سے بولا۔ اس نئی عالم کاری تہذیب میں ہمیں اپنا جغرافیہ اور تاریخ اپنی صلاحیت کے مطابق ہی لکھنا پڑتا ہے نا — اس لیے ایثار سے تیاگ اور تپسیا سے آدرش تک...... سب اپنے لیے ہی محدود — '

وہ آہستہ سے کھکھارا — لیکن تھوڑی سی خود غرضی کا حصہ رکھ چھوڑا ہے — ہندوستانی ہوں نا۔ اُس اکیلے پن کی خاموش وادیوں میں رکھی اُس کرسی کے لیے جس پر تمہارا کرشمہ ہل رہا ہے — ایک دن ہلنا بند — اور کرسی کسی دوسرے کمرے میں رکھ دی جائے گی۔ اُس دن خود غرضی

کی کہانی کا یہ باب بھی اپنی تکمیل کو پہنچ جائے گا—

یہ ایک بھیانک سچ تھا۔ اور شاید اسی لیے میں اس نظام کے اس نا قابل فراموش لمحے سے کوئی امید لگائے بیٹھا تھا کہ اس بوڑھے کا ہلنا بند ہو— کیونکہ ایک بھی آدمی بدلتا ہے' کے پرانے سڑے ہوئے مارکسی اصولوں پر چلنے کی عادت نے اچانک ہی ہم دونوں کے درمیان ہونے والے مکالمہ کو ایک معنی خیز یا بیکار شرط میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور ہر بار رمیش اپنے ہونے کی بے رحم حقیقت کے ساتھ، وقت، تاریخ اور تہذیب کی چڈی چڈی کرنے میں مصروف ہو جاتا— میرے راستے مختلف تھے۔ شاید اسی لیے اس کے اندر لگاتار چلنے والی تبدیلیوں کو میں ایک بھیانک تہذیبی سانحہ کے طور پر دیکھنے کے لیے مجبور تھا۔ دنیا کے نئے سوفٹ ویئر، آوٹ سورسنگ، مال، ریلیٹی شوز، پھیلتے ہوئے شہروں کے درمیان شاید ہم کسی قدیم عہد کے ڈائنا سور میں تبدیل ہو چکے تھے اور رمیش مزاجاً بازار اور اس کے نظام کے ساتھ چلتا ہوا صرف اپنا سفر طے کر رہا تھا۔

لیکن یہاں ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا تھا۔ میری ڈوانا کمپنی سے کھٹنہ کا بوریا بستر ہٹانے کے فوراً بعد وہاں شلپی نے ایک ڈائرکٹر کے طور پر اپنا چارج سنبھالا تھا، اور مجھے ایک نئی تبدیلی کے اشارے مل گئے تھے۔ پھر جو خبریں اڑتی اڑتی مجھ تک پہنچی تھیں اس میں خوشبو، بارش، تتلی اور عیاری سب کے تھوڑے تھوڑے حصے موجود تھے— مجھے معلوم ہو گیا تھا، شلپی نے ہمارے اس جھوٹوں کے شہنشاہ کو اپنے مایا جال میں جکڑ لیا ہے۔ شاید اپنے ہی حالات سے لڑتے لڑتے یا جدو جہد کرتے ہوئے ہم ایک عورت کے جسم کے آگے ہتھیار ڈالنے کو مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور زندگی میں ہونے والے حادثے، بہت سی الجھی بکھری کہانیوں کو صرف ایک عورت کی موجودگی سلجھانے کی وجہ بن جاتی ہے۔

بوڑھے کی جگہ

مجھے یقین نہیں تھا کہ اس واقعے کے کچھ ہی مہینوں بعد، مجھے ایسے 'غضبناک' حالات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے— رمیش نے مجھے بلایا تھا۔ لیکن وہ آواز کسی کسی سپر ہیرو یا کسی چٹان کی طرح مضبوط شخص کی یا مہانا یک نہیں تھی۔ مجھے اس آواز میں ایک ہارے ہوئے مرد کا چہرہ بھی نظر آیا تھا۔ بہر حال، یہ کچھ مہینوں بعد ہی رمیش سے میری دوسری یا تیسری میٹنگ تھی، مگر وہ اپنے اسی کمرے میں، پتہ نہیں، کیوں مجھے برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا— جب کہ وہ خود کو نارمل دکھانے کی

تیاری تو شروع میں کرتا رہا، لیکن جلد ہی ٹوٹنے بھی لگا۔

اس کمرے میں کھڑکی نہیں تھی۔ روشن دان نہیں تھا۔ کمرہ بند کرتے ہی ایئر کنڈیشنڈ کی ٹھنڈک نے اچانک ہی میرے اندر پاؤں پھیلانے شروع کر دیئے تھے۔ رمیش کرسی پر بیٹھا تھا۔ ہونٹوں پر سگریٹ — کسی گہری سوچ میں ڈوبا......

'یونوءءء ہوءءءء ہو...... ' آج ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ لفظ کسی تنگ گلی میں گم تھے۔

'سنا' مسکان تمہیں چھوڑ رہی ہے......'

اس نے پلٹ کر دیکھا— 'شادی کے دو سال ہو گئے جس دن سے آئی، اسی دن سے چھوڑ رہی ہے......'

'وہ چاہتی کیا ہے؟'

'سمپل۔ طلاق چاہتی ہے۔ سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق ذہنی اذیت طلاق کے لیے آج ایک معمولی بہانہ بن چکا ہے۔ جس کے پیش نظر کوئی بھی عورت کسی بھی مرد سے طلاق لے سکتی ہے— رمیش کے لفظ دھماکہ خیز تھے...... لیکن وہ ابھی تک تو ایسا نہیں کر پائی......

'دو سال زیادہ مدت تو نہیں ہوتی۔'

'ہاں۔'

'تمہیں نہیں لگتا، اپنی اڑان میں تم نے اپنی ہی زندگی اور گھر بار داؤ پر لگا دیا۔'

'مجھے کبھی ایسا نہیں لگا— ' رمیش نے ایشٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑی— سب کو اڑنے کا حق ہے۔ آخر سیاست کیا ہے؟ ایک دوسرے کو دھکا دینے کی منشا۔ جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کے ساتھ کیا کیا؟ اور سنجے گاندھی کا ہیلی کاپٹر سے ہونے والا حادثہ — لوگوں نے اسے اندرا جی کے ساتھ جوڑا تھا یا نہیں۔ سیاست کے لیے اورنگ زیب نے باپ کو قید کر لیا اور اپنے ہی بھائیوں کا قتل کر ڈالا۔ سمراٹ اشوک نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا کیا؟ میں نے کسی کا قتل تو نہیں کیا......

'سیاست اور گھر میں فرق ہے......'

'کوئی فرق نہیں۔ گھر ہو سماج، سب کی اپنی اپنی سیاست ہوتی ہے......'

'کیا شلپی بھی اسی سیاست کا حصہ ہے۔'

اچانک جیسے اس کے اندر دھماکہ ہوا تھا۔ اس نے بجھی سگریٹ ایشٹرے میں ڈال دیا۔

اس کے چہرے میں بھیانک تبدیلی آئی تھی۔ وہ اٹھا اور کھڑکی کی جانب بڑھ گیا۔ ایرکنڈیشنڈ بند کیا۔ کھڑکی کھولی۔ جیسے حبس اور گھٹن سے نجات چاہتا ہو۔ سامنے ہی کرسی پر وہ لاغر جسم موجود تھا۔ ویسے ہی ہلتا ہوا — لیکن شلپی کے نام پر آج میں نے ہلنے کی پہلی لہر کالرا میں دیکھی تھی۔ کچھ بھیانک ہوا تھا۔ شاید جس کا اُسے احساس نہیں تھا — یا جسے وہ بتانا نہیں چاہتا تھا...... وہ دوبارہ واپس آیا تو اچانک جیسے بہت کچھ اس کے اندر گذر چکا تھا — وہ کسی چھوٹے بچے کی طرح کرسی پر بیٹھا پھوٹ کر رو رہا تھا۔

اور قارئین شاید یہی وہ منظر تھا، جس کے لیے یہ کہانی پیدا ہوئی تھی...... ایک پاگل کر دینے والا سنسنی خیز منظر — کالرا اور آنسو — ہزاروں کی آنکھوں میں بے رحمی کے آنسو رکھنے والا کالرا کسی واقعہ یا حادثے سے اتنا بھی لہولہان ہو سکتا ہے کہ رو پڑے، میرے لیے شاید ایسا سوچنا، بھی ناممکن تھا — لیکن ایسا ہوا تھا...... وہ رو رہا تھا...... اس کے آنسو آنکھوں سے ڈھلکتے ہوئے اس کے رخسار کو تر کر گئے تھے — میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ رولو...... تمہیں رولینا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں۔ خود کو ہلکا کرنے کا حق ہے تمہیں۔ میری موجودگی اگر تمہیں پریشان کر رہی ہے تو میں بعد میں بھی......'

ایک جھٹکے سے رمیش نے میرا ہاتھ تھام لیا — نہیں رکو — تم کہیں نہیں جاؤ گے...... کیونکہ اب جو میں بتانے والا ہوں، وہ شاید کسی کو نہ بتا پاؤں۔'

وہ اپنی آنکھیں خشک کر رہا تھا، جیسے خود کو یا بکھری کہانیوں کو جوڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

●

'لیکن یہ کہانی شروع کیسے کروں۔ کیا کوئی یقین کر پائے گا۔'

رمیش کالرا کی پیشانی پر پسینے کے قطرے اکٹھے ہو گئے تھے — دنیا کی ساری کہانیاں محبت سے شروع ہوتی ہیں اور محبت پر ختم — دنیا کا دراصل اپنا کوئی فلسفہ بھی نہیں ہے۔ محبت ہی فلسفہ ہے۔ کیوں کہ محبت فاتح عالم ہے اور کیا کوئی یقین کرے گا، میرے جیسا آدمی، جسے آپ پتھر، مورت یا کوئی بھی نام دیں وہ کم ہی ہوگا۔ لیکن میرے اندر بھی — اور یہاں برائے مہربانی یہ بھی سن لیجئے کہ مسکان میرا پیار نہیں تھی — اور شاید زندگی کے ان بدنصیب لمحوں میں وہ میری شریک حیات کم۔ ایک بزنس مین کی بیٹی زیادہ رہی۔

رمیش نے رومال سے پسینہ پونچھا— 'بچپن میں کہانیاں بھی پڑھی تھیں۔ موپاساں، چیخوف، او ہینری جیسے تخلیق کاروں کو پڑھتے ہوئے اچانک' چونکا دینے والے مناظر میں یقین کرنا مشکل ہو جاتا کہ ایسا بھی ہوتا ہے— یا ہو سکتا ہے۔ یا پھر وہ...... کیا بھلا سا نام ہے۔ ہاں، اسٹفن زوگ۔ ایک عورت کی زندگی کے 24 گھنٹے۔ یہ 24 گھنٹے اس عورت نے ایک ایسے عاشق کو دیئے جو عاشق بننے کے قابل نہیں تھا۔ سوچتا ہوں، کیا زوگ نے یہ کہانی میرے لیے لکھی تھی۔'

وہ ایک دم سے اچانک آئی— میرے کیبن میں۔ صبح کے گیارہ بج رہے ہوں گے۔ نہیں میں اس پورے لمحے کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں۔ شاید ایسا، پہلے کا رمیش کالرا نہیں کر سکتا تھا— کیونکہ وہ اپنے ساتھ محبت کا خمار اور نشہ لے کر آئی تھی۔ جینس نیلے رنگ کی، جس میں بہت سے گل بوٹے جھول رہے تھے— اس کی سفید خوبصورت سینڈل تک پچ کرتے ہوئے— جینس کے اوپر سفید ٹی شرٹ— یہ وہی وقت تھا، جب کمرے میں داخل ہوتے ہوئے میری صبح کی چائے لانے والے چپراسی کو جھٹکا لگا تھا— میرے کمرے میں، گملے میں رکھے' نیلامبر' بونسائی کا پہلا پھول کھلا تھا— اور گیارہ کی گھنٹی مارنے کے ساتھ ہی دیوار گھڑی کی بیٹری بیٹھ گئی تھی— تم سمجھ رہے ہونا، وہ آئی اور اپنے ساتھ وقت کو بھی فریز کر دیا۔

'نہیں— میں خالی ہاتھ' نہیں جانا چاہتی۔ یوں بھی میں صرف جیتنے کے لیے دنیا میں آئی ہوں......' اپنی تمام تر مضبوطی اور اپنے دیوانہ بنا دینے والے حسن سے واقف دوشیزہ نے اپنا رزیوم آگے کیا— برائے مہربانی دیکھ لیں۔ لیکن کیا آپ کو نہیں لگتا کہ میں آپ کے اس کال سینٹر کو ایک نئی زندگی دے سکتی ہوں۔

وہ پیچھے ہٹی— 'سر دیکھئے مجھے۔ میرا تجربہ صرف اس کورے کاغذ پر نہیں لکھا— یہاں بھی لکھا ہے۔ میری آنکھوں میں۔ میرے جسم میں۔'

یہ سب کچھ انوکھا تھا— جیسے کوئی فنتاسی حادثہ ہو رہا ہو— میرے جیسا شخص، جو بزنس میں صرف' ریوڈ' یا بھدی' زبان ہی بولنا جانتا تھا— یا جسے خود پسندی میں ڈوبے فخریہ کلمات بھی پسند نہیں آتے...... مگر میں کیا کرتا۔ میں اس کے چکا چوند حسن کے آگے سرنگوں تھا۔ یا پھر یوں کہنا چاہئے۔ میں شاید اندر ہی اندر پگھل رہا تھا یا کانپ رہا تھا......

شلپی زندگی میں آئی تو جیسے وہ سب کچھ ہونے لگا، جو اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ جیسے

ایک تاروں بھری رات۔ باہر بالکنی میں، چاند دیکھتے ہوئے میں مدہوشی میں ڈوبا ہوا کوئی فلمی گانا گنگنانے لگا— جیسے اس رات مسکان کے لیے میرے اندر شاید پہلی بار ایک شوہر یا محبوب نے جنم لیا— وہ میرے محبت بنتے ہاتھوں کا لمس سمجھ گئی تھی— یا یہ چھٹی حس دنیا کی تمام عورتوں کے اندر ہوتی ہے کہ وہ مرد کے ہاتھوں میں پرائے پیار کی خوشبو کو پہچان جاتی ہیں۔ مسکان نے میرے ہاتھوں کو بے رحمی سے جھٹک دیا تھا—

'ہٹو— ان ہاتھوں میں کسی اور کا احساس ہے— تمہاری ہتھیلیوں کی جلد میں کوئی اور ہے، جو محبت بننے کی تیاری کر رہی ہے..... سنو۔ یہ میں نہیں ہوں رمیش کالرا۔'

مسکان دوسری طرف کروٹ بدل کر لیٹ گئی تو اچانک احساس ہوا، صرف میرے ہاتھ یا میری ہتھیلیاں نہیں، بلکہ میرے پورے جسم پر شلپی آہستہ آہستہ پھسلنے لگی ہو— اس رات میں نے خود سے سونے سے پہلے کہا تھا— تم ایک شاعر بن جاؤ گے کالرا، تو ناکام ہو جاؤ گے— تمہاری ترقی یا کامیابی کا سارا دارومدار ہی بے ایمانی، جھوٹ اور وہاں ہے— جہاں محبت کا کوئی راستہ نہیں جاتا— مگر اس دن کیبن کے اس کمرے میں— شاید یہ میرے ہی سوچے سمجھے منصوبے کا ایک حصہ تھا۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا— رمیش اچانک رکا— کیا محبت آپ کو دوستو وسکی کے ایڈیٹ یا رڈوکلس مین میں تبدیل کر دیتا ہے— یا جیسا زوگ کی اس کہانی میں ہوا— اس شادی شدہ دوشیزہ کے ایک نوجوان شخص کے ساتھ بھاگ جانے پر— کیا یہ بات نفرت کے قابل نہیں کہ کوئی عورت کسی اجنبی کے ساتھ بھاگ جائے، جبکہ اس کا شوہر اس کے بچے بھی ہیں— مسکان کے رہتے شلپی کا خیال— لیکن شاید میرا دل اس محبت کی خاموش اجازت دے چکا تھا—

کیونکہ یہ بچپن سے آج تک کے سفر میں پہلی ایسی کوشش تھی۔ جسے میں بغیر غرض، محبت کی حد تک آدمی بنتے ہوئے نہار رہا تھا—

میں بس ایک ٹک رمیش کالرا کو دیکھے جا رہا تھا— نہیں۔ ممکن ہی نہیں کہ یہ شخص رومانس بھی کر سکے— بازار کی نئی تہذیب نے سیکس کے معنے بدلے ہیں شاید— سیکس اندر ہی اندر رومانس کے کاکٹیل سے جڑ گیا ہے— اور اس وقت یہی کاکٹیل رمیش کے چہرے سے جھلک رہا تھا۔ اس نے گہری سانس لی۔ پھر کہنا شروع کیا۔

'آفس میں ایک میرا اپنا پرائیویٹ کیبن ہے۔ سب کچھ میرے منصوبے کے مطابق ہوا

تھا۔ ورلڈ اسپیس ریڈیو پر خوبصورت مگر سنسنی خیز گیت گونج رہا تھا۔ کمرے کو خوشبو دار بنانے کے لیے میں نے اسپرے بھی کیا تھا۔ دس بجے تک سارا اسٹاف آجاتا ہے۔ مجھے انتظار تھا تو شلپی کا۔ شاید میں نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ اور یقین تھا، کھلے دماغوں والی شلپی کے لیے شاید کچھ بھی قابل اعتراض نہ ہوگا۔ وہ کمرے میں آئی تو، خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی جیسے وہ میرے اندر تک جھانکنے میں کامیاب ہوگئی تھی۔ ایک دم سے سامنے آکر تن گئی — '

''میں سوالوں کو ربر کی طرح کھینچنے میں یقین نہیں رکھتی۔ مجھے پانا چاہتے ہو؟ اس نے رمیش کے ہاتھوں کو تھاما...... 'تو کھولو مجھے......' شلپی کا وجود مونالزا کی طرح ہو رہا تھا، شاید جس کی انوکھی مسکراہٹ کو اس کا خالق بھی نہیں سمجھ سکا ہوگا۔

کپڑے کھل گئے تھے...... لیکن شلپی میں ویسی ہی بے نیازی بھری تھی...... وہ اپنے ننگے جسم کے ساتھ جیسے اس کے سامنے کھڑی اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی — 'عورت کا بدن ساز ہے۔ لیکن ہر مرد اس ساز کو بجانے کا ہنر نہیں جانتا — بتا سکتے ہو میرے جسم میں سب سے زیادہ آگ کہاں ہے —؟ یہاں......؟ اس نے مصفیٰ سینہ کے پاس اشارہ کیا۔ یہاں......؟ یہاں......؟ یہاں —؟ اس کے ہاتھ...... آہستہ آہستہ ہونٹ اور بدن کے دوسرے نازک حصے سے ہوتے ہوئے کان کی لووں کے پاس آکر ٹھہر گئے — یہاں...... اپنے ہونٹ لاؤ۔ ساری — اس وقت آپ کو سر نہیں کہہ سکتی — کھڑکی کے پاس ایک آرپار دیکھنے والا شفاف شیشہ لگا تھا، جس سے آگے کی دنیا تو دیکھی جاسکتی تھی، مگر باہر سے اندر کی دنیا کو دیکھ پانا مشکل۔ باہر ایک قطار سے ملٹی، اسکائی اسکیپر بلڈنگس کو دیکھتے ہوئے یکایک وہ پلٹی — گدھ، مائی گاڈ۔ سامنے والی بلڈنگس پر گدھ —

میرے اندر کا آتش فشاں ایک دم سے برف میں تبدیل تھا۔ اس نے کپڑے پہن لیے —

'ساری سر...... آپ سمجھ سکتے ہیں نا۔ صبح گیارہ بجے۔ آپ کی کھڑکی کے ٹھیک سامنے والی بلڈنگ پر گدھ — بچپن سے میں گدھوں کو نہیں دیکھ سکتی......' کپڑے پہن کر وہ کمرے سے باہر تھی۔ جب میں تھوڑے وقفہ بعد خود کو اس دھماکہ خیز حالت سے معمول پر لانے میں کامیاب ہوا تو وہ کیبن میں فائلوں میں سر دیئے بیٹھی تھی......

رمیش کالرا نے ٹھنڈی سانس بھری — ممکن ہے یہ اس کی طرف سے میرے لیے ایک اذیت سے پُر کارروائی ہو، جس نے مجھے ایک ذہنی اور جسمانی تکلیف پہنچائی تھی۔

وہ کھڑکی کی جانب بڑھا — وہ میرے اندر اس لمحہ اپنا سارا بولتا حسن اور اپنے ہونے کا نشہ چھوڑ گئی تھی۔ یہ آگ آگے آنے والے لمحوں میں نہ صرف بے حد غضبناک ہوتی جا رہی تھی، بلکہ مجھے ذہنی تناؤ بھی دینے لگی تھی۔ وہ ہر وقت اپنی تمام تر خوبصورتی اور حسن کے ساتھ میرے ذہنی تناؤ کو مسلسل بڑھا رہی تھی — کبھی سوچتا، وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہی ہے یا...... سچ مچ وہ بالکل بے نیاز ہے — جیسے وہ جسمانی سطح پر ایک ہی وقت وائلڈ بھی ہے اور برف بھی — شاید اپنے غیض و غضب میں وہ مجھے مسلسل نامرد بنا رہی تھی۔ کیونکہ ہر بار اس کے قریب ہونے کے باوجود...... میں اسے ہمبستری کی دعوت نہیں دے سکتا تھا۔ پتہ نہیں یہ بے بسی تھی، یا ایک انجانے گدھ کی آمد کا حادثہ — اب مجھے اپنے گھر کے باہر بھی گدھ دکھائی دینے لگے تھے اور اس دن......

رمیش کالرا نے کھڑکی بند کر دی — اس رات بھی وہی انتشار مجھ پر حاوی تھا۔ مسکان چیخ رہی تھی...... 'آج دفتر گئی تھی۔ کھنہ انکل کو الگ کرنے کے بعد پتہ ہے، تمہارا دفتر مسلسل خسارہ دکھا رہا ہے۔ اور تم...... تمہارے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ اب تم کام کے لیے بالکل بھی سیریس نہیں ہو۔ ریمیمبر۔ وہ تمہارا دفتر ہے، تو میرا بھی ہے......'

مسکان ٹھہر گئی تھی۔ لیکن پتہ نہیں، میں کب تک زور زور سے چیختا رہا۔ اور کیا کیا بولتا رہا۔ مجھے خود خبر نہیں۔ لیکن ہوش آنے تک، بیمار بستر پر لیٹے ہوئے میرے وجود کو مسکان نے ایک جھٹکا دیا تھا — پہلا ذہنی اسٹراک ہے۔ خطرے کی بات ابھی نہیں ہے — کہہ کر وہ ہنسی تھی — دوسرے ہی لمحہ اس نے ایک لفاف میری طرف بڑھا دیا — یہ شِلپی کا رزائنیشن لیٹر ہے۔ اسے کہیں اور کسی بڑی کمپنی میں جاب مل گئی ہے —

بوڑھا اور اس کا ہلنا

''تو اس نے تمہیں چھوڑ دیا —؟''

'پتہ نہیں۔'

'لیکن، جیسا کہ مسکان نے کہا، اسے کہیں اور جاب مل گئی۔'

'کہہ نہیں سکتا۔' رمیش نے ٹھنڈی سانس لی — جیب سے سگریٹ نکالا۔ اور ایک

سگریٹ اپنے منہ سے لگاتے ہوئے جیسے وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔
'میں سیاست کا بہت چھوٹا کھلاڑی تھا دوست۔ شاید میں اتنی ہی سیاست کر سکتا تھا، جتنی میری خودغرضی مجھ سے کرا سکتی تھی۔ لیکن رشتوں کی سیاست آپ کو مار دیتی ہے دوست—وہ اچانک غائب ہوگئی اور شاید یہی وہ وقت تھا، جب اسے لے کر میری دماغی حالت بگڑ چکی تھی— میں نے اس کے جسم کی خوبصورتی دیکھی تھی، یا شاید اسے پتہ تھا کہ شلپی کے ذریعہ ہی مجھے ایک بے حد حقیری سی سیاست کے ذریعہ فتح کیا جا سکتا ہے۔'
رمیش نے سگریٹ کی راکھ ایشٹرے میں جھاڑ دی— 'میں پاگلوں کی طرح شلپی کو تلاش کر رہا تھا، اور اس رات۔ تقریباً گیارہ بجے— گاڑی پارٹیکو میں لگاتے ہوئے میں نے شلپی کو مسکان کے ساتھ باہر نکلتے اور گاڑی میں دوڑ کر جاتے دیکھا۔ میرے سامنے آنے پر بھی مسکان گھبرائی نہیں، بلکہ کسی فاتح کی طرح میرے سامنے تنی رہی— لیکن فی الوقت میں ایک نئے ذہنی اسٹراک سے نجات پانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس لیے میرے پاس میرے لفظ غائب تھے— شاید اسی رات مجھ پر دوسری بار حملہ ہوا تھا—
ہم باہر آئے......تو یکایک مجھے جھٹکا سا لگا تھا— مین گیٹ، برامدہ پار کرتے ہی وہ بوڑھا جھولتا اور ہلتا ہوا جسم سامنے تھا۔ میں یکایک چونکا تھا—
—تم نے دیکھا رمیش—
'ہاں'
'— نہیں۔ تم نے دیکھا یا نہیں—؟
رمیش بغیر کچھ کہے اس بوڑھے کی جانب دیکھ رہا تھا، جو مسلسل ہلے جا رہا تھا—
'یہ مسکرایا بھی تھا۔ اور میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں، جس وقت ہم باہر نکلے اور اچانک اس کی طرف نگاہ گئی—ایک سیکنڈ کے لیے۔ اس نے اپنا ہلنا بند کر دیا تھا......تم کیا کہتے ہو......؟
رمیش جواب دینے کی حالت میں ذرا سا 'ہل' گیا تھا۔ میں نے دوسری بار بوڑھے کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔

●❖●

آخری فریم

اُس کا مرنا طے تھا—

لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ جینا چاہتا تھا—

اور مشکل یہ تھی کہ پچھلے تین چار دنوں سے لگا تار ملک الموت اُسے پریشان کر رہا تھا—

'سب سے مل لو۔'

'کیوں؟'

'کیونکہ گڈ بائی، خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ہے—'

'ابھی تو میں......ابھی کیوں......؟'

اُس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی چالی بیالیس سال۔ یعنی ایسی عمر، جہاں پہنچ کر جوان رہنے کا احساس کچھ زیادہ ہی آپ کو پریشان کرنے لگتا ہے—

'عمر سے کیا ہوتا ہے......؟ ملک الموت ہنسا۔

'ہوتا کیوں نہیں ہے—'

''نہیں ہوتا۔'' ملک الموت سنجیدہ تھا۔ 'شکر کرو۔ پہلے آ گیا، موقع دے رہا ہوں— مرنے کا الہام سب کو نہیں ہوتا۔ وصیت کر جاؤ۔ سب کو بلا لو...... بیٹے کو، بٹی کو...... بیوی کو......'

'ڈراؤ مت۔'

'میں ڈرا نہیں رہا۔ احساس کرا رہا ہوں— تم مرنے والے ہو اور......'

'نہیں، اب میں جینا چاہتا ہوں۔'

ملک الموت ہنسا —— 'پاگل مت بنو۔ مرنے کی دعا مانگتے مانگتے تم نے ہی مجھے بلایا ہے۔' وہ ہنسا تمہاری دعا سن لی گئی۔ خوش قسمت ہو۔ آج کل وہاں سب کی دعائیں نہیں سنی جاتیں......

'پھر میری کیوں سنی گئی۔'

'اس معاملے میں بھی خوش قسمت ہو۔'

'مرنے کے معاملے میں؟'

'ہاں...... ' ملک الموت سنجیدہ تھا۔'' ذرا باہر نکل کر دیکھو۔ تم نہیں جانتے، کتنے کتنے لوگ مرنا چاہتے ہیں۔ مگر موت سب کے نصیب میں کہاں —— ''

ملک الموت اُس پر جھک گیا تھا —— 'بولو۔ کب آجاؤں...... شکر کرو...... اس معاملے میں بھی خوش قسمت ہو۔ میں کبھی خبر کر کے نہیں آتا...... '

'پھر مجھ سے اتنی محبت کیوں...... '

'تم اتنی دردمندی سے، اللہ کے حضور میں گڑگڑا، گڑگڑا کے مجھے مانگ رہے تھے کہ ترس آگیا۔ ذرا یاد کرو'

اُسے یاد کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سارے منظر صاف تھے۔ زندگی میں سب کچھ بہت جلد کر لینے کا احساس۔ ہر لمحہ جیسے ایک اونچی اڑان اُس کے حصّے میں تھی۔ کم کم سایہ، زیادہ زیادہ دھوپ وہ اس دھوپ میں ننگے ننگے پاؤں چلا تھا —— اور اسی طرح، ننگے ننگے پاؤں چلتے ہوئے 'وہ' ٹکرائی تھی۔ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکروں سے کھیلنے والی ——

'تھوڑی سی برف ملے گی؟'

'کیوں نہیں۔'

پھر وہ برف کے ٹکڑوں سے کھیلنے والی اُس کے گھر آگئی۔ کبھی نہیں جانے کے لئے —— بچے ہوگئے۔ اب بچے برف میں کھیلتے تھے اور دروازے کے باہر برف کے ڈھیر لگنے لگے تھے۔ یکا یک زمین غائب ہوگئی۔ برف پگھلنے لگی۔ اُس کی سانس ڈوبنے لگی۔ ہوش میں آیا تو زندگی سے ایڈونچر غائب ہو چکے تھے۔ بدن بیماریوں کا گھر تھا —— اُسے یاد آیا، اُڑتے رہنے کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے اُس نے کہیں بھی سمجھوتہ نہیں کیا تھا —— اور اب چالیس بیالیس سال کا کمزور جسم آرام چاہتا تھا۔ ابدی سکون —— اور اس سکون کے لئے وہ گھنٹوں عبادت میں ڈوبا رہتا۔ روتا،

گڑگڑاتا۔ گھر میں بوجھل سا ماحول تھا___ برف کے ٹکڑوں سے کھیلنے والی کو، اسکیٹنگ کے لئے باہر جانا ہوتا تھا اور بچے، اُس کی بیماری سے گھبرا کر صاف لفظوں میں اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیتے تھے___

'چیخو مت۔ اس سے بہتر ہے کہ......'

'بہتر ہے کہ......'

'تم اچھی طرح جانتے ہو۔' بیوی ہنسی تھی___ باہر برف ہے اور بہت سی تتلیاں۔ تمہاری چیخ سے تتلیاں اُڑ جاتی ہیں۔'

کمرے کے گھنے اندھیرے میں پگھلنے والی ایک چھوٹی سی برف پر لکھ ہوتا تھا___

'ابدی سکون۔'

وہ اس سکون کے، نہ ختم ہونے والے نشہ میں ڈوبنا چاہتا تھا___

●

'کچھ یاد آیا___' ملک الموت سنجیدہ تھا۔

'ہاں۔'

'تو چلو۔'

'کیوں۔ پریشانی میں ایسی باتیں تو سب کرتے ہیں۔ لیکن اب میں......'

ملک الموت کو حیرانی تھی___ 'تم انسان کبھی میری سمجھ میں نہیں آئے۔ خیر۔ اپنے اور اپنے گھر کے بارے میں سب کو جانتے ہو تم...... پھر بھی......'

'جینا اس سے مختلف ہے۔'

'مرنا سب سے مختلف ہے۔'

'زندگی خوبصورت ہے۔'

'موت اُس سے زیادہ دلکش۔'

'زندگی......'

ملک الموت اس مکالمے سے پریشان تھا۔ 'اچھا سنو___ چلو۔ تمہارے اس مسئلے کا بھی حل نکالتے ہیں۔ ایسا کرو___ کہ ایسے دو آدمی کا نام لو جو بے حد خوش رہتے ہوں۔'

'پھر کیا ہوگا؟'

'اگر مان لو ان کی خوشی، نقلی ہو، تو......؟'

'مان ہی نہیں سکتا۔'

'مان لو — مان لو اس کے باوجود وہ مرنا چاہتے ہوں۔'

'ایسا ہو ہی نہیں سکتا — 'جواب دیتے ہوئے اُس کے سامنے ایسے دو آدمیوں کا چہرہ گھوم گیا تھا اور اُسے یقین تھا کہ اگر ملک الموت نے اس بوجھل گفتگو کو مزید آگے بڑھایا تو جیت اُسی کی ہوگی......'

'مان لو......'

'ٹھیک ہے...... پھر میں مرنے کے لئے تیار ہو جاؤں گا۔'

'اب پہلے آدمی کا نام لو......'

ملک الموت کو شاید بہت جلد بازی تھی۔ ایک لمحے کو اُس کی آنکھیں بند ہوئیں۔ پھر اپنے باس جارج ولیم کا دھیان آگیا۔ خیر سے منسٹر بھی بن گیا تھا۔ ایک بے حد کامیاب آدمی۔ ایک خوشحال زندگی — ایک بے حد چاہنے والی بیوی۔ بے حد پیار کرنے والے بچے۔ ہر جگہ ہر موقع پر اُس کے ساتھ — ہنستے مسکراتے — اور وہ اپنی ہر گفتگو میں اپنی کامیابی کا سہرا اپنی بیوی کے سر باندھتا تھا —

اُس نے نام بتایا — ملک الموت ہنسا — لو دیکھو — ملک الموت کی ہتھیلیاں روشن تھیں اور اسکرین بن گئی تھیں۔ وہ سب کچھ صاف صاف دیکھ سکتا تھا —

صبح کا وقت۔ جارج ولیم بیوی بچوں کے ساتھ ہے۔ ہمیشہ قائم رہنے والی مسکراہٹ کے ساتھ۔ سیکوریٹی گارڈس ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ کسی عمارت کی سنگ بنیاد کا منظر — وہ فیتہ کاٹتا ہے۔ تالیاں بجتی ہیں — منظر آگے بڑھتا ہے۔ سب کو نمسکار کرتا جارج ولیم اپنی بڑی سی گاڑی میں بیٹھتا ہے۔ گاڑی کوارٹر کی طرف روانہ ہوتی ہے۔'

اُس کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی — 'دیکھا؟'

'اب آگے دیکھو —'

روشن اسکرین پر اب ڈائننگ ٹیبل ہے — ہنستا مسکراتا خاندان ایک ساتھ بیٹھا کھانا کھا رہا ہے۔ ایک مشہور چینل کا پریس رپورٹر انٹرویو لے رہا ہے۔ کیمرہ آن ہے — پریس رپورٹر

مسکرا مسکرا کر سوال پوچھتا ہے۔ وہ جواب دے رہا ہے۔ 'بس یہی مختصر سی خوراک ـــــ وہ بیوی کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ کھانا میری بیوی بناتی ہے۔ میرے لئے۔ یہ دلیہ۔ یہ فیرنی۔ وہ اپنے بچوں کی طرف دیکھتا ہے۔ بچے مسکرا رہے ہیں۔ جارج ولیم بتا رہا ہے...... یہ سب میری زندگی ہیں...... نہیں روح ـــــ بس اور کیا چاہئے مجھے۔ کچھ بھی نہیں۔ ہتھیار، میزائیل کچھ بھی نہیں۔ جنگ، ہماری نجی خوشحالی کو بھی تباہ کرتی ہے......'

اُس نے تالیاں بجائیں ـــــ 'دیکھا ـــــ'

'اب دیکھو ـــــ 'ملک الموت کے چہرے پر سنجیدگی تھی ـــــ

'اب کیا دیکھوں۔ اب اس سے زیادہ خوشی کیا ہوتی ہے ـــــ'

'آگے...... آگے دیکھو......'

ہتھیلیوں پر اسکرین روشن تھا اور وہ یکا یک چونک گیا تھا۔ رات۔ رات کا وقت ـــــ دوسرے کمرے میں جارج ولیم سو رہا ہے ـــــ بیوی کرسی پر بیٹھی ہے۔ ایک بڑی مونچھوں والا آدمی ٹہل رہا ہے ـــــ جتنے پیسے چاہئیں۔ رشتے مت دیکھئے...... رشتہ تو جذباتی کر دیتے ہیں۔'

'پیسہ بہت ہے ہمارے پاس' ـــــ جارج ولیم کی بیوی کا چہرہ سپاٹ ہے ـــــ

'اور اگر آپ کو وہی کرسی آفر کی جائے جو ـــــ جارج کے پاس ہے......'

'آہ...... آپ سب جانتی ہیں۔ سب جانتی ہیں۔ آپ کو کرسی چاہئے تو ـــــ جارج کو مرنا ہوگا......'

ہتھیلیاں اندھیرے میں ہیں۔ اسکرین پر بلیک آؤٹ۔

دیکھا ـــــ؟ ملک الموت ہنسا۔

'دیکھا'

'پھر ـــــ؟'

اُس کے لہجے میں کھوکھلا پن تھا۔ بچے بھی تو ہیں۔ جارج تو پوتے والا ہے ـــــ بیٹے کا بڑا لڑکا اب کالج میں ہے ـــــ'

'اچھا ـــــ لو وہ بھی دیکھو......'

ہتھیلیوں پر اسکرین روشن ہو گیا ہے۔ جارج کا بیٹا پریشان ٹہل رہا ہے۔ بیٹے کی بیوی یعنی جارج کی بہو غصے میں ہے۔ 'تمہیں کیا ملا۔ ہاں۔ کبھی تمہارے لئے ایم ایل اے یا ایم پی بننے

کی بھی سفارش نہیں کی۔ کیوں ڈھو رہے ہو بڈھے کو ــــ پیسہ مانگو اور باہر چلو۔'

ایک کمزور آواز ــــ 'وہ راضی نہیں ہوں گے۔'

بہو بگڑتی ہے ــــ 'تو مرو۔ نمائش کے گڈے، گڑیے بنا کر زندگی گزار دو۔ وہ جہاں جائے گا، ہمیں سجا کر لے جائے گا۔ دو چار ہمارے بارے میں ڈائیلاگ بولے گا۔ سنو ــــ اُسے زہر دے دو ــــ بہت سے دشمن ہیں اُس کے۔ پارٹی بھی یہی چاہتی ہے۔ تمہارے لئے کھلا آفر ہے ــــ کچھ نہیں ہوگا بڈھے کی موت کا۔ سب خوشی منائیں گے۔ حکومت کچھ دن تک قتل کی تحقیقات کے لئے کمیشن بیٹھا دے گی۔ بس......'

اُسے چکر آرہے تھے۔ وہ زور سے چیخا ــــ 'بس کرو۔'

'ہوگیا۔ اتنے میں ہی......'

اُس کے پیشانی پر پسینے کے قطرے جھلملا گئے تھے ــــ 'مائی گاڈ۔ یہ سب......'

'یہی تمہاری دنیا کا سچ ہے۔'

'کیا جارج یہ جانتا ہے......؟'

'لو، تم خود ہی دیکھو لو ــــ'

ہتھیلیوں پر، اسکرین پھر روشن تھا۔ جارج ٹہل رہا ہے۔ ایک بے چین آتما۔ آنکھوں میں نیند نہیں۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ لیٹ جاتا ہے ــــ اور یہ کیا۔ وہ رو رہا ہے......

'وہ کچھ کہہ رہا ہے......'

ہاں تم بھی سنو......'

اسکرین پر اب کلوز میں جارج کا چہرہ ہے...... وہ رو رہا ہے ــــ 'میں سب جانتا ہوں۔ لیکن کیا کروں۔ یہ ناٹک کرنا پڑتا ہے۔ میں جانتا ہوں مجھ سے کوئی خوش نہیں ــــ نہ پارٹی۔ نہ عوام۔ نہ بیوی۔ نہ بچے ــــ کوئی بھی نہیں...... میں بھی نہیں ــــ میں نے یہ سب کچھ کیسے کیا، میں جانتا ہوں۔ مجھے اٹھالے۔ سکون دے دے۔ یا پھر میری زندگی سے راتیں چھین لے۔ تنہائی چھین لے۔ خاموشی کے لمحے چھین لے ــــ'

اسکرین پر ایک بار پھر اندھیرا تھا۔

'مائی گاڈ' ــــ لیکن اتنی دیر میں وہ اپنے آپ کو آگے کے مکالمے کے لئے تیار کر چکا

تھا____ لیکن ایک آدمی کا سچ____'

'اِسی لئے____ میں نے تمہیں دو آپشن دیے ہیں۔ تمہاری زندگی میں تمہیں سب سے زیادہ خوشحال نظر آنے والے دو آدمی......'

'کیا یہ کم نہیں ہے۔'

'نہیں۔ سب کی زندگی ایک سی ہے اور کوئی بھی تمہاری طرح جینا نہیں چاہتا۔ دو کافی ہیں۔ دو مثالوں میں، تم اپنی پوری دنیا پڑھ سکتے ہو۔ اچھا جلدی سے دوسرے کا نام لو......'

'سوچنے تو دو......'

اُس نے اپنے ذہن کو چاروں طرف دوڑایا۔۔۔ ایک چہرہ نظر کے آگے کوندا____ مشکل سے خریدا گیا ایک چھوٹا سا گھر____ صوفیہ اور اُس کا دوست......'

'صمد......' ملک الموت نے اُس کا خیال پڑھ لیا تھا۔

'ہاں۔'

'تم ان کی شادی میں گواہ تھے۔'

'ہاں۔ کیونکہ......'

بتاؤ مت۔ مجھے سب پتہ ہے۔ لو میرج کی تھی۔ گھر والے خلاف تھے۔ شادی کو 5 سال ہو گئے۔ بچہ نہیں ہے۔'

'ہاں۔ مگر اس کے باوجود۔'

'تم جاتے رہتے ہو......'

'کہاں؟'

'ارے' ان کے گھر......'

'ہاں۔'

'باہر بھی ملتے ہو____'

'ہاں۔ سنیما۔ ریستوراں، کیفے____' وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ خوشحال زندگی کے لئے امیری کا تحفہ ضروری نہیں۔ ایک معمولی مڈل کلاس کا آدمی بھی......'

'لکچر مت دو۔ اسکرین پر دیکھو۔'

ملک الموت نے ہتھیلیاں سامنے رکھ دی تھیں۔ اسکرین روشن تھا____ صبح کا وقت۔

ڈائننگ ٹیبل۔ دونوں پاس پاس بیٹھے ناشتہ کرتے ہیں۔ صوفیہ، دوست کو کھلا رہی ہے۔ دوست ہنس رہا ہے...... 'لگتا نہیں ہے کہ ہماری شادی کو......'

'5 سال ہوئے ہیں۔' صوفیہ ہنستی ہے۔

دوست اُسے کھاتے ہوئے، گود میں کھینچتا ہے۔ صوفیہ کھلکھلاتی ہے۔ دوست اُس کے ہونٹوں کا بوسہ لیتا ہے۔

'جھوٹا کر دیا۔'

'جھوٹا نہیں۔ پاک کر دیا— 'پوتر'— دوست ہنستا ہے......

سین تیزی سے بدلتے ہیں— دونوں باہر آتے ہیں۔ موٹر سائیکل پر بیٹھے ہیں اور......

'دیکھا'— اُس نے اپنے ماتھے کا پسینہ پوچھا۔ جیسے موت اُس کی ہتھیلیوں سے دور نکل گئی ہو— 'کتنے خوش تھے دونوں...... دیکھا۔ زندگی یہ ہے— '

'نہیں۔'

'تم اپنے وعدے سے ہٹ رہے ہو۔'

ملک الموت نے ہتھیلیاں تان دی تھیں— اسکرین ایک بار پھر روشن تھا— دونوں پارک میں ہیں۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے— دونوں کچھ محبت بھری باتیں بھی کر رہے ہیں۔

'ساؤنڈ میوٹ کر دو۔'

'کیوں۔'

'میرے دوست ہیں۔'

'دوست کی محبت بھری باتیں نہیں سن سکتے۔'

'اچھا نہیں لگتا اور پھر— اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے......'

'اچھا چلو— آواز مت سنو— '

محبت اور دیوانگی کے عالم میں صوفیہ اور دوست کو دیکھ کر اُس میں کچھ کچھ زندگی لوٹی تھی۔ دو ایک بار کھانسی آئی۔ آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا بھی چھایا لیکن پھر وہ ہتھیلیوں کے

اسکرین پر لوٹ آیا......

'دیکھا...... یہی سچ ہے......'

'نہیں۔' ملک الموت سنجیدہ تھا۔ اب آگے دیکھو—— 'رات کا وقت۔ بستر۔ صوفیہ اور دوست قریب قریب۔ ہنسنے اور کھلانے کی آوازیں۔ پھر ایک دوسرے سے لپٹنے اور بوسہ بازی کے مناظر—— وہ تیزی سے چیخا——

'بند کر دو یار۔ یہ ایڈلٹ فلم زندگی میں بہت دیکھی ہے۔'

'دوست کی نہیں دیکھ سکتے۔'

'نا——'

'بھابھی ہے، اس لئے۔'

'ہاں۔ تقدس کا جذبہ بھی کوئی چیز ہے۔ ماں،، بہن، بھابھی......'

'چلو، تمہارے اندر اخلاقیات زندہ ہے۔ بڑی بات ہے......'

'تو تم ہار گئے......'

'ہار گئے——؟ ملک الموت ہنسا—— پاگل تو نہیں ہو گئے۔ ابھی تو تم نے صرف ان کی زندگی کا ایک رُخ دیکھا ہے—— بھوشن کو جانتے ہو——؟'

'ہاں۔ صوفیہ کا منہ بولا بھائی۔'

'نہیں۔ بوائے فرینڈ۔'

'نہیں' وہ غصّے میں چیخا—— 'دوست بھی بھوشن کو جانتا ہے اور بُرا نہیں مانتا۔'

'اچھا—— تو دیکھو——'

ہتھیلیاں روشن تھیں—— اسکرین پر پہلے پارک میں صوفیہ نظر آئی۔ کیمرہ پُل بیک ہوتے ہی، اُس کے پیچھے بھوشن نظر آیا۔ بھوشن صوفیہ کے چہرے پر جھکا ہوا تھا...... کچھ کہہ رہا تھا۔ صوفیہ کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ ہونٹ تھرتھرا رہے تھے اور ادھر—— اُس کے اندر بیماریوں کے 'سیّال' دھوم دھڑا کا مچانے لگے تھے۔ نروس بریک ڈاؤن—— ہائپر ٹینشن—— بڑھا ہوا شوگر—— دماغ پر دھائیں دھائیں...... پھیلتا اندھیرا—— بدن میں تھرتھراہٹ——

'لیکن بھوشن تو......'

وہ کہتے کہتے ٹھہر گیا۔ اس 'شریف' سے آدمی سے وہ کتنی کتنی بار ملا ہے۔ خود بھوشن اُس کی

کتنی عزت کرتا ہے ــــــ

'دیکھا' ــــــ ملک الموت سنجیدہ ہے ــــــ

اُس کے اندر طوفان آیا ہوا ہے ــــــ بدن میں آگ لگی ہوئی ہے۔

'یہ سین کافی لمبا ہے۔ دیکھو گے ــــــ ابھی جو کچھ دیکھا، وہ تو کچھ بھی نہیں ہے......'

'نہیں......'

اُس کی سانس ڈوب رہی تھی۔

ملک الموت نے اُسے جھنجوڑا ــــــ سنو۔ اب دوسرا منظر بھی دیکھ لو ــــــ

اس کی آنکھوں کا اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا ــــــ

'دوسرا منظر۔'

'ہاں۔'

'کیسا منظر ــــــ؟'

'اپنے دوست سے نہیں ملو گے۔ شریف اور مہذب آدمی۔ محبت کا مارا۔ بیچارا ــــــ لو دیکھو لو ــــــ'

اسکرین روشن تھا اور یہ کیا یہ تو جیسے کوئی ایڈلٹ منظر تھا۔ یہ دوست کا گھر تھا۔ بیڈ روم......لڑکی کو وہ پہنچانتا نہیں تھا ــــــ مگر یہ لڑکی صوفیہ نہیں تھی۔ دونوں کے بدن پر اس وقت برائے نام بھی لباس نہیں تھے ــــــ

'صوفیہ ابھی نہیں آئے گی......' دوست ہنس رہا تھا۔

'جانتی ہوں۔' لڑکی ہنس رہی تھی......

'صوفیہ سے بور ہو گیا ہوں۔'

لڑکی کھلکھلا رہی تھی ــــــ 'اور مجھ سے۔'

'تم آگ ہو اور اُسے تو برف کی پہاڑیوں سے لایا تھا......'

کھلکھلاہٹ۔ قہقہہ ــــــ اور دوسرے میں گم ہوتے ہوئے گوشت کی دو خوبصورت اُوبڑ کھابڑ پہاڑیاں۔ اور ــــــ

اُس کی سانسیں گم ہو رہی تھیں۔ برف کی پہاڑیاں ــــــ وہ بھی تو 'اُسے' برف کی پہاڑیوں سے ہی لایا تھا ــــــ وہ بھی تو ایسا ہی کچھ...... برف کی پہاڑیوں سے گھبرا کر ــــــ اُس کے

بچے۔ اُس کا گھر۔ اُس کی بیوی — سانسیں دھونکنے کی طرح چل رہی تھیں۔ سویوں کے لچھے کی طرح ایک دوسرے پر الجھتی، ٹوٹتی ہوئی۔ پھر اُس نے زور سے چیخنے کی کوشش کی اور یہ کیا۔

گردن ڈھلک گئی تھی۔

سانسیں گم تھیں —

اسکرین پر اندھیرا تھا۔ ملک الموت نے نبض دیکھی۔ ہلایا ڈلایا۔ پھر خود سے بڑبڑایا — کم بخت، کچھ لوگ اُس کی موجودگی کا فائدہ بھی نہیں اٹھاتے۔ وہ ہنس رہا تھا — لیکن اس ہنسی میں 'زندگی' سے زیادہ مکاری شامل تھی — کیونکہ وہ انتہائی چالاکی سے دونوں کہانیوں کے آخری فریم کو کھا گیا تھا — اب، جبکہ اُس کی روح اُس کی مٹھیوں میں تھی، وہ اپنی آنکھوں کے اسکرین پر بچے ہوئے آخری فریم کو دیکھ کر لطف اٹھا سکتا تھا —

اب آخری فریم سامنے تھا —

اور اس فریم میں جارج ولیم تھا۔ چہرہ جھکا ہوا۔ شرمسار — کیمرہ پین ہوتے ہی گھر کے دوسرے افراد نظر آجاتے ہیں۔ جارج ٹھہر ٹھہر کر کہہ رہا ہے۔

'آہ، موت...... موت کا احساس...... نہیں آپ سب مجھے ایسی آنکھوں سے مت دیکھو۔ یقیناً میں تم سب کا مجرم ہوں۔ یقیناً اپنے گھر، اپنے گھر کے لوگوں کا۔ مگر آہ...! اس سے زیادہ اپنے ملک...... اپنی وفاداریوں اور ایمانداریوں کا...... اور اس سے بھی زیادہ — نہیں — کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ سب میری باتیں سنیں گے۔ آہ! صرف موت۔ موت جو ہتھیار اور میزائلس کی خرید و فروخت، جو تمام تر مکاریوں سے زیادہ سچ ہے — نہیں، میں کنفیشن نہیں کرنا چاہتا۔ حق بھی نہیں ہے مجھے۔ مگر آہ...... ! صرف یہ سوچ کر شرمسار ہو رہا ہوں کہ...... تم لوگ پیدا بھی نہیں ہوئے۔ پیدا ہو کر بھی نہیں پیدا ہوئے۔ زندہ ہو کر بھی نہیں جئے......'

جارج کچھ دیر کے لئے رُکا۔ اپنے پوتے کو قریب کھینچا — 'نہیں۔ میرے پیارے جمی — ہم سب کو اپنی زندگی جینے کا حق ہے اور جینا بھی چاہئے — اس لئے تمام تر مکاریوں کو...... نہیں — مجھے کہنے سے مت روکو...... میں الوداع کرنا چاہتا ہوں۔ ہاتھ ہلا کر الوداع — بس اتنی سی زندگی سکون میں گزر جائے گی نا —'

'بہت سے لوگ مارے گئے ہیں' — پوتا کہتے کہتے ٹھہرا — بہت سے لوگ مارے جا رہے ہیں......'

’آہ کنفیشن! نہیں۔ مجھے ایسی آنکھوں سے مت دیکھو پوتے ـــــ مگر موت کا احساس......تم سمجھ رہے ہونا ـــــ‘

’ہاں‘ ابھی اتنا بہت ہے...... ’بیٹا کہتے کہتے ٹھہرا۔‘ یہ احساس...... یعنی یہ میزائلوں کا احساس......یعنی ابھی یہ مارے جانے والے لوگوں کا احساس......‘

بیوی کے چہرے پر شرمندگی تھی ـــــ کبھی کبھی ہم ایک نہ ختم ہونے والی شرمندگی میں جیتے ہیں ـــــ

بہو آہستہ سے بولی ـــــ ’اور اسی شرمندگی میں مرجاتے ہیں۔ مگر ـــــ کیا اتنا کافی ہے ـــــ‘

ملک الموت مکّاری سے مسکرایا ـــــ انسان ہونے کے لیے اتنا بھی بہت ہے ـــــ اور جارج ویلیم جیسا آدمی ـــــ نہیں ـــــ انسان ہونے کی جون میں پیدا ہونے کے بعد اس سے زیادہ کا احساس نہیں ہوسکتا۔ اب دوسری کہانی کا آخری بچا فریم بھی سامنے تھا ـــــ صوفیہ اور دوست دونوں ایک دوسرے کو ٹٹول رہے تھے ـــــ دوست کی آنکھوں میں نئے لمحوں کی اُڑان تھی ـــــ ہاں، تم سمجھ رہی ہونا۔ ہاں تمہیں سمجھنا بھی چاہئے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے ـــــ دراصل......اپنے اپنے وقت کے تقاضے کو سمجھنے میں، ہم سے کافی دیر ہوجاتی ہے ـــــ تم، کسی کے بھی ساتھ۔ تمہاری مرضی ـــــ جاسکتی ہو۔ اور میں......اپنی قسم کی زندگی ـــــ نہیں، زیادہ خوش مت ہوؤ۔ یہ سب نئی زندگی کے رنگ ہیں اور اس میں کچھ بھی نیا نہیں ہے......تم......‘‘

’انسان کمبخت‘......ملک الموت خود کو نڈھال محسوس کررہا تھا۔ ممکن ہے باقی بچے فریم سے اُسے زندگی مل جاتی۔ ممکن ہے......وہ بے حد تکان اور سانسوں کو ٹوٹتا محسوس کررہا تھا۔ اُس نے ژوں کے ساتھ گھوم کر غائب ہونا چاہا ـــــ مگر......

●❖●

کہانی تمہیں لکھنے والی ہے!!!

بوڑھوں کے تیور صرف بوڑھے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بڑھاپا بچوں اور جوانوں کی سمجھ میں آنے والی چیز نہیں ہے۔ کیا پتہ وہ کب کس بات پر خوش ہو جائیں، کب کس بات پر منہ پھلا دیں، کس بات پر اُداس ہو جائیں۔ بڑی خبطی سی شے ہے بڑھاپا۔ ایک جگہ بیٹھے بیٹھے بھی طبیعت گھبرا جاتی ہے۔ مگر اب پہلے والی بات نہیں رہی۔ اٹھنے پر سر گھومنے لگتا ہے — پیر کے جوڑوں میں درد شروع ہو جاتا ہے — ہاتھ الگ کانپنے لگتا ہے۔ سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو لیٹے لیٹے پوتے کو صدا لگاتا ہوں......

''بلو......او بلو......!''

دوسرے ہی لمحہ وہ بھاگتا ہوا کمرے میں آجاتا ہے...... ''جی دادا......''

اشارے سے اٹھانے کے لئے کہتا ہوں۔ بلو پیٹھ کی طرف ہاتھ لگا کر بٹھا دیتا ہے۔ اُٹھ جاتا ہوں تو پھر سوالوں کے ایک لمبے سلسلے کا آغاز ہو جاتا ہے۔ کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟ ایک جگہ بیٹھنے کی بھی عادت نہیں رہی۔ کتنے ہی دوست ہیں جو لاٹھی ٹیکتے ہوئے چلا کرتے ہیں۔ ان مضبوط ہاتھوں پر، ہمیشہ سے فخر رہا تھا — آج تھک ضرور گیا ہوں مگر لاٹھی پکڑنے کی کمزوری نہیں کر سکتا۔ کمرے سے باہر نکل کر، بہوؤں کو صدا لگاتا ہوں:

''شاداں......عصمت......ناہید......کوئی ہے......ذرا چائے بنا دینا......''

باورچی خانے میں کچھ کھُسر پھُسر سی ہوئی ہے۔ جانتا ہوں، بہوؤں کے درمیان اس بے وقت کی فرمائش اور اس خبطی عادت کو لے کر ناک سکوڑی جا رہی ہوگی — ''ابا پریشان

کر دیتے ہیں۔ یہ بھی کوئی وقت ہے چائے پینے کا؟ مگر چائے تو بنانا ہی ہوگی۔''

بڑھاپے میں کب کس چیز کی طلب ہوگی، پہلے سے سوچا نہیں جا سکتا۔ اپنے آپ کو کس قدر توڑتے ہوئے اور موت سے جوڑتے ہوئے کبھی ضرورت اور کبھی بلا ضرورت کسی بھی اجنبی خواہش کی صدا لگانا پڑتی ہے۔ بہوئیں کیا جانیں کہ اس عمر میں بڑھاپا کتنی عجیب عجیب سی خواہشوں کو سُلا کر کے بڑھاپا کہلاتا ہے ـــــ بوڑھا رو نہیں سکتا، بوڑھا آدمی زیادہ ہنس نہیں سکتا...... یہ سب عیب اور پاگل پن میں گنے جائیں گے۔ بچے جمع ہو جائیں گے...... کیا بات ہے ابا؟ بہوئیں پوچھیں گی، پوتے پوتیاں گھبرا جائیں گی۔ اور پھر ان سے کیا کہوں گا کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو بچو! بوڑھے آدمی کو بھی اکیلے پن میں یاد ستا سکتی ہے۔ گزری ہوئی بھولی بسری پرانی یادیں اچانک سناٹے میں آکر رونے پر مجبور کر سکتی ہیں۔ بوڑھے آدمی کا بھی کوئی ماضی ہوتا ہے، کوئی بیوی ہوتی ہے۔ بیوی ـــــ جواب نہیں رہی۔ وقت کی دوڑ میں دو تین سال ہی پیچھے نہیں چھوٹی بلکہ صدیوں کے لمبے سفر کا فاصلہ طے کر گئی۔!

دھم سے آکر چوکی پر بیٹھ گیا ہوں۔ کتنا تھک جاتا ہوں۔ صرف کمرے سے باہر چوکی تک کا سفر...... گزری یادوں سے ابھی ابھی جی رہے لمحہ تک کا سفر...... بوڑھا جی کھول کر رو بھی تو نہیں سکتا...... اپنے آپ کو دابے رہنا پڑتا ہے...... بچوں میں، پوتے پوتیوں میں...... بہوؤں میں...... افکار نو کے طلسم کدے میں خود کو پناہ دینی پڑتی ہے، کہ اے بوڑھے ـــــ! تمہارے ہی دم سے یہ رونقیں جوان ہیں...... تمہاری اُداسی، تمہاری خاموشی بچوں کے ہنستے مسکراتے چہروں کی چمک چھین لے جائے گی...... سب کے سب پریشان ہو جائیں گے۔ صرف تمہارے لئے۔!!

عصمت چائے لے کر آجاتی ہے۔

پیچھے مسکراتی ہوئی ناہید کھڑی ہے۔ ''ابا! آپ کمرے سے باہر نکل آئے اس وقت؟''

ناہید کا سوال جیسے سنا ہی نہیں...... ہونٹوں کی مسکراہٹ گہری ہوگئی ہے۔ سب کو بوڑھے کا کتنا خیال ہے۔ عصمت سے پوچھتا ہوں...... ''چائے میں کتنی سیکرین ڈالی۔''

شاداں کہہ رہی ہے۔ ''ابا! آپ کو اس وقت کمرے سے باہر نہیں نکلنا چاہئے تھا، ٹھنڈک بہت ہے۔''

بوڑھا صرف سنتا ہے۔ بہوئیں کتنا سوچتی ہیں۔ کوئی تکلیف نہیں ہوا ابا کو ـــــ کیسے کہوں کہ بڑھاپے میں خبطی موڈ کے سہارے ہی جینا پڑتا ہے۔ کوئی وقت نہیں ہوتا باہر نکلنے کا۔

جب موڈ بن جائے — کچھ کرنے کا خیال آجائے اور نہیں کرو تو اپنا ہی آپ ڈسنے لگتا ہے — آخر زندگی بھر ایک آفیسر کی زندگی جیا ہوں۔ بڑا عہدہ، بڑا رتبہ اور آفیسر جب سرکس کے رنگ ماسٹر کی طرح ہاتھ میں بیلٹ لے کر اپنے آپ کی مجبوری پر حاوی ہو جائے تو کوئی بھی خواہش دبائی نہیں جاسکتی۔ضدی بچے کی طرح ہر خواہش کا مزا لینے کا دل چاہتا ہے۔

''ٹھنڈک بہت ہے ابا! اور آپ نے اوپر صرف کرتا ہی پہن رکھا ہے۔''!

چائے کی چسکیاں لیتا ہوا ٹھہر جاتا ہوں، خود کا جائزہ لیتا ہوں۔ ہاں ٹھنڈک کچھ بڑھ گئی ہے۔ عصمت نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ چائے کا کپ لے کر اپنے کمرے کی طرف لوٹ پڑتا ہوں۔ کچھ دیر اور بستر میں آرام کرنا چاہئے۔ وقت گزاری کے لئے میگزین سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں — پڑھتے رہو جب تک نیند نہیں آجائے اور اس عمر میں رکھا بھی کیا ہے۔ بچوں کی شادی ہوگئی۔ اب فکر ہے تو موت کی۔ آنکھیں بند کب ہوتی ہیں، بلاوا کب آتا ہے؟ اکیلے جیتے ہوئے کسے اچھا لگتا ہے کتنے ہی دوست ایک ایک کر کے رخصت ہوگئے۔ جو باقی ہیں وہ بھی آہستہ آہستہ رخصت ہوتے جارہے ہیں۔ سنتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ ارے فلاں چلا گیا؟ کچھ دیر کے ئے سن سے ہو جاتا ہوں اندر کچھ ٹوٹ پھوٹ سا جاتا ہے۔ مگر ایسی خبروں کے لئے جیسے اب خود کو پوری طرح سے تیار کر چکا ہوں۔ شروع شروع تو ایسے کسی دوست کے بارے میں سنتے ہوئے تو واقعی بہت صدمہ ہوتا تھا مگر اب — اثر تو ہوتا ہے مگر اتنا نہیں...... شاید اس لئے کہ اس عمر میں ایسی ہی خبروں کے سننے کی امید رہتی ہے...... کچھ دیر کے لئے مرنے والے کی خصوصیت گنوائی جاتی ہے...... پھر معمول کی طرح روزمرہ کی باتیں شروع ہو جاتی ہیں...... شاید میرے بعد بھی میرے دوست احباب ایسا ہی کریں گے۔؟

کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا ہوں۔ اپنی موت کے بارے میں جب جب سوچتا ہوں تو ایسے ہی کچھ دیر کے لئے پورا وجود برف کی طرح جما ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پھر برف پگھلنے لگتی ہے، اور اس لفظ سے دور نکلنے کی کوشش کرتا ہوں...... مگر یہ بھی سچ ہے کہ اب زندگی کے لئے کوئی خاص خوشی نہیں رہ گئی، بلکہ خود ہی ہر روز حساب لگایا کرتا ہوں...... آج ایک روز اور گزر گیا...... آسیہ کو گئے کتنا عرصہ ہوا؟...... آسیہ! بوڑھی آنکھیں کچھ سوچ کر گیلی ہو جاتی ہیں اور پھر کہیں سے کوئی پرانی صدا پورے وجود کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے...... صاحب...... صاحب کلب نہیں چلئے گا...... صاحب کو چائے دو...... صاحب کے کھانے کا وقت ہو گیا......''

آسیہ پورے گھر میں دوڑ رہی ہے اور یہ بھی عجیب بات رہی کہ وقت کی دوڑ جاری رہی۔ وہ ریٹائر بھی ہو گئے مگر آسیہ بوڑھی نہیں لگی۔ ہاں وہ خود بوڑھے ضرور ہو گئے...... وقت بوڑھا لگا...... اتنی ہٹی کٹی آسیہ، زندگی کی بے معنویت میں بھی ساتھ رہنے کا وعدہ کر کے آئی تھی...... مگر اتنی جھوٹی نکلی کہ کینسر کے معمولی سے مرض میں زندگی کے اس پختہ وعدے کی اینٹ کو توڑ کر ہمیشہ کے لئے بادلوں کے بیچ اوجھل ہو گئی...... اور پہلی بار محسوس ہوا تھا کہ اب زندگی نہیں کٹ سکتی...... نہیں گزر سکتی—— بڑھاپا ایک مرض ہے، ایک روگ ہے جو بوڑھی بیوی کے سہارے کاٹا تو جا سکتا ہے مگر اکیلے نہیں کٹ سکتا—— بچوں میں، بہوؤں میں، پوتے پوتیوں میں خوشیوں کا عکس تو ڈھونڈا جا سکتا ہے مگر زندگی کی وہ چمک جو کئی سال پہلے قبرستان کے اندھیرے میں دفن کر آیا ہوں—— بس اسی دن سے جینے کی خواہش بھی سو گئی اور انگلیوں پر گزرے ہوئے دنوں کا حساب شروع ہو گیا۔ تکلیف دہ رات کا ایک لمبا سلسلہ...... گلوکوز کے انجکشن...... دوائیاں اور بڑھتے ہوئے سارے جسم میں پھیلتے ہوئے درد کا احساس بڑھتا گیا مجو ٹھیک کہتے ہیں...... دوائیاں بیکار ہیں، بڑھاپے میں دوائیوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بڑھاپے میں سیکڑوں قسم کے مرض ہو ہی جاتے ہیں۔ کس کس کا علاج کرایا جائے اور یہ بھی سچ ہے کہ صبح کی روشنی میں کمرے میں سمٹے ہوئے تمام دوست احباب اب زندگی کی بات نہیں کرتے بلکہ سب کے سب بڑی آسانی سے موت کی باتیں کیا کرتے ہیں پتہ نہیں کب موت آئے گی؟ کب بلاوا آئے گا؟ پہلے عجیب لگتا تھا مگر اب ان باتوں کی عادت پڑ گئی ہے۔ خود کو ان باتوں کے لئے پوری طرح تیار کر چکا ہوں...... ہاں آج صبح ایک جھٹکا سا لگا...... دس بجا تھا، جب مجو، فاروق، ظفر یہ تمام لوگ کرسیوں پر بیٹھے گپ شپ میں مشغول تھے۔ علی کا انتظار تھا۔ علی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ سب علی کو ہی یاد کر رہے تھے—— لاٹھی ٹیکتے ہوئے دروازے پر رک کر خاص انداز سے علی کا سلام مارنا—— ''محبوب بھائی! سلام علیکم!''

''آہا......!'' لیٹے ہی لیٹے کتاب سے نظریں اٹھا کر علی کو دیکھتا ہوا میں جواب اچھالتا۔ علی لاٹھی ایک طرف رکھ کر بیٹھ جاتے۔

مجو کی آنکھوں میں گلوکوما اتر آیا تھا۔ سورج کی تیز شعاعوں کے بیچ علی کے چہرے کو شناخت کرتے ہوئے دھندلی دھندلی آنکھیں کچھ روشن سی ہو جاتی ہیں۔ پھر مجو مذاق پر اتر آئے......

''بھائی علی! آج قورما پلاؤ کھایا ہے کیا۔ بہت خوش نظر آ رہے ہو۔؟''

''قورما اور پلاؤ تو اب آپ ہی کے یہاں کھائیں گے مجو بھائی۔'' علی کی کھنکتی ہوئی

آواز اُبھرتی ـــــ ''بھابھی کے ہاتھ کا بنا ہوا ـــــ! کھلائیں گے نا ـــــ؟''

''ٹھیک ہے۔'' شاید پہلی بار حجو بڑے اطمینان سے بولے تھے ـــــ لاٹھی سے زمین کھودتے ہوئے۔

''پرسوں عمران آئیں گے، کچھ پیسہ ہو جائے گا۔ جمعہ کو کھانے پر آوَ۔ قورما اور پلاؤ دونوں چلے گا۔''

''ہم سب شرکت کریں گے۔'' فاروق نے حسب معمول ٹھہا کا لگایا تھا۔

حجو نے دعوت دی ہے...... لیٹے لیٹے تھک گیا ہوں۔ اُٹھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ علی کہتے بھی ہیں کہ آپ لیٹے رہیے محبوب بھائی۔ مگر دل نہیں مانتا۔ چائے کے لئے پوتے کو آواز دیتا ہوں......

''بلو! چائے لے آوَ۔''

جمعہ کو اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں، بس آنے ہی والا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ حجو جیسے کنجوس آدمی نے دعوت کیسے دے دی۔ شاید دوست پر پیار آ گیا ہوگا...... سب ہنسے جا رہے تھے۔ بات بات پر قہقہے لگا رہے تھے...... علی کا معمول تھا روز دس بجے آتے۔ لاٹھی ٹیکتے ہوئے...... آج بھی قد آور جسم...... بیوی رخصت ہو چکی تھی...... لاولد تھے...... یہی غم کھائے جا رہا تھا۔ حجو لڑکیوں کی شادی کو لے کر پریشان تھے۔ سب کے الگ الگ مسئلے۔ سب کے الگ الگ غم ـــــ اور اس دن ساڑھے دس بج گئے مگر علی نہیں آئے۔ حجو بھی لاٹھی ٹیکتے ہوئے انتظار کر رہے تھے...... آج علی نہیں آئے۔ کل ہی جمعہ ہے...... آج عمران شام تک آئیں گے۔ انگلیوں پر حساب چل رہا ہے۔ ٹھیک اسی وقت علی کے گھر سے لڑکا آتا ہے۔

''علی صاحب گزر گئے۔''

''کیا ـــــ؟'' کمرے میں اچانک بالکل سناٹا پھیل جاتا ہے ـــــ حجو نے فاروق کو دیکھا۔ فاروق نے ظفر کو۔ ظفر نے میری طرف...... میں نے اُٹھنے کی کوشش کی...... کوئی کچھ نہیں بولا...... ہاں ایک چیختا ہوا کوا سامنے کی منڈیر پر آ کر بیٹھ گیا۔ حجو تیزی سے اُٹھے۔ لاٹھی پکڑتے ہوئے باہر آئے۔ کوّے کو ہکاتے ہوئے بولے۔ جا...... ہٹ...... ہٹ...... کوا ویسی ہی بے سری آواز نکالتا ہوا پھر آسمان کی جانب پرواز کر گیا۔ کتنی ہی ٹھنڈی اور گرم سانسیں کمرے میں گونج گئیں...... بدن میں کچھ دیر کے لئے طوفان سا آ گیا......

''علی چلے گئے۔!''

کمرے میں پھر سناٹا ہے......

''جنازہ کب جائے گا۔؟''

''شام کو عصر کی نماز کے بعد۔''

کانپتے ہوئے ہونٹ پھر گونگے بن گئے ——

''کیا ہوا تھا علی کو؟''

''کچھ بھی نہیں۔ بالکل ٹھیک ٹھاک تھے۔ صبح کو آرام سے اُٹھے۔ پانی مانگا۔ پھر سینے کے پاس ہلکا ہلکا درد محسوس کیا تو لیٹ گئے —— ڈاکٹر کو بلانے کو کہا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر آئے، وہ جا چکے تھے۔''

لڑکا جا چکا ہے یہ منحوس سی خبر دے کر —— ایک عجیب سی بے یقینی پورے کمرے میں پھیل گئی ہے۔ سامنے والی کرسی خالی پڑی ہے۔ کل اسی پر تو بیٹھے تھے علی۔ پرسوں بھی۔ اس سے پہلے بھی۔ شاید وہ جب جب آئے اسی مخصوص کرسی پر بیٹھے...... جو چپ ہیں۔ لاٹھی ہلا رہے ہیں، بیچارے کو کل دعوت دی تھی...... کیا معلوم تھا...... آنکھیں پھر بے رونق ہو گئی ہیں......

''بہت اچھا فٹ بال پلیئر تھا علی۔'' میں آہستہ سے کہہ پاتا ہوں —— ''زندگی بھر ساتھ رہے۔ ساتھ پڑھے لکھے، ساتھ ساتھ نوکری کی، ریٹائر بھی ایک ہی سال میں ہوئے...... مجھ سے اچھا فٹ بال کھیلتا تھا وہ...... اس عمر میں بھی کیسی اچھی ہیلتھ تھی...... چلا گیا......''

دھوپ کچھ سخت ہو گئی ہے۔ ببلو چائے لے کر آ گیا ہے۔ سب چائے پینے لگتے ہیں۔ علی کی کرسی خالی ہے۔ رہ رہ کر دھیان اسی خالی کرسی پر جا رہا ہے۔ مگر اب ان باتوں کا سلسلہ علی سے موڑ دیا گیا اور کیا ضروری ہے کہ اس سلسلے کو قائم رکھا جائے...... کون جانتا ہے کب کس کی باری آ جائے...... سب تو ایک ہی صف میں کھڑے ہیں...... ایک لائن سے جانے کو تیار۔ مگر علی......

علی روز آتے تھے مگر اب کبھی نہیں آئیں گے۔ روز ہنستے ہنساتے تھے...... اب یہ دن کبھی نہیں لوٹیں گے۔ جو کو روز چھیڑتے تھے اور جو انہیں روز چھیڑتے تھے۔ اب یہ لمحے دور چلے گئے ہیں کیا یہ کوئی بڑا حادثہ نہیں...... پھر گفتگو کا سلسلہ صرف علی پر کیوں نہیں ٹھہرتا کیا کوئی حادثہ اس سے بھی بڑا ہو سکتا ہے...... مگر یہ آنسو کہاں چلے گئے ہیں...... ظفر، فاروق، جو علی کی بات کیوں نہیں کرتے...... ایک جھٹکے کے بعد اب سب معمول پر لوٹ آئے ہیں۔

علی کا تذکرہ ہر لمحہ پرانا پڑتا جا رہا ہے —— دوپہر ہو گئی ہے شام کو علی کے جنازے میں

شرکت کرنا ہے...... محفل برخاست ہوگئی ہے۔ پہلے لاٹھی ٹیکتے ہوئے تجو گئے...... پھر فاروق۔ پھر ظفر...... اب ہم تنہا رہ گئے ہیں ـــــ اب کچھ ہی دیر میں بہوؤں کی پکار سنائی دے گی ـــــ ''ابا! کھانا کھا لیجئے۔''

رات کا ایک بج گیا ہے، مگر نیند آنکھوں میں نہیں ہے علی کو مٹی دے کر مغرب کے بعد ہی لوٹ آیا تھا ـــــ عمر کی اس منزل پر زندگی کے بارے میں غور کرتا ہوں تو زندگی نہ کوئی پہیلی لگتی ہے، نہ کوئی معمہ...... بلکہ قبرستان کی چہاردیواری نظروں میں گھوم جاتی ہے کیا زندگی صرف یہی ہے، ایک ہی محور پر لگی ہوئی۔ اب یا تو کچھ عجیب نہیں لگتا ـــــ یا پھر سب کچھ عجیب لگتا ہے تو پھر اندر سے ایک صدا سنائی دیتی ہے ـــــ ہوشیار ہو جاؤ ـــــ کہانی تمہیں لکھنے والی ہے ـــــ!

''کہانی ـــــ اور وہ بھی مجھے لکھنے والی ہے ـــــ ہنسی آتی ہے ـــــ کیسے یقین کروں۔ مجھ جیسوں پر کہانی ـــــ اور کون لکھے گا؟ خود کہنی لکھے گی ـــــ چپ ہو گیا ہوں، جانے کیا سوچ کر ـــــ یہ آواز رات کے ایک بجے اس تنہا کمرے میں مجھے بار بار پریشان کر رہی ہے ـــــ''

ہوشیار ہو جاؤ ـــــ کہانی تمہیں لکھنے والی ہے۔ اس لئے کہ تم نے ایک پوری زندگی دیکھی ہے ـــــ ایک زندگی جھیلی ہے۔ تم موت کے بارے میں بھی جانتے ہو اور زندگی کے بارے میں بھی ـــــ بہت سے لوگ موت کے اس اندھیرے کنوئیں میں جھانکنے سے ڈرتے ہیں اور تم ـــــ عمر کے اس موڑ پر ـــــ زندگی اور موت کے اسی فاصلے کو طے کرنا ہے ـــــ اور آنکھیں موند کر سو جانا ہے ـــــ حقیقت بس اتنی سی ہے ـــــ کھانے کے بعد تمہیں بھی نیند آجائے گی ـــــ اور تم سو جاؤ گے ـــــ بے مقصدیت کا یہ فر آہستہ آہستہ اپنی آخری منزل کو پالے گا ـــــ پھر ایک لمبی خاموشی ـــــ اور بند کتاب......''

اور محبوب! یہ بھی دیکھو کہ ـــــ رات کے ایک بج چکے ہیں اور تم سونے کی کوشش کر رہے ہو۔ اور علی کی باتیں کہیں نہیں ہیں ـــــ روز آنے والے علی کی باتیں کہیں نہیں ہیں......

اس لئے ہوشیار ہو جاؤ ـــــ خود احتسابی کا جرم نہ کرو۔

کہانی تمہیں لکھنے والی ہے۔ کہانی تمہیں لکھنے والی ہے۔ کہانی تمہیں لکھنے والی ہے......!!

(1980)

نـــوٹ: یہ کہانی میں نے 18 سال کی عمر میں تحریر کی۔۔۔ پہلی بار یہ ہندی رسالہ میں شائع ہوئی۔۔۔ کرشنا سوبتی کو یہ کہانی اس قدر پسند آئی کہ ساہتیہ اکادمی کی انگریزی میگزین اُترا کے انتخاب میں جگہ دی۔۔۔

میڈونا کی اُلٹی تصویر

''وہ محبت بھی کر سکتے ہیں اور نفرت بھی
وہ غصہ سہ بھی سکتے ہیں/ اور کر بھی سکتے ہیں
تم یہ مت سمجھو کہ وہ کسی کام کے نہیں
ہمیشہ قائم رہنے والی یہ دنیا سب کا استعمال کھوج نکالتی ہے۔
ہاں استعمال،
جن کے بارے میں تم کبھی سوچتے ہو
کہ کوڑھیوں کا استعمال کیا ہے۔
اور دنیا کے سینے پر دھبےّ کی طرح جی رہے اپاہج ٹولیوں کے وجود کا۔''

•

بے معنی ان فلسفوں میں جان یوں ہی نہیں پڑی تھی بلکہ لاشعوری طور پر ہی سہی، کہیں سے یہ میری سوچ کا ایک حصہ ضرور رہے تھے۔ میں نے ہنسی میں اس بات کو ٹالنا چاہا اور چمکتی آنکھوں سے وِشن کی طرف دیکھا۔

تم کیا سوچتے ہو؟

کس کے بارے میں۔

اس نے اخبار سے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں نے کھڑکی کے باہر کی طرف اشارہ کیا۔ سامنے ایک قطار سے جھگی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں سڑک تھی اور اس

طرف میرا ڈی ڈی اے کا فلیٹ۔ اکیلے ہونے کے اپنے کئی فائدے ہیں۔ جیسے یہ کہ خالی ہوں تو کچھ نہ کچھ سوچتے رہیے۔ یہ کیا ہوا؟ وہ کیسے ہوا؟ یہ کیسے جیتے ہیں۔ وہ کیسے رہتے ہیں...... اور آپ اگر ادب یا صحافت سے وابستہ ہوں، تو ایسی ہر چیز، تصویر کے ہر فریم میں آپ کو کہانی نظر آئے گی۔ خالی پن کا ایک فائدہ میں ادھر پھر محسوس کر رہا تھا۔ جب ان جھگی جھونپڑی والوں سے ہو کر میری محسوسات کے صحرا میں کھلبلی مچی تھی۔ اب بھلا ان کا استعمال کیا ہے۔ یعنی، یہ دنیا میں تو آ گئے؟ اب جیسے ہم ہیں۔ ہم پڑھتے ہیں، لکھتے ہیں، تبادلہ خیال سے نئے نئے زاویے اور نئے نئے فلسفے سامنے آتے ہیں۔ یعنی کچھ تو دے رہے ہیں۔ ملک کو___ دنیا کو___ چلئے یہ بحث بہت لمبی ہو جائے گی مگر ان کا فائدہ۔ آپ کہہ سکتے ہیں یہ مزدور ہیں تو گھر بناتے ہیں اور جس کسی بھی چھوٹے موٹے پیشے سے منسلک ہیں، آپ کو سکھ تو پہنچاتے ہیں۔ لیکن میں اس استعمال کو نہیں مانتا۔ کوئی بڑا استعمال یا___ پتہ نہیں میں کیا سوچ رہا تھا۔ شاید پوری طرح میں خود اپنی سوچ کو سمیٹ نہیں پایا تھا___

کبھی کبھی چھٹی کے موقع پر وشن بھی چلا آتا۔ وشن اخبار میں میرا ساتھی ہے۔ کرائم رپورٹر۔ کرائم کا صفحہ وہی دیکھتا ہے۔ اکثر وہ عجیب چٹخارے دار خبروں کے ساتھ میرے کمرے میں آدھمکتا ہے۔ پھر اس کی خرمستیاں شروع ہو جاتی ہیں...... کہ سالے بھابھی لے آ...... چل چائے پلا۔ خالی خولی آلتو فالتو سوچتا رہتا ہے۔

میں نے اچانک وشن سے سوال پوچھ لیا تو وہ چونک پڑا۔

میں نے بات آگے بڑھائی...... تم کیا سمجھتے ہو ان کا کوئی استعمال ہے؟ یا ہوسکتا ہے...... یہ پڑھے لکھے بھی نہیں۔ اپنے طور پر کوئی نظریہ بھی نہیں بن سکتے۔ ذہن کا استعمال نہیں جانتے۔ پھر یہ کیوں ہیں؟ کس لئے ہیں...... دو وقت کی روٹی پیدا کر لی...... بس......؟

'اور تم......؟

میں جانتا تھا وشن یہی کہے گا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ 'میرا استعمال ہے...... میں کچھ تو دے رہا ہوں۔ ملک کو...... دنیا کو...... تحریر کے ذریعہ پورے نظام کو بدل سکتا ہوں۔ ہوا کا رخ موڑ سکتا ہوں...... اور کیا چاہئے تمہیں۔'

وشن نے پھر اخبار پر نظریں جما دیں۔ صرف اتنا کہا___ 'تم کہہ سکتے ہو، ابھی تمہارا سوال میں پوری طرح نہیں سمجھ سکا...... جب سمجھوں گا، تب کہوں گا___ اور......'

لیکن شاید اس وقت تک اپنا سوال میں خود پوری طرح نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ہاں جھونپڑی کے لوگوں میں میری دلچسپی حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ صبح صبح جب بالکنی پر آتا تو سامنے کے چاپاکل، پر ان کی عورتیں، مرد، بچے سب مل کر نہار ہے ہوتے۔ جھونپڑی کی صفائی جارہی ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے چولہے سلگ جاتے۔ لیپا پوتی کا کام بھی چل رہا ہوتا۔ پھر نہادھوکر جھونپڑیوں میں کھونسی گئی، لکڑی کی کانتی کی بنی ٹوکریاں نکال دی جاتیں اور کچھ اپنا راستہ ناپ لیتے۔ میں جانتا تھا۔ یہ مزدور ہوں گے۔ لیکن ان میں سب مزدور نہیں تھے۔ کچھ کے دھندے مجھے نہیں معلوم تھے — کچھ تو بہت سویرے ہی نکل جاتے۔ اس لئے کہ جس وقت میں سو کر اٹھتا، اس وقت کچھ جھونپڑیاں بالکل شانت نظر آتیں اور دروازے پر چمار کی کترتوں والا چمڑا پردے کے طور پر جھول رہا ہوتا۔ مطلب ان جھونپڑیوں کے باسی کام پر چلے گئے۔ میرے خیال میں اس کام کی نوعیت بھیک جیسی ہوگی۔ اس لئے کہ یہ ''کامی'' آدمی جب واپس آتے تو شکل صورت سے بھی بھکاری ہی معلوم دیتے۔

اس دن صبح ہی صبح دروازہ زور زور سے تھپتھپائے جانے پر میری نیند ٹوٹ گئی۔ سوچا، بھنگی ہوگا یا فلیٹ کا چوکی دار۔ اس لئے کہ اتنی صبح صبح کسی کے آنے کی امید نہیں تھی۔ دروازہ کھولا تو سامنے اسی جھونپڑپٹی کی ایک عورت کھڑی تھی۔ عمر تیس کے آس پاس — جسم بھرا بھرا۔ جسے میں نے اکثر چاپاکل کے پاس نہاتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ پاتا، وہ خود ہی بول پڑی۔

'کچھ کام ہو تو بولیں بابو جی۔ ہم سب کام جانتے ہیں۔ پانی بھرنے سے لے کر کھانا پکانا، جھاڑو بہارن، برتن دھویل سب کام۔ ڈیم پر کام بند ہے نا بابو جی...... سو ہمرا تو بیگاری ہوگئی۔''

اس کا لہجہ کچھ کچھ اپنے علاقے جیسا تھا۔ بھوجپوری...... میرے شہر سے ہے کیا؟ اس علاقائی تعصب نے فوراً اس سے سوال جڑ دیا۔

''کہاں کی رہنے والی ہو؟''

''ہم بہار سے آئیں ہیں بابو جی۔''

''بہار میں کہاں کی؟''

''بھوجپور۔ سوندیا ہمار گھر ہے بابو جی۔''

سوندیا بھوجپور کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ مجھے مزہ آیا۔ اپنے علاقے کی ہے۔ 'ہم سب

کام جانتے ہیں بابو جی — وہ پھر بولی۔

شاید میرے اتنے سارے سوال کو اس نے میری منظوری سمجھ لی تھی۔ وہ دندناتی ہوئی اندر آئی۔ دو ہی کمرے تھے۔ ایک کچن کم باتھ روم۔ دوسرا میرا بیڈ روم۔ کچن میں ڈھیر سارے گندے برتنوں کو دیکھ کر بولی۔

''بس پٹاپٹ۔ برتنوا سب دھوئے دیتے ہیں۔ ناستے میں کا کھائیں گے بابو جی......''

پھر ہفتوں گذر گئے۔ صبح ہوتی۔ دروازے پر تھاپ پڑتی اور بسمیتا اپنا کام سنبھال لیتی۔

اس دن وہ پھر حاضر تھی مگر عام دنوں کی طرح نہیں۔

بابو جی......

برتن دھو لئے — ؟

ہاں بابو جی......

ناشتہ......؟

وہ بھی بن گئیل بابو جی......

وہ پھر کھڑی رہی۔ عمر کے اتنے گلیمر جھیلنے کے بعد اتنا تو جان ہی گیا تھا کہ ہر خاموشی کے پیچھے کوئی قصہ ہے اور ہر مسکراہٹ کسی نہ کسی وجہ پر آ کر ختم ہوتی ہے......

بابو جی......

پیسے چاہئیں؟

لگا، کوئی تھرتھراتا مکالمہ اس کے ہونٹوں تک آ کر چپ لگا گیا ہے۔ کچھ کہتے کہتے ٹھہری گئی ہے...... لگا، اکے جسم سے میزائلیں چھوٹ رہی ہوں......

●

اس دن وشن محض اس بات پر خفا تھا کہ اپنا ملک میزائلیں کیوں خرید رہا ہے — جو اربوں روپے ان میزائلوں پر خرچ ہوتے ہیں، وہ کس کے ہیں اور پھر خبر کیا ملتی ہے...... فلاں میزائل پھس پھس نکل گئی۔ ایک اور ناکام تجربہ۔ کروڑوں بھوکی انتڑیوں اور سٹے ہوئے پیٹوں والے بھوکے ننگوں کے ملک کو میزائلوں کا کیا کام؟

چھجے پر کھڑے ہو کر سامنے والی جھگیا گنتا ہوں۔ ایک...... دو...... دس...... بارہ......

بیس......پچیس—— آواز لہراتی ہے......

ڈیم بن رہا ہے بابو جی...... ہم تو کموا کی تلاس میں دوڑت رہتے ہیں بابو جی۔ اپنے یہاں بہار میں کام نئی کھے نا۔ سو ہمر امرد ہم کا لے کے ای ہاں چلا آیا۔ آج ہیاں...... کل اوہاں، ہم بھی ماٹی ڈھوتے تھے بابو جی۔ ٹھیکیدار کہلس ہے...... ابھی کام بند ہے۔ بعد میں ہوگا تو بلائے گا۔

''تمہارا مرد کون ہے۔''

وہ مسکرائی تھی۔

اسے پتہ ہے تم یہاں کام کرتی ہو؟

ہاں بابو جی۔ اوکرا کے پتہ نہیں رہے گا۔

اس نے جیسے میرا مذاق اڑایا تھا......

پیچھے سے جھونپڑیوں کو تکتی آنکھیں جب کمرے میں لوٹتی ہیں بسمیتا کے سوا کوئی نہیں ہوتا۔ میز انکلیں بھی نہیں۔ جذبات بھی نہیں...... بسمیتا کی پیٹھ ہوتی ہے۔ ساڑی کے پلو سے جھانکنے والے انگارے ہوتے ہیں اور دیوار پر ٹنگی ہوئی میڈونا کی تصویر ہوتی ہے۔ تصویر ہلتی ہے۔ سرگوشیاں کرتی ہے...... پھر کوئی نہیں ہوتا اپنے آس پاس...... سٹی انتریاں بھی نہیں...... بھوکے پیٹ بھی نہیں......اور ہر خاموشی کے پیچھے کوئی نہ کوئی قصہ ہوتا ہے اور ہر مسکراہٹ......

اور—— دروازے پر بسمیتا کھڑی ہے...... مجھے لگا میری خواہش، میری قد سے بڑھ گئی ہوں...... میرے آدرشوں سے...... میری سوچ سے...... دھت...... کچھ بھی تو نہیں ہوا...... جذبات سے صرف ہم ہی کھیلتے ہیں...... پہنتے جو ہیں۔ پڑھتے جو ہیں...... لکھتے جو ہیں......بسمیتا کے لئے وہ عام دنو جیسا ہی ایک دن تھا۔ اس کا مرد بیمار تھا اور اسے پیسے چاہئے تھے۔

وشن سنتا ہے...... کبھی کبھی اس کی مٹھیاں غصے سے سخت ہو جاتی ہیں۔ گندی سی گالی دیتا ہے......سالے...... ان پونجی پتیوں کے سب سے بڑے دلال تو ہم ہیں...... ذرا سا موقع مل جائے تو......اس نے پھر ایک سڑی ہوئی گالی دی...... لفظ...... صرف لفظ...... جذبات بھی لفظ ہے......جس سے کھیلتے رہتے ہیں ہم...... بچوں کے کھلونوں کی طرح...... کبھی نوچتے ہیں...... کبھی توڑتے ہیں......کبھی جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں...... پھر توڑتے ہیں......

محسوس ہوا، وشن اندر کے آدمی کو ہتھوڑے سے توڑ رہا ہے۔ لکڑے کا آدمی...... یہ بچکانہ فلسفے کیوں پال پوس کر اپنے اندر بڑا کرتے ہیں ہم......

رات، خیالوں کی سیج پر جب کوئی ترقی پسندانہ جذبہ اندر سے سر نکالتا، تب کتنا اجنبی محسوس کرتا خود کو — تب کاغذ پر ناچتی — سنہرے لفظوں سے لکھی گئی کوئی نظم...... کسی فسادزدہ علاقے، دورہ کے بعد چبھتی ہوئی وحشیانہ آنکھیں...... اجڑے مکان...... آنکھوں کے ویرانے پن اور سناٹے میں جیسے پوری تصویر اتری ہوئی۔

لو دیکھو......
مجھے بھی دیکھو......
سنو! میں گوتھنا چاہتا ہوں تمہیں......
ایک ہی بار میں — وہ بھی کچے لفظوں کی گانٹھ سے/
اور سنو —
ایک نہیں، ہزاروں بار گونتھا ہے تمہیں/
اور گانٹھ ٹوٹ گئی ہے۔/
سنو، تمہیں اپنے جذبات سے گوتھنا چاہتا ہوں/
سنو، تمہیں اپنے احساس سے گوتھنا چاہتا ہوں/
مگر سنو —
مجھے جیون کی عام ہلچل میں اپنے ساتھ مت باندھنا/
نہیں چل پاؤں گا میں
میرے ٹھٹھرے ہوئے ہیں ہاتھ......
پیر کھردرے، پتھریلے رستوں پر کبھی نہیں چلے۔
میں نے لکھی ہیں صرف وہی کویتائیں چاند ستاروں کی شکل میں
جو آسمان سے پرتوں کی طرح اترتی تھیں میرے خیالوں میں
اور مجھے لکھنے کی دعوت دی تھی......
سنو...... میں گوتھنا چاہتا ہوں تمہیں......

''کورے جذبات سے زیادہ بھی کچھ رہا ہے تمہارے پاس۔'' وشن ہنستا ہے...... زیادہ تسلی مت دو۔ ایک دن تمہیں ہمیں...... سب کو مل کر اجتماعی خودکشی کرنی پڑے گی...... سچ، اپنے سڑے ہوئے جسم سے ایسی سڑاہن آئے گی کہ......'

میڈونا کی تصویر ہلتی ہے......

بسمیتا ساڑی برابر کرتی ہے......

پوچھتا ہوں — تمہارا مرد جانتا ہے یہ سب؟

وہ ہنستی ہے...... کیسے نہیں جانے گا بابو جی...... اتنے پیسے کہاں سے آتے ہیں ہمرے پاس......''

''پوچھا بھی ہے —''

نہیں۔ پوچھا نہیں۔ ''کبھی کبھی پٹائی کر دیتا ہے جوروں سے۔'' وہ ہنستی ہے...... بس سمجھ جاتی ہوں...... اندر کے مرد نے جور مارا ہے...... مجھے لگا، وہ کہہ رہی ہو...... کشمکش چلتی ہے اس کے اندر بھی۔ خود سے لڑتے لڑتے جب ہار جاتا ہے تو اس کی پٹائی کر دیتا ہے۔ دیکھو...... وہ پیٹھ اور سینے کے آس پاس کے نشانات دکھاتی ہے...... اچھا چلتی ہوں۔ مرد رستہ دیکھتا ہوگا —

پھر وہی چھجہ۔ اس کا مرد بیڑی پیتا ہوا، آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اندر ایک کھینچا تانی چلتی ہے۔ سوچتا ہو، دیوار پر لگی ہوئی میڈونا کی تصویر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں۔ مگر غلط کیا کیا ہے میں نے...... تیس، بتیس — چلو تیس مان لیتے ہیں۔ 30 برس میں ہم ہندستانی، عورت کے بدن اور اس کے گداز کا تصور صرف کتابوں اور خیالوں کے سہارے کرتے ہیں — یا اس سے زیادہ اور کیا جانتے ہیں......؟ اندر پل رہے انقلاب والا آدمی جب گھر آکر میڈونا کی تصویر سے رشتہ جوڑتا ہے تو......؟ روٹی کی آگ سے بھی زیادہ ضروری کی ایک آگ ہے۔ 30 سال گذر جانے کے بعد بھی ہم جسے جسم کے قید خانے میں پناتے رہتے ہیں۔ آگ بھڑکتی ہے تو شرافت کے نام پر اسے سوجانے کو کہتے ہیں...... سوجا...... شریف آدمی...... شادی؟ ایسے لڑکے سے شادی کون کرے گا۔ صحافت کے پیشے میں آنے کے بعد ہی لگا تھا — ماں باپ نے شادی کی ذمے داری اپنے کندھے سے اتار کر اس پر ڈال دی ہو...... اب تم جانو —

لڑائی، باہر کی اور اندر کی — اندر باہر، دونوں کی بھوک شانت ہو، تب تو مشعل اٹھائی جائے — روٹی اور جسم دونوں کی پیاس بجھے، تبھی تو کسی نظریہ پر آکر ٹھہرا جائے۔ بسمیتا کے جسم سے میڈونا کی تصویر کی طرف لوٹتے ہوئے لگتا ہے...... اس نے کوئی غلطی نہیں کی — لیکن......

بوڑھا چھجے سے دیکھ رہا ہے...... کام ختم ہوا یا نہیں...... پتنی آرہی ہے یا نہیں......

میڈونا کی تصویر ہلتی ہے...... اسے لگتا ہے...... وہ پسینے پسینے ہو رہا ہے...... نہیں...... کل

سے وہ منع کردے گا— کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ باہر جا رہا ہے...... ہاں یہ کہنا زیادہ ٹھیک رہے گا......وہ دیکھ لے گی تو......؟ وہ کچھ پیسے ہاتھوں میں رکھ دے گا...... اب ضرورت نہیں ہے...... مت آنا۔ بس اور کیا— ؟

●

نہیں— اور سے زیادہ کچھ ہے۔ باہر کے مسائل، باہر کی ہی میز پر میزائل اور توپ کیوں بنتے ہیں...... گھر آکر پھس پھس کیوں ہو جاتے ہیں اور مشعلیں— اندر پلتا ہوا انقلاب— سب کمرے میں آنے تک، بستر کی ہزار سلوٹوں میں کہاں گم ہو جاتا ہے۔ پھر وہی سوال......

مُردے ہو تم......
اور— بجھی ہوئی ہے تمہارے انقلاب کی مشعل
دیکھو، محسوس کرو، تمہارے اندر آگ لگی ہے۔
جسم کے پور پور میں آگ بھری ہے
اتنا زیادہ اپنے آپ سے مت لڑو
مت لڑو......

خود سے بار بار ہزاروں، بے غیرت قسم کے سوال کرتا کمرہ...... ایسا کیوں ہے وِشن؟ وِشن چپ ہے۔ پاؤں سے زمین کریدتا ہے۔

جینوئن کون ہے وِشن؟ ہم— کیا نہیں؟ خود کے جینوئن ہونے سے انکار ہے کیا۔ ہم بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ سوچتے ہیں۔ پھر— یہ آگ آڑے کیوں آجاتی ہے۔ ایک خاص عمر میں۔ یہ آگ سب کو ڈستی ہے۔ ہمارے جیسوں کو بھی۔ شادی کی عمر نکل جانے کے بعد ہمیں ہی ڈراتی رہتی ہے۔ مذاق اڑاتی ہے...... کرلو شادی۔ گدھے ہو۔ اب کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

وِشن کے چہرے پر گہری لکیریں ہیں...... نو۔ میں پھر کہتا ہوں...... ایک دن، ہم تم سب خودکشی کرلیں گے...... کیوں؟ ہم تم سب گٹر کے ڈھیر میں پڑے ہوئے بورژوا ہیں بس— خودکشی بزدل لوگ کرتے ہیں نا...... ایک دن سب احساس کی سطح پر اتنے طاقت ور ہو جائیں گے

کہ......

☆☆

سناٹا۔ گہرا سناٹا۔ زندگی کے اتنے پڑاؤ پار کرنے پر بھی سچ مچ کی زندگی سے اتنا سا بھی واسطہ نہیں ہے کیوں؟ وقت کتنی جلد اپنے احساس کو بوڑھا اور اپاہج بنا دیتا ہے۔

اس دن بسمیتا اداس تھی۔

بابو جی...... میں جا رہی ہوں...... ڈیم پر کام لگ گیا ہے نا...... اس لئے......

کنٹریکٹر پیسہ لے کر بھاگ گیا بابو جی......

پھر تم لوگوں کا کیا ہوگا___

یہ جگہ چھوڑ دیں گے___ ہمارا مرد کام ڈھونڈ رہا ہے۔

لگا، بسمیتا کا جسم دیمک کا گھر بن گیا ہو...... باس آنے لگی ہو جسم سے

'سنو۔ میں اپنا کام کرلوں گا___ کچی سی مسکراہٹ___ فل ٹائم بیچلر ہوں۔ یوں بھی زندگی بھر اکیلے ہی تو کام کرنا ہے مجھے سمجھ رہی ہو نا تم...... برتن بھی دھولوں گا، سب ایک ادھار لی گئی مسکراہٹ...... اور...... لگا تھا، بسمیتا کے جانے کے بعد کچھ ٹوٹے گا ضرور۔ ہاں، وشن کے چہرے پر ایک قاتل مسکراہٹ دیکھ رہا تھا......

پھر کئی دن گزر گئے۔ جھگیاں ویسی ہی رہیں۔ شام میں ہر روز دفتر لوٹتے ہوئے لگتا...... آج جھگی نہیں ملے گی۔ سب لوٹ چکے ہوں گے...... نہیں بھی لوٹے ہوں تو۔ مجھے کیا۔ لیکن لگتا ہے اندر ایک اداسی سی پسری جا رہی ہو۔

ایک دن بسمیتا کو ٹوکا بھی تھا۔

''کام نہیں ہے تو تم لوگ بہار لوٹ کیوں نہیں جاتے؟''

وہ جیسے اس سوال سے دکھ گئی ہو___ وہاں سے تو ای ہاں آئے ہیں بابو جی...... کام کی تلاش میں۔ سب کچھ چھوڑ کر___

محسوس ہوا، جسے ایک گندی گالی بکی ہو۔ بسمیتا نے...... میں کون سا الگ ہوں ان سے___ کیا میں جا سکتا ہوں۔ لوٹ کر واپس بہار___ اپنے وطن...... وہاں اکھڑے اکھڑے سے سوال منتظر ہوں گے، شرما کے شرمائے سے جواب سننے کو___ ہم بس پیدا ہو جاتے ہیں، بے حیا پودوں کی طرح___ کہیں بھی، پیدا ہو جاتے ہیں کسی بوجھ کی طرح۔ ہم جلتی ہوئی گرمی میں،

دھوپ کے سائے میں۔ تپتی ہوئی سڑک پر بھی سو جاتے ہیں...... کہ ہمیں زندگی کی طرف جاتے ہوئے کسی راستے کا کوئی علم نہیں ہوتا...... پھر ہمارے ہاتھ پاؤں بڑے ہوتے ہیں اور ہم سے کہا جاتا ہے۔ محبت کرو...... رزق تلاش کرو...... اور ہم گھر بار سب کچھ چھوڑ کر نکل جاتے ہیں......

پھر شام ہو جاتی ہے......

پھر شام ڈھل جاتی ہے......

'پھر؟'

وشن میری طرف دیکھتا ہے___

ہم سے پوچھو۔ کیا ہم واپس گھر لوٹ سکتے ہیں۔ وہ بھی نہیں گئے۔ بس جھونپڑی بدل گئی، یہاں وقت نہیں کمرے بدلتے ہیں___ جھونپڑی بدلتی ہے اور جھونپڑی اُجڑ گئی۔ جھونپڑی بدل گئی___ جانے سے پہلے ایک دن اس نے مجھ سے سو روپے مانگے۔ گھر پر چولہا جلانے کے لئے بھی کچھ نہیں تھا اور دوسری شام۔ کہانی ختم ہو گئی۔ میں دفتر سے لوٹا تو جھگی اجڑ چکی تھی۔ کوئی نہیں تھا۔ کچھ جھگیاں باقی تھیں، جو سمیٹی جا رہی تھیں۔ بس کہانی ختم ہو گئی۔ یہ کہانیاں ایسے ہی شروع ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں......

نہیں___

پہلی بار دیکھا، وشن کے چہرے پر وحشت کی ہزاروں آنکھیں ابل پڑی ہیں۔ اچانک بڑھ کر اس نے میری ہتھیلیاں تھام لیں...... سنو، ہم سب وقت کا استعمال ہیں بس___

میرا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ بالکنی تک لے آیا...... وہاں سامنے دور تک ایک خالی پن تھا...... جہاں کل تک جھگیاں ہوا کرتی تھیں...... 'دیکھو...... سب کچھ صاف...... کہانی ختم ہو گئی...... کہانی میں تھا ہی کیا...... اس خالی پن میں ہوتا بھی کیا جو کہانی بنتا۔ وہ بھی اپنے وطن سے منہ چھپائے پھرتے ہیں اور تم بھی...... تم اس سے زیادہ کماتے ہو...... تم نے سو روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور کہانی ختم۔ بھول گئے___'

وشن کی آنکھوں میں ڈھیر سارا خون سمٹ آیا___ یاد ہے ایک بار تم نے ایک انوکھے لفظ کو اپنی زبان سے صدا دی تھی۔ استعمال___ تم ہر چیز کا استعمال ڈھونڈتے ہو نا...... اور بغیر استعمال والی چیز تمہیں بے مصرف، بے معنی لگتی ہے...... کیوں؟ تم جاننا چاہتے ہو نا...... کہ ان جیسوں کا استعمال کیا ہے...... یہ...... جو تمہاری حقارت، نفرت اور غصہ سے جنمے ہیں...... جو نہ ہوں تو تمہارا

وجود نہ ہو۔ ہاں تمہارا وجود...... جو بس ان کے ہی سہارے ٹکا ہے۔ ان جیسوں کے ــــ تم روتے ہو، ہنستے ہو، گندگی کرتے ہو۔ سامانوں کا بوجھ بڑھاتے ہو۔ ہر جگہ تم ان کی مدد پر ٹکے ہو۔ یہ نہ ہوں تو تم جیسوں کے کام دھندے رک جائیں۔ ہاں۔ یہ عورت ان میں سے ہی ایک ہے۔ جس نے سمجھا کہ تم اسی کے گاؤں کے ہو...... وہ تمہارا کھانا بھی گرماتی تھی اور ضرورت پڑنے پر تمہیں بھی ــــ تم یقین کرو گے۔ اسے اپنا استعمال معلوم تھا۔ استعمال کہ وہ۔ تمہیں خوش کر رہی ہے...... ایک استعمال اور بھی تھا کہ اس کے بنائے کھانے تمہارے جسم میں جاتے تھے اور اس کے بدن کی گرمی تمہارے اندر کے انٹلکچو ل کو ذہنی طور پر تندرست رکھتی تھی۔ اس لئے کہ۔ ساری غلاظت اس کے بدن میں انڈیل کر تمہارے سو کالڈ قلم کو سوچنے اور لکھنے کا وقت مل جاتا تھا ــــ

وشن نے گھوم کر میری طرف دیکھا ــــ مگر میرے جینئس فرینڈ۔ تمہارا استعمال کیا ہے۔ تم لکھتے ہو۔ ہے نا؟ زمانے میں سدھار کرتے ہو۔ غریبوں کی لڑائی لڑتے ہو۔ بکتے ہو تم۔ فراڈ ہو تم سب۔ صرف اپنی آتما خوش کرتے ہو تم۔ غریبی کاغذ پر اتارتے ہوئے اچھا لگتا ہے تمہیں لیکن آج تک کبھی کوئی لڑائی نہیں لڑی تم نے اور تم لڑنے کے لائق بھی نہیں ہو ــــ'

اچانک وہ ٹھہرا۔ ٹھنڈی سانس بھری۔ میری آنکھوں میں جھانکا ــــ 'سب کچھ جائز ہے ہمارے لیے کہ ہم اس عہد کے دانشور ہیں......'

اس نے ایک ٹھہاکا لگایا ــــ مارو گولی یار۔ آؤ میرا ہاتھ تھام لو۔ میں نے کہا تھا...... ہم تم سب ایک دن خودکشی کرلیں گے۔ سچ اپنے سڑے ہوئے جسم سے اتنی سڑن آئے گی کہ...... آؤ خودکشی کرلیں۔ سمجھو یہ گہرا دریا ہے اور ہم کود رہے ہیں...... آ...... آ...... لو کود گئے......

اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ آنکھیں بند کیں اور جیسے خیالی دریا میں چھلانگ لگا دیا۔

پھر خود ہی ہنسا ــــ دھت۔ ہم ڈھنگ سے مر بھی نہیں سکتے ــــ

(1985)—

●❖●

فساد کے بعد کی ایک لنچ پارٹی

وہ ایکیوریم کے قریب آ کر ٹھہر گیا تھا۔ شیشے کے اندر ایک عجیب و غریب دنیا روشن تھی۔ پانی، جلتے بجھتے قمقموں کی طرح روشنی کی بارش کر رہے تھے۔ اور ان کے درمیان سونے کی طرح جھلمل کرتی مچھلیاں، اپنے رقص سے ماضی کے سارے قصے بھلانے میں اس کی مدد کر رہی تھیں۔ اُس نے غور سے دیکھا...... ایکیوریم کی بلواہی زمین پر ایک ٹی فش ساکت تھی۔ خاموش مردہ حالت میں۔ ہلتی ڈولتی ناچتی مچھلیوں کے درمیان 'بلواہی' ریت کے چمکتے پتھروں کے پاس بے دم——

'مر گئی ہے؟'

'نہیں مری نہیں ہے،'

'نہیں—— مر گئی ہے۔'

'نہیں ناٹک کر رہی ہے...... ابھی اٹھے گی۔ دوسری مچھلیوں کے ساتھ —— پھر شروع ہو جائے گا رقص۔'

''میری بلا سے'' ...... اُسے مچھلیوں پر ناراضگی تھی...... ''میری بلا سے...... مر گئی تو میں کیا کروں۔ چھو کر دیکھ...... اے...... ایک...... دو...... تین......''

وہ آہستہ آہستہ اپنی انگلیاں ایکیوریم کے شیشے کی طرف بڑھا رہا ہے......

کنارے دائیں طرف کونے میں کل ملا کر چار لوگ کھڑے تھے۔ ہاتھ میں شراب کے گلاس تھے۔ ان میں سے ایک کی نظر ایکیوریم کی طرف چلی گئی۔ اس نے باقی کو اشارہ کیا۔

'دیکھ...... دیکھ...... وہ کیا کر رہا ہے۔'

'بیچاری مچھلیاں۔'

'مچھلیاں نہیں۔ اُسے...... اُسے دیکھ......'

''اوہ...... ہاؤ رومانٹک......''

''—— رومانٹک؟''

—— ہاں......

—— تمہیں ہر چیز میں رومانس دکھتا ہے——؟

—— رومانس ہوتا ہی ایسا ہے......

—— لیکن اس میں رومانٹک جیسا کیا ہے؟

—— دیکھ اس کی آنکھوں میں، اُف...... ایک نہیں ختم ہونے والی جستجو۔ اور جستجو کس شئے کے لیے ہے، وہ تمہارے سامنے ہے—— باریک شیشے کے محل میں ناچتی ڈولتی جل پریاں...... ہاؤ رومانٹک۔

'—— یہ جل پریاں نہیں ہیں۔'

—— وہی تو، جل پریاں نہیں ہیں، ہوتی بھی تو...... مجھے فیوژن پسند نہیں ہے۔ دو چیزوں کو ملا کر ایک ریمپ پیش کر دینا۔ یہ مچھلیاں ہیں...... شیشے کے محلوں میں بے نیازی سے ناچنے والی...... ایک سپنیلی دنیا—— سپنلا آئی لینڈ......

—— لیکن اسے تو دیکھ......

—— دیکھنے کی چیز وہی ہے—— یعنی وہ، کس طرح سے اُسے چھونے یا دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُس کی باڈی لینگویج دیکھی؟ دیکھ...... اس کی آنکھیں چھوٹی ہیں—— بدن میں لوچ ہے—— ہاتھ میں چھو لینے کی جستجو کے ساتھ پیشینس یعنی صبر بھی ہے...... اور پاؤں میں...... جیسے گھنگھرو باندھ دو—— صرف کویل کے چہچہانے کا سُر ابھرے......

—— لیکن گھنگرو میں تو......

—— ایک ہی بات ہے......

—— نہیں ایک بات نہیں...... دیکھو...... اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا ہے۔

—— میں کہتا ہوں وہ پھر ہاتھ آگے بڑھائے گا......

—— میں کہتا ہوں......

—— شرط لگا لو......

— لگ گئی......

— کتنے کی شرط......

— جام خالی ہو رہا ہے

— بات مت پلٹو......

— لگ گئی شرط

— نہیں شرط نہیں...... کہیں تم نے کچھ ایسا ویسا مانگ لیا تو......

— مثلاً؟

— شبنم کو،

'شبنم' وہ جو دنگے میں ملی تھی۔ دانی لمڈا کے ایک گھر میں۔ بے سہارا...... اوہ شٹ۔ اُس کے بدن کا ایک ایک گداز یاد ہے — اُس کے گھر کے سارے لوگ...... ' وہ ہنس رہا تھا — اوپر چلے گئے تھے۔ پھر شاید تم اُسے گھر لے گئے تھے — داسی بنانے یا...... لیکن وہ ہے مزیدار خیر...... لیکن تم بھلا شبنم کو کیوں دو گے؟'

— نہیں شبنم نہیں —

— شبنم کو نہیں مانگوں گا......

مت مانگو۔ یو ڈرٹی فول

— مثلاً...... وہ...... وہ جو تمہارا انکلیو بن رہا ہے، اُس میں سے......

— طے رہا، یہ بھی نہیں مانگوں گا......

— مثلاً؟

— مثلاً یہ کہوں کہ وقت آنے پر۔

— چوتیے...... سالے......

ان میں سے ایک نے زور سے گلاس زمین پر دے مارا۔ باقی نے روکنے کی کوشش کی — نو...... نو...... نو...... مسٹر......

چھناک کی آواز کے ساتھ بھی کہیں کچھ نہیں بدلا تھا۔ منظر بالکل ویسا ہی تھا جیسا پہلے تھا۔ پارٹی میں کافی لوگ تھے، سب اپنے آپ میں مصروف، جیسے گلاس سے ہونے والے دھماکے، شیشے کی کرچیوں کے بکھرنے کی کسی کو بھی ذرا بھی پروا نہیں ہو — کسی نے بھی اُس طرف پلٹ کر

نہیں دیکھا۔

ہوووہوہووو

چاروں اب ہنس رہے تھے......

ایکیوریم کے پاس کھڑے چاروں اب دونوں پیر سکوڑ کر کسی فکر میں ڈوب گئے تھے۔

— دیکھ...... دیکھ اس کو......

ہوووہوہووو

— ارے یہ تو وہی بات ہوئی، ناچت ناپٹ — سکہ کھڑا ہو گیا۔

— لیکن تُو اتنا غصہ کیوں ہوا......

— کیوں نہیں، سالے اچھا بھلا موڈ خراب کر دیا۔

— تو شبنم کیوں نہیں مانگ سکتا تھا؟ کیوں...... ارے کیا وہ بس میری ہے...... اُسے تو......

— ہاں اُسے تو......

دوسرے نے لمبی سانس بھری۔

— اور سالے تو اِس انکلیو میں...... ایک چھوٹی سی جگہ...... کیا وہ صرف اس لیے میری ہے کہ میں نے اُسے — وہ 'لوٹا ہے' کہتے کہتے ٹھہر گیا تھا۔ وہ کیا غالبؔ کا شعر ہے......

— غالبؔ کا نہیں، میر کا......

— ابے سالے میرؔ کا نہیں، بہادر شاہ ظفرؔ کا...... اس نے پڑھ کر بتایا......

کتنا ہے بد نصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

— کیا شعر ہے یار...... جب سنتا ہوں جھوم جاتا ہوں، لیکن...... سالا مجھے تیری اسی بات پر غصہ آیا، کیا وہ زمین میری ہے۔

— نہیں

— اس کی ہے؟

— نہیں......

— پھر؟ کس کی ہے سب کو پتہ ہے — پھر تو ایک زمین کا ٹکڑا کیوں نہیں مانگ سکتا

تھا۔

— غلطی ہوگئی......

— نہیں غلطی نہیں ہوئی۔ کیوں کہ ابھی بھی آپ اُس بچکانی ذہنیت سے باہر نہیں نکلے ہیں، جس میں ہمارے رنگ...... ہماری چیزیں...... یعنی اتنا تو آپ سب کو سمجھنا ہی چاہئے کہ وہ سب......اوراس سے زیادہ میں کیا کہوں۔

پارٹی سے اُس کو کوئی بہت زیادہ غرض نہیں تھی۔ ایسی پارٹیاں اُس نے بہت دیکھی تھیں۔ یا کہا جا سکتا ہے، اس سے بھی اچھی پارٹیوں کے کتنے ہی قصّے نہ صرف اس نے سنے تھے، بلکہ دیکھے بھی تھے۔ خاص کر جنگ کے خاتمہ کے بعد جشن منانے کے طور پر دی جانے والی پارٹیاں— میجر جنرل، بڑے عہدے، سیاست سے متعلق گفتگوؤں سے پرہیز کرتے فوجیوں کی بیویاں— آپس میں ہنسی مذاق کرتیں— ایک بار ایسی ہی کسی پارٹی کے لیے اُسے کینٹین کا انتظام دیکھنے کے لیے کہا گیا تھا۔

'لیکن یہ پارٹی تو......'

'جنگ اور فساد......'

''نہیں اُسے کچھ بھی نہیں سوچنا ہے۔— سوچنے سے دماغ کی رگیں تن جاتی ہیں...... دماغ پھٹنے لگتا ہے،'' ''گھر جانا ہے......''

ستار نے ٹھان لیا تھا۔ گھر جانا ہے......گھر...... اُسے گھر جانے سے کوئی روک نہیں سکتا اور کوئی روکے گا بھی کیوں؟

''مزا آیا؟''

کٹو نانگدیو پوچھ رہے تھے—

''ہوں......ہوں......ہوں......''

''کیوں دل لگا کہ نہیں ستار......؟''

''کیوں نہیں لگے گا، چھپ چھپ کر ہماری عورتوں کو دیکھ رہا تھا...... کیوں بے......''

ستیش پانڈیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی......

''ہوں...... ہوں......''

''تو کیاارادہ ہے اب......''

''گھر جاؤں گا......''

''کیوں......''

''گھر جاؤں گا...... اس کے ہونٹوں پر طفلانہ مسکراہٹ تھی، آپ جانے دیں گے نا......؟''

''ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں......''

''میں گھر جاؤں گا......''

اُس نے تیسری بار کہا۔

''ہاں...... ہم کہاں روک رہے ہیں ستار۔ چلے جانا، مگر ابھی...... تم سمجھ رہے ہو نا......''
کسی پاگل بچّے کی طرح سُنی ان سنی کرتے ہوئے ایک بار پھر وہی پرانا ٹیپ چل گیا تھا......

''مجھے گھر جانا ہے، آپ جانے دیں گے نا......''

وہ ایک بار پھر ایکیوریم کے قریب آ کر ٹھہر گیا جہاں اندر کی 'بلواہی' زمین پر وہ ٹنی فش مردہ حالت میں پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک ٹک ٹنی فش پر ٹک گئی تھیں۔ ہلتی، ڈولتی، ناچتی دوسری مچھلیوں کے کھیل میں اب اس کی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

●❖●

فیصلہ

میں اُسے تین چار دنوں سے دیکھ رہی تھی۔ کب، کہاں ...... شاید یہ سب سلسلہ وار بتا پانا میرے لیے ممکن نہیں ہے یا پھر آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں ایک ایسے نفسیاتی خوف کا شکار ہوں، جس کی وجہ سے کچھ بھی بتا پانے میں قاصر ہوں۔ راتوں کو اچانک انجانے خوف سے میری آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ پھر لگتا ہے کسی اجنبی سڑک یا بس میں ہوں۔ پھر لگتا ہے پولس کی ایک وین میرے سامنے یا بس کے آگے آکر رکتی ہے۔ چاروں طرف پولس والے پوزیشن لیے ...... پھر سڑک پر گول گول دائروں کے درمیان پڑی ایک خون سے سنی ہوئی لاش — ان کاؤنٹر یا فرضی مڈبھیڑ کی ایک کہانی۔ عہدے اور ترقی کا خواب دیکھنے والے اپنی بہادری کی رپورٹ حکومت تک پہنچانے میں مصروف ......

نہیں، شاید اب یہ سب آپ کو بتانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں رہتی ہوں۔ میں اسی قوم کی ایک اقلیت لڑکی ہوں، اعداد شمار کے مطابق، جنہیں اب 20-25 کروڑ سے کم شمار کرنا ایک بھول ہی کہی جا سکتی ہے۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ ہمارے رہنماؤں، سیاسی لیڈروں نے اتنی بڑی آبادی، جو کسی ملک کی آبادی سے بھی زیادہ ہے، ہوتے ہوئے بھی ہمیں اقلیت ہونے کی ذہنیت میں کیوں قید کر رکھا ہے — جانے دیجیے، میں سیاسی کھیلوں کے اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتی۔ میں تو صرف اس خواب کی طرف آنا چاہتی ہوں، جس نے مجھے یکایک چونکا دیا تھا۔

سفید، میلے کرتے پائجامے میں۔ چپل ٹوٹی ہوئی۔ آنکھوں پر ایک بے حد پرانے قسم کا چشمہ — آنکھیں ایسی کہ خطرناک نظر آنے والے گدھوں کی آنکھوں میں بھی وہ چمک نہ ہو۔ مگر

اس وقت اس چمک کی جگہ ایک گہری سنجیدگی نے لے لیا تھا۔

وہ میرے کمرے میں تھا لکھنے والی میز پر۔ میری اجازت کے بغیر۔ کاغذ بکھرے پڑے تھے۔ سگریٹ پی پی کر اس نے اپنے دانت سیاہ، اور انگلیوں کو زرد کر لیا تھا۔ بال بکھرے تھے، جس میں کنگھا کرنے کی ضرورت اس نے بالکل بھی محسوس نہ کی تھی۔

میں اسے گذشتہ تین دن سے دیکھ رہی تھی۔ پہلے دن تو میں ڈر ہی گئی تھی۔ میرے کمرے میں ایک مرد...... میں نے ڈر کر تھوڑا کانپتے ہوئے پوچھا تھا۔

'کون ہو تم......؟'

'آہ......! مسٹیک ہو گیا' وہ بہت آہستہ سے بولا۔

'کیا لکھ رہے ہو......'

اس نے میری طرف نگاہ مرکوز کی — 'کچھ لکھنا چاہتا ہوں، مگر...... میرے لفظ کھو گئے ہیں۔ یاد ہے ایک زمانہ تھا جب میں ہر دن آرام سے ایک کہانی لکھ دیتا تھا۔'

'بنو مت۔ ہر دن ایک کہانی — ایسا صرف ایک مہینے ہی ہوا تمہارے ساتھ۔ سگریٹ اور شراب کے پیسے نہیں ہوتے تھے تمہارے پاس۔ تم ایک کہانی لکھتے تھے۔ میگزین کے مدیر کو دیتے تھے۔ اور پیسہ لے کر شراب کی ایک بوتل لے آتے تھے۔ تم...... تمہیں تو اپنی پیاری بیوی کی بھی کوئی فکر نہیں تھی......'

لیکن شاید جیسے اس نے میرا سوال سنا ہی نہیں۔ وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا...... 'میرے پاس لفظ ہی لفظ تھے۔ تب بھی جب ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھیک نومینس لینڈ پر اپنی آنکھیں بند کرنے والا تھا...... اور...... وہ بھیانک ٹھنڈا گوشت'...... شاید مجھے سب کچھ یاد رہا ہے...... وہ قیامت کی دوپہر...... جب ڈاکٹر کی آواز پر وہ لڑکی اپنی شلوار کا ازار بند' کھولنے لگی تھی۔ نہیں تب بھی میرے پاس لفظ تھے......

'اور اب......'

لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ غائب تھا......

میں اس رات اس ڈراؤنے خواب سے بری طرح چونک گئی تھی۔

●

چلئے اپنا نام بھی بتا دیتی ہوں۔ کوثر بی یا جو بھی نام آپ کو پسند ہو— آپ خود کیوں نہیں رکھ لیتے میرا کوئی اچھا سا نام— میں پیدا ہوئی تب بھی باہر شعلے بھڑک رہے تھے...... بڑی ہوئی تو یہ شعلے تب بھی رہ رہ کر بھڑک جاتے۔ باہر کی وحشت اور دہشت کے گھنگھرو کچھ اتنے بے سرے تھے کہ بچپن میں ہی کتابیں دوست بن گئیں اور کتابوں کو پڑھتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی اس بڑی بڑی خطرناک آنکھوں والے منٹو سے میری دوستی ہوگئی— مگر میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ دبلا پتلا بیمار سا دیکھنے والا ادیب کبھی اس طرح میرے اور میرے خواب کے درمیان بھی آسکتا ہے۔

نہیں، اس دن کا حوالہ دینا ضروری ہے۔ شہر میں ایک بار پھر دہشت کے گدھ منڈرا رہے تھے— اقلیتوں کے محلے میں پولس جیپوں کی آمدورفت بڑھ گئی تھی۔ دو تین سال قبل ہونے والے حادثے لوگوں کو اب بھی یاد تھے۔ حادثے، شکل بدل کر ایک بار پھر زندہ تھے۔ میں کوئی صحافی نہیں اور وہ سب تو آپ ٹی وی پر چینلوں پر دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ بس مجھے اتنا یاد ہے، اس صبح تیز بارش ہوئی تھی— ہم سہمے ہوئے گھر میں نظر بند تھے— اپنے ہی گھر میں پرائے ہونے کا احساس کیسا ہوتا ہے، آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اس دن شام کو کھانا ہم لوگوں نے جلدی کھا لیا تھا۔ ٹی وی پر فرضی مٹھ بھیڑوں کی کہانیوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی— اس لیے سب سونے چلے گئے تھے۔ میں کمرے میں آگئی...... کھڑکی بند کی اور بستر پر خاموش سی لیٹ گئی۔

نہیں، آہ! اس بھیانک خواب کے لیے میں آپ سے معافی چاہتی ہوں۔ لیکن اس رات منٹو ایک بار پھر میرے کمرے میں تھا۔ اور یہ کوئی میری آنکھوں کا وہم نہیں تھا۔

'چلو باہر گھومنے چلتے ہیں......'

'پاگل ہو...... باہر...... کرفیو جیسا سناٹا ہے۔'

'جانتا ہوں۔ ماحول اچھا نہیں......'

'پھر پولس پکڑ لے گی۔'

'پکڑے گی نہیں— ' وہ ہنس رہا تھا— 'ان کاؤنٹر کر دے گی......'

'سب جانتے ہو تم...... پھر بھی باہر گھومنے، سیر کرنے کی بات......'

وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا...... 'کچھ نہیں ہوگا۔ میل دو میل کا چکر لگا کر واپس آجائیں گے......'

'میل۔دو میل...... پیدل؟'

'شی......ایک گاڑی لے آیا ہوں۔ چرا کر......' وہ ہنس رہا تھا۔ یہ بات کم لوگ جانتے ہیں کہ میں نے قائداعظم محمد علی جناح کے لیے بھی ڈرائیونگ کی تھی۔'

'جانتی ہوں اوران کی گاڑی کو ٹکر دے ماری تھی......'

منٹو ہنس رہا تھا۔ 'فکر مت کرو۔اس بار احتیاط سے چلاؤں گا۔'

میں نے گھڑی دیکھی ۔ رات کے تین بج چکے تھے۔ سڑک ویران تھی۔ میں نے کھڑکی کھولی...... زمین اب بھی گیلی تھی۔ پتہ نہیں بیالیس ۔ تینتالیس سال کے اس ڈبلے پتلے ادیب میں، وہ کیسی کشش تھی کہ میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ بارش سے بھیگی سڑک، کتوں کے بھونکنے اور رونے کی آوازیں...... ہم گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی تیز بھاگ کھڑی ہوئی...... تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر اونگھتی پولس جیپیں لیکن منٹو اپنے خیالوں میں گم تھا— وہ جیسے شہر اور شہر کی اس ویرانی کو اپنی آنکھوں میں بھر لینا چاہتا تھا...... دو ایک جگہ پولس نے کچھ روک کر کچھ سوال کئے۔ منٹو نے ہنس کر کیا جواب دیئے میں نہیں جانتی۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ اندھیرے میں، اس نے اپنی پیشانی پر چندن کا ٹیکہ ڈال رکھا تھا۔ میرے اندر کے خوف کو دیکھ کر وہ ہنس پڑا—

'میں نے کہا تھا نا' کچھ نہیں ہوگا......بس کچھ اور دور......'

ہم چار پانچ کلومیٹر سے زیادہ دور چل چکے تھے۔اس بار منٹو نے گاڑی جس سڑک کی طرف موڑی کہ اچانک میں چلاّ پڑی— 'کہاں جا رہے ہو تم......'

'شی......' اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی— تاریخ اتنی جلد نہیں مرتی۔ کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ بس چلتی چلو۔' میں کہنا چاہتی تھی کہ تاریخ تو کبھی نہیں مرتی مگر جانے کیا سوچ کر میں خاموش رہی۔

اب چار بج چکے تھے۔ ہم اقلیتوں کی ایک غریب بستی میں تھے۔ جہاں گھوڑے والے اور روزانہ مزدوری کرنے والے مزدوروں کے چھوٹے کچے پکے مٹی کے گھر بنے ہوئے تھے۔ کتے اب بھی بھونک رہے تھے۔ ان گھروں میں کچھ کی صبح ہو چکی تھی۔ کچھ گھروں میں چولہے سلگ گئے تھے۔ ایک دو گھروں کے آگے کچھ بچے بھی نظر آئے...... عورتیں جھونپڑوں کے اندر باہر کرتی نظر آئیں...... اور اچانک وہ حادثہ ہو گیا تھا...... ایک بھیانک حادثہ— گاڑی کے آگے

اچانک آ گئے تھے — ایک چھوٹا سا، اقلیت کا بچہ اور ایک گائے کا چھوٹا سا بچھڑا — بےفکری میں گاڑی چلاتے منٹو کے لیے ایک سیکنڈ میں فیصلہ لینے کا وقت تھا۔

'نہیں — ' آپ چاہیں تو کہانی یہاں چھوڑ سکتے ہیں۔ میں آگے اسے پڑھنے کے لیے نہیں کہوں گی...... کیونکہ آگے جو کچھ آپ پڑھیں گے، وہ غیر اخلاقی' انسانیت سوز' اذیت ناک اور بے حد تکلیف دہ ہے — انسانی حقوق کے خلاف بھی ہے — آخری کچھ سکنڈ میں میں نے زوروں سے اپنی آنکھیں بھینچتے ہوئے گائے کو اچھل کر بھاگتے ہوئے دیکھا تھا...... منٹو نے گاڑی اس اقلیت بچے کی طرف — نہیں۔ میں پھر کہتی ہوں، مہربانی کر کے اس لمحہ بولے گئے بے رحم اور سفاک مکالمے کو آپ اس کہانی سے خارج کر سکتے ہیں۔

ہم واپس گھر پہنچ چکے تھے۔ منٹو کھڑکی کی سلاخوں کے پاس تھا۔ اس کے چشمے پر دھول جم گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

'تم اس بچے کو بچا سکتے تھے......' میں زور سے چیخی۔

'گائے اور بچے میں سے ایک'...... شاید مجھ سے کہیں زیادہ شدت سے منٹو چیخا تھا — ' ایک اقلیت بچے کا حادثہ دو گھنٹے میں بھلا دیا جائے گا۔ اس بستی میں گائے کے بچھڑے کا مرنا جانتی ہو......؟'

منٹو پلٹا — میز پر بکھرے کاغذوں کے چیتھڑے کر کے اس ڈسٹ بین میں ڈال دیئے۔

منٹو غائب تھا...... لیکن وہ کرسی جس پر ابھی کچھ لمحہ قبل وہ بیٹھا تھا، وہ ابھی بھی ہل رہی تھی۔

●✣●

سیاہ حاشیے

دہشت کا سبب تہذیبی ہے۔ وہ انسان ثابت ہونے سے ڈرتا ہے، اور آخر احمق ہی ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ اتنی اچھی کارکردگی نہیں دکھا پاتا جتنی اس کی جارح مردانگی اس سے تقاضا کرتی ہے۔ اس مفہوم میں ہم سب نامرد ہیں، اور اپنے احترامِ ذات کو سلامت رکھتے ہوئے اس صورتِ حال سے باہر آنا صرف کسی عورت کی ہمدردی کی بدولت ممکن ہوتا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں۔ یہ محبت کو ایک خاص طلسم کا حامل بنا دیتی ہے، کیونکہ ہر بار پہلی بار کی مانند ہے، اور ہر مرد وزن کو ہر بار نئے سرے سے، پہلی بار کی طرح، آغاز کرنا پڑتا ہے—

— گابرئیل گارسیا مارکیز

الفتح لنا... الفتح لنا...

دجلہ اور فرات ـــــ کتنی صدیوں نے، کتنے یگوں نے
یہاں اپنے ماضی اور تہذیب کا عکس دیکھا ہے ـــــ؟
ایک عمارت بھرَبھرا کر گرتی ہے۔ ایک بازار ـــــ ایک
گھر ـــــ ایک لڑکی، جو ایک لڑکے سے محبت کرتی ہے اور
ایک بچہ ـــــ بچے کی صرف ایک خواہش ہے، وہ اپنے
بڑے بھائی کے کنچوں (شیشے کی گولیاں) سے کھیلے...
''ـــــ امریکی فوج بم، گولوں کی برسات کر رہے ہیں۔''
(ارون دھتی رائے کے ایک مضمون سے)

گول گول کنچے کی گولیاں۔ کنچے کی گولیاں نہیں ہیں۔ بھائی نے چھپا دیا ہے۔ نہیں، بھائی ساتھ لے کر گیا ہے۔ بھائی کو ماموں لے گئے۔

'غازی بچہ ہے۔ میرے ساتھ جنگ کرے گا......'

'کس کے لئے؟'

'کافروں کے خلاف۔ امریکہ کے خلاف......'

بچہ صرف سات سال کا ہے۔ بچہ اندھیرے میں کنچے ڈھونڈھ رہا ہے۔ یہیں تو تھے...... بھائی یہیں رکھتا تھا۔ کبھی کبھی تکیے کے نیچے۔ الماری کے دائیں طرف...... وہاں، سوراخ میں بھی رکھ دیتا تھا۔ کنچا نہیں مل رہا ہے

شہر گھپ اندھیرے میں ہے۔ اماں حسنہ عبداللہ بھاگ کر اندھیرے میں باہر

جاتی ہے۔ پھر واپس آتی ہے۔ کبھی کبھی اپنی زبان میں بڑبڑاتی ہے ___ بالروح وبالدم۔ فدیناک یاصدام ___ 'جیسے آتش بازیاں چھوٹتی ہیں تیز دھماکے، آسمان پر مسلسل دھماکے کے ساتھ روشنیوں کی آنکھ مچولی۔ آنکھیں، کان، دل، دماغ...... جسم جیسے ہر طرح کے خطرے، اندیشے کو اندر ہی اندر Defuse کر چکا ہے۔ پھر دھماکہ...... مسلسل ___ آسمان پر ایک کے بعد ایک دھماکے ___ بچہ کنچے ڈھونڈ رہا ہے......

'اماں...... اماں......'

عورت گھبرائی سی اندر آتی ہے......

'کنچے......'

عورت خبر لائی ہے...... ہوائی اڈہ امریکی فوجیوں کے ہاتھ چلا گیا۔ اسٹریجٹی بدل گئی ہے ___ آپریشن عراقی فریڈم اپنے آخری مرحلے میں ہے۔ بصرہ کے بعد اب بغداد بھی ان کے قبضے میں ہے۔ ریڈیو اور سیٹلائٹ چینلوں پر ان کے قبضے ہو چکے ہیں۔ ریپبلکن گارڈ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ فوجی اب بغداد کے رہائشی علاقوں پر بم باری کر رہے ہیں۔ تیس ہزار سے بھی زائد عراقیوں کے ہلاک ہونے کی خبر آچکی ہے ___

'اماں...... کنچہ......'

'بچہ رو رہا ہے ___ کنچے...... روشنی اماں۔ کنچے۔ ابو ___ کنچے...... بھائی...... کنچے......'

عورت ایک عجیب سی خبر لے کر لوٹی ہے۔ فرات کا پانی سرخ ہو گیا ہے۔ ایک ہفتہ سے ساری ساری رات پانی اُبلتا رہا ___ پانی سے عجیب عجیب آوازیں آتی ہیں ___ جیسے کوئی چیخ رہا ہو...... غالی...... غالی...... آگے بڑھو...... ملک کو کافروں سے بچالو ___ نصرانیوں سے، یہودیوں سے...... غالی غالی...... وہ پہلے بھی خوفناک سائرن کی ان آوازوں کو سن چکی تھی ___ وہ پہلے بھی یہ منظر دیکھ چکی تھی۔ تب شادی نہیں ہوئی تھی۔ تب عبداللہ نہیں ملے تھے ___ تب یہ دونوں بچے وجود میں نہیں آئے تھے ___ لیکن تب بھی فرات کا پانی لال سرخ ہو گیا تھا۔ لہریں اُچھل اُچھل کر آسمان جتنی بلند ہو جایا کرتی تھیں ___ اور لہریں بھوکے پیاسے لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کرتی تھیں ___ غالی غالی ___ بالروح ___ بالدم...... فدیناک یاصدام!

شہر گھپ اندھیرے میں ہے۔

گھر کی ہر شئے اندھیرے میں ڈوبی ہے۔ دن کا اُجالا، اپنی زندگی آمیز چمک میں ان

دھماکوں کو باندھ لیتا ہے مگر رات کے پُر اسرار اندھیرے میں یہ گرہ کھل جاتی ہے ___ عورت صدمے جیسی کیفیت میں ہے ___ شوہر غائب ہے۔ بڑے کو ماموں لے گیا اور چھوٹا کنچے ڈھونڈ رہا ہے......

چپ چپ......

'اماں روشنی......'

کافر آجائیں گے...... دھماکے سن رہے ہونا......

'اماں...... کنچے......'

کنچے بھائی لے گیا......

بچے کو پھر ایک جگہ تلاش کے لئے نظر آئی ہے۔ کپڑوں کا صندوق۔ بھائی کے کپڑوں کا صندوق۔ اندھیرا ___ نئی تلاش کے نام پر آنکھوں میں روشنی بن کر اُبھرتا ہے ___

عورت گہری اداسی میں ڈوب گئی ہے ___ امریکی کنکریٹ کی عمارتوں کو نشانہ بنارہے ہیں۔ کروز میزائلس کے دھماکے قریب میں بھی ہوئے تھے...... بچوں کا اسکول...... تہمینہ اور نادیہ کے مکانات...... اس کی قریبی سہیلیاں ___ اب صرف اندھیرا ہے...... کروز میزائلس کے دھماکے میں سہیلیاں گم ہوگئیں۔ دجلہ اور فرات کا پانی چڑھ آیا تھا۔ فرات کی سرخ لہریں اُچھل اُچھل کر چیخ رہی تھیں...... غالی...... غالی...... عورت، بچے کے ساتھ سہیلیوں کو تلاش کرنے گئی تھی مگر ___ وہاں سہیلیاں کہاں تھیں۔ سہیلیوں کے گھر والے کہاں تھے۔ گھر اور بچے کچھ بھی نہیں تھے ___ عراقی اور ریپبلکن گارڈس کے لوگ جمع تھے ___ ملبے کے ڈھیر تھے ___ آسمان پر پھیلتا دھواں تھا ___ ٹوٹے مکانات ___ کنکریٹ کے ڈھیر ___ سیٹیلائٹ ڈشوں کے تار...... اُدھڑے پلاسٹر...... اور دور تک بس دھواں ہی دھواں......

عورت حیران پریشان سی، سہمے سہمے چہروں میں اپنی سہیلیوں کو تلاش کرتی ہے...... نادیہ، تہمینہ...... دجلہ اور فرات کی لہروں میں گم آوازیں پیچھا کرتی ہیں ___

'جنگ ہوئی تو ہم، فدائین میں شامل ہوجائیں گے......'

'اور تم حسنہ......'

'اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں...... لیکن وہ جنگ کیوں چاہتا ہے ___ ہماری اس کی برابری کیا ہے۔ ہم چین سے ہیں۔ سکون سے ہیں ___ کو بہت کے ساتھ ہونے والی غلطی

کا خمیازہ تو ہم پہلے ہی کافی بھگت چکے ــــ لاکھوں بے گناہ، ٹینک، جہاز، بم گولے، ہیلی کاپٹر، کروز میزائلس، گیس ماسک اور اس کے بعد ــــ وہ زخموں پر مرہم لگانے پہنچ جاتے ہیں۔ پروٹینس فوڈ ٹائیلٹ پیپر سے لے کر ــــ وٹامن اور بوتل بند پانی کے ساتھ ہماری آزادی کے نام پر ــــ'

نادیہ کی آنکھوں میں اندیشے کی بجلی چمکی تھی ــــ ''گیارہ ستمبر، ورلڈ ٹریڈ ٹاور ــــ اور پنٹاگن پر حملے کے لئے امریکہ، صدام کو گنہگار اور قصوروار سمجھتا ہے ــــ وہ سمجھتا ہے کہ آج بھی القاعدہ کی ڈور جن کے ہاتھوں میں ہے، صدام ان میں سے ایک ہے......''

تہمینہ نے کہا ــــ جنگ میں ہم بچے اور شوہر کے ساتھ مورچے پر ہوں گے ــــ امریکی بیڑے ریت کے سمندر میں بھٹک جائیں گے ــــ فدائین ــــ ہم فدائین میں شامل ہوں گے......

ماحول میں اُڑتی ہوئی ریت ــــ دھواں دھواں آسمان...... ملبہ صاف کرتے ہوئے گارڈ...... ایک لمحے کو خیال آیا۔ گارڈ سے دریافت کرے...... میرے شوہر، عمر 38 سال ــــ دائیں رخسار پر بڑا سامسہ۔ آنکھوں پر چشمہ ــــ قد چھ فٹ دو انچ۔ پچھلے جمعہ سے کوئی اتہ پتہ نہیں......

گارڈس چیخ رہے ہیں۔ برقعہ پہنے عورتیں زور زور سے رو رہی ہیں...... بچے دھمال کر رہے ہیں ــــ وہ واپس لوٹی تو کچھ بچے کروز میزائلس داغنے کا کھیل، کھیل رہے تھے۔ وہ ایک لمحے کو ٹھہری ــــ پھر واپس لوٹ آئی ــــ

عورت کو سب کچھ یاد تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں بھولی۔ اس دن پہلی بار خطرے کا سائرن چیخا تھا۔ وہ اپنے شوہر کو اپنے ہاتھوں سے کھلا رہی تھی۔ بڑا، گیارہ سال کا، ہاتھوں میں ریموٹ لئے کبھی الجزیرہ کبھی ابوظہبی کے چینلس لگا دیتا......

وہ چیخی۔ سبحان...... نہیں۔ اللہ کے واسطے...... ایک جگہ ٹھہرو سبحان ــــ سنا تم نے......

شوہر مسکرایا ــــ اپنے چینلس ہیں۔ جنگ کے دوران بس انہی کی سچائیوں کو قبول کرنا ــــ تمہیں پتہ ہے یوروپ کے ایک کروڑ سے بھی زائد گھروں میں یہ چینلس پہنچ چکے ہیں ــــ' وہ فخریہ طور پر مسکرایا۔ ہماری آواز...... میں غائب بھی ہو جاؤں تو...... لاپتہ......'

عورت نے شوہر کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ عربی میں ناراضگی کا اظہار کیا ــــ

''سنو۔ کمزور مت بنو۔'' شوہر نے عورت کے ہاتھوں کو تھام کر اپنے سے قریب کر لیا تھا۔ میری بات غور سے سنو ــــ یہ جنگ ہم پر تھوپی گئی ہے ــــ سن رہی ہونا۔ بچوں کو بھی بزدل مت بنانا۔ بڑا گیارہ سال کا ہے۔ میرے بعد، اسے بھی جنگ کے لئے تیار کر دینا ــــ اپنی عزت کے لئے جنگ ضروری ہے......'

اس کی آنکھیں خلاء میں دیکھ رہی تھیں۔ آنکھوں میں نمی لہرائی تھی۔

شوہر نے اپنی آواز پر قابو پاتے ہوئے کہا ــــ ''یہ بہت بڑی مچھلیوں سے جنگ ہے ــــ چھوٹی مچھلیوں کو صرف اپنی حفاظت کرنی ہے ــــ جنگ وہ لڑ رہے ہیں۔ ہم نہیں۔ ہم صرف اپنا بچاؤ کر رہے ہیں۔ اپنے ملک، اپنے گھر کا بچاؤ ــــ ہمارے پاس سامنا کرنے کے لئے اُن کے جیسی میزائلس اور ہتھیار نہیں ہیں ــــ ہم اپنے گھر، اپنے خاندان، اپنی قوم اور اپنی عزت کے لئے لڑ رہے ہیں ــــ اس لئے سمجھ رہی ہونا۔ میں لاپتہ ہو جاؤں تو......''

عورت نے بے رحمی کے انداز میں، اپنے آپ کو سخت بنا لیا تھا۔ شوہر کے لاپتہ ہونے پر اس نے بزدلی کا راستہ نہیں اپنایا۔ چپ چاپ بڑے کو ماموں کے ہاتھوں سونپ دیا۔ سونپتے وقت اس نے آنکھیں بند کیں ــــ کلمہ پڑھا ــــ بڑے کے چہرے پر پھونک ماری۔ نہ پٹایا۔ نہ پیار کیا۔ نہ جاتے وقت پلٹ کر دیکھا۔ نہ آنکھوں میں آنسو لائی ــــ وہ چپ چاپ کمرے کے ادھڑے پلاسٹرس کو دیکھ رہی تھی ــــ جنگ کے خاتمہ کے بعد، سفیدی کرانے کے بارے میں غور کر رہی تھی ــــ دو سال پہلے عید کے موقع پر ــــ سفیدی کو دو سال کیوں لگے ــــ عبداللہ، بصرہ چلے گئے تھے۔ تجارت کے کام سے۔ بصرہ ــــ لیکن، وہ تو سفیدی کرا ہی سکتی تھی۔

چھوٹا اُس وقت بھی کنچے تلاش کر رہا تھا......

''اماں...... کنچے...... بھائی...... کنچے......''

اُسے یقین تھا، صبح ہوتے ہی چھوٹا، کنچے کے ذکر کو بھول جائے گا۔

وہ اُسے کھیلنے کے لئے کچھ نئے کھلونے دے دے گی۔

پانچ بجے کے آس پاس کروز میزائلس دغنی بند ہو گئی تھی۔ عورت کو جھپکی آ گئی تھی۔ بچہ فرش پر بچھے قالین پر سو گیا تھا۔ نیند ٹوٹی تو کھڑکی سے ہلکی ہلکی سفیدی جھانکنے لگی تھی۔ آنکھیں ابھی بھی نیند سے بوجھل تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا شیشہ کھولا۔ پردے ہٹائے۔ ابھی اندھیرے اور اُجالے کی کشمکش جاری تھی۔ بچے نے آہٹ سن کر کروٹ بدلی۔ بلیک آوٹ سے چندھیائی آنکھوں کو

مدھم روشنی سے ذرا سی راحت ملی۔ بچے نے ایک لمحے کو آنکھ کھولی ـــــ پھر وہی پرانا ٹیپ چالو کیا ـــــ 'اماں۔ کنچے، لیکن چھوٹے نے اماں کے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ پھر کروٹ بدل کر سو گیا ـــــ ''

اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا ـــــ سڑکوں پر لوگ نکلنے لگے تھے۔ ریپبلکن گارڈ اور بہت سے عراقی مرد، زور زور سے گفتگو میں لگے تھے ـــــ وہ غسل خانے میں آئی۔ برش کیا۔ منہ پر پانی ڈالا ـــــ فریج سے بوتل بند پانی نکالا۔ ایک لمحے کو نگاہ قالین کی جانب چلی گئی۔ چھوٹا غائب تھا ـــــ اس نے گھڑی کی سوئیوں کی جانب دیکھا۔ آواز لگائی ـــــ ایک کمرے سے دوسرے کمرے...... دوسرے تیسرے کمرے کی طرف ـــــ مگر چھوٹا نہیں تھا ـــــ باہر شور بڑھ گیا تھا۔ دھماکے ابھی رُکے ہوئے تھے۔

''جبار...... جبار......''

عورت کا دل دھک سے رہ گیا۔ جبار کہاں گیا۔ چھوٹا کہاں گیا۔ ابھی تو یہیں تھا۔ فرش پر سو رہا تھا ـــــ بلیک آؤٹ میں، کروز میزائلس کے دھماکوں کے بیچ ـــــ بھائی اور کنچے کی کشمکش میں......

باہر شور بڑھ گیا تھا ـــــ کچھ لوگ چلا رہے تھے......

جبار...... جبار......

اس نے کھڑکی سے جھانکا ـــــ پھر جیسے سن...... ن...... سے رہ گئی ـــــ دروازے پر آئی۔ لوگ جمع تھے۔ لوگ تیز تیز آواز میں کچھ بول رہے تھے ـــــ وہ تیزی سے پلٹی۔ دروازہ کھول کر باہر آئی اور جیسے اپنی جگہ تھم سی گئی ـــــ

آگے، کچھ فاصلے پر جبار اور کچھ بچے کھڑے تھے۔ ریپبلکن گارڈس کے آدمی چیخ رہے تھے۔ عورتیں چلا رہی تھیں۔ مرد شور کر رہے تھے......

''نہیں...... پھینک دو۔ پھینک دو...... بچے...... واپس آجاؤ......''

اُس نے غور سے دیکھا ـــــ جسم کے اندر اندر جیسے تیز بجلی اُترتی چلی گئی۔ بچے کے ہاتھوں میں گول گول کوئی چیز تھی۔ نہیں گولے۔ گولے نہیں، بم گولے۔ بم گولے نہیں، ہتھ گولے ـــــ

دھوپ نکل آئی تھی۔ آسمان پر چڑیوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ دور دھواں اُٹھ رہا تھا۔ دھماکے شروع ہو گئے تھے۔ کروز میزائلیں داغی جانے لگی تھیں......

ریپبلکن گارڈس کے آدمی چیخ چیخ کر بتانے کی کوشش کر رہے تھے...... رات کے وقت...... نہیں۔ حمزہ اور نجف کالونیوں میں۔ رہائشی علاقوں میں___ امریکی فوجیوں کی جانب سے گولے پھینکے گئے___ یہ گولے پھٹ نہیں پائے___ کبھی بھی پھٹ سکتے ہیں...... فی امان اللہ۔

وہ عربی زبان میں زور زور سے باتیں کر رہے تھے......

''دے...... دو......''

''انہیں ڈی فیوز کرنا ہوگا......''

'بچے...... یہ کھلونے نہیں ہیں۔ بم ہیں...... بم......'

بچو۔ پیارے بچو......

'واپس آؤ___'

عورتیں چیخ رہی تھیں۔ مرد گھبرائے سے لگ رہے تھے۔ گارڈس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ سب دبے پاؤں بچوں کو گھیرنے کی نئی اسٹریٹجی بنا رہے تھے___

'جبار...... خدا کے واسطے جبار___'

وہ گلہ پھاڑ کر چیخی___ ٹھیک اُسی وقت ذرا دور پر آسمان میں ایک میزائل پھٹا تھا___ روشنی کے تیز دھماکوں کے بیچ بارودی دھواں تا حد نظر چھاتا ہوا محسوس ہوا___

بچے گا رہے تھے...... الفتح لنا...... الفتح لنا......

بچے شور کر رہے تھے...... الفتح لنا...... الفتح لنا...... الفتح لنا......

بچے نئے کھلونوں کو پا کر جوش میں تھے...... الفتح لنا......

ریپبلکن گارڈس، آس پاس کے لوگ، مرد، عورتیں، بوڑھے، دھیرے دھیرے، بچوں کی جانب بڑھنے کا حوصلہ کر رہے تھے___

بچے اپنی دھن میں، کھلونے لہراتے اب تیز تیز گانے لگے تھے...... الفتح لنا...... الفتح لنا......

دھوئیں کا غبار جیٹ رفتار سے لہراتا ہوا، کچھ دیر کے لئے سب کے چہرے کو گم کر گیا تھا___ مگر اس اندھیرے میں بھی، بچوں کے گیت سنے جا سکتے تھے۔

●❖●

گراؤنڈ زیرو

یہ آخری میٹنگ تھی۔

طے ہو چکا تھا کہ اس کے بعد کوئی میٹنگ نہیں ہوگی۔ کمرے میں ہلکا اندھیرا تھا جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ بے حد ڈراونی تھی۔ کبھی تو ایک دم سناٹا چھا جاتا کہ جیسے اب کمرے میں کوئی بھی نہیں ہے۔ سارے اُٹھ کر چلے گئے۔ پھر یکایک شور ہنگامہ شروع ہو جاتا۔ ڈاکٹر چپ چپ سگار کے کش کھینچتا رہا۔ سگار سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ لیٹن امریکہ کا تحفہ تھا، جو ایک دوست نے بطور خاص اسے پیش کیا تھا۔ بس کبھی کبھار ـــــ یا ایسے موقع پر جب ڈاکٹر کو کوئی اہم مسئلہ سلجھانا ہوتا ہو......

'تو آپ کیا سوچ رہے ہیں ڈاکٹر؟'

'میں کچھ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا' ڈاکٹر آہستہ آہستہ کش کھینچتا رہا۔

'نہیں۔ سوچ لیجئے۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔'

'سوچ رہا ہوں۔'

صوفے پر بیٹھی ہوئی لڑکی اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ خاصے غصّے میں تھی۔ سوچنے کے لئے رکھا ہی کیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ فیصلہ لینے میں اتنی تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر کش کھینچتا رہا۔ اس کی آواز بے حد سرد تھی اور اس بے حد سرد، کپکپا دینے والے موسم میں کچھ اس کے دانتوں کا بھی اثر تھا، جو بج رہے تھے...... 'بس، گھر کا معاملہ ہے۔ ایک گھر سے دوسرے گھر منتقل ہوتے ہوئے دشواری آتی ہے۔'

'اور ایسی صورت میں جب گھر بدلنا ضروری ہو گیا ہو۔'

'اور گھر بدلے بغیر چارہ بھی نہیں ہو۔' لڑکی جوان تھی اور تندرست بھی۔ اس کی آنکھوں میں اگر کچھ تلاش کیا جا سکتا تھا، تو وہ بے شک نفرت اور زہر کی پوٹلی تھی۔ '' آپ جانتے ہیں۔ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔ بے شک آپ جانتے ہیں کہ میرے ساتھ کیا ہو چکا ہے اور اس کے بعد بھی......؟''

'' گھر بدلنا آسان نہیں ہوتا۔'' یہ دبلی پتلی عورت تھی۔ صوفے پر سمٹی ہوئی۔ آنکھوں میں جیسے آنسو خشک ہو گئے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ بڑبڑا رہی تھی۔ '' آسان نہیں ہوتا......؟''

نوجوان، جس کی عمر پچیس اور تیس کے درمیان ہوگی، کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ وہ ایک دم سے غصے میں پلٹا۔

'آخر۔ کیوں مکان چھوڑیں ہم۔ اس مکان میں خرابی ہی کیا ہے۔'

'خرابی نہیں۔ زندگی۔ زندگی کے لئے — لڑکی زور سے چیخی۔'

'' دوسرے مکان میں جانے کے بعد کیا سب دکھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر ہم آرام سے جی پائیں گے؟ نوجوان کو یقین نہیں تھا۔''

'شاید...... شاید...... اور کوئی راستہ بھی تو نہیں ہے۔'

'ڈاکٹر۔ تم نے کیا سوچا ہے۔ صوفے پر بیٹھا آدمی پچپن۔ ساٹھ کی لپیٹ میں تھا۔ وہ بولنے پر نہیں، سننے پر یقین رکھتا تھا۔ یوں بھی، اس کے کان مفلر سے بند تھے۔ ہاتھوں میں دستانہ تھا اور اس نے لانگ فر، کا کوٹ پہن رکھا تھا۔

'میں ابھی آیا۔'

سگار بجھ چکا تھا۔ کمرے سے ملحق ایک چھوٹا سا لیب تھا۔ ڈاکٹر کی تجربہ گاہ۔ ڈاکٹر جب بہت پریشان ہوتا تو وہ اسی تجربہ گاہ کا سہارا لیا کرتا۔ وہ کمرے سے اُٹھ کر تجربہ گاہ میں آ گیا۔ شیشے کے بنے چھوٹے چھوٹے گھروندوں، میں اس کی بے حد پیاری چیزیں بند تھیں۔ بے حد پیاری چیزیں۔ تجربے سے جڑی چھوٹی سے چھوٹی چیز پر بھی اسے بے پناہ پیار آتا تھا۔ ممکن ہے، دوسروں کی نظر میں گھروندے میں رکھی ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہ ہو، مگر ڈاکٹر کے لئے ان میں قیمتی زندگیاں قید تھیں اور جیسا کہ وہ اپنے ڈاکٹر ساتھیوں سے اپنے پیشے کی تعریف میں کہتا تھا— 'خدا کے نمائندے — اور بیشک سب کچھ انسانی جان کو بچانے کے لئے۔'

ڈاکٹر نے فخریہ طور پر لیب میں رکھی چیزوں کا جائزہ لیا۔ نیم کے پتے، کریلے کے

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے۔ ایک کین میں مرے ہوئے گرگٹ اور چوہوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ شیشے کے تیسرے گھروندے میں کچھ الگ الگ مردہ سانپوں کی قسمیں تھی۔ افیم اور زہریلے پتوں کی کچھ نایاب قسمیں، جو ڈاکٹر نے گھر کے پچھواڑے اُگے جنگل سے برآمد کی تھیں اور انہیں دریافت کرنے کے بعد کیسا خوش ہوا تھا۔ اب ڈاکٹر نے آہستہ سے وہ شیشی اُٹھالی، جس پر اس نے سرخ روشنائی سے پوٹاشیم سائینیڈ لکھا تھا۔ اتنا لکھ کر بھی تسلی نہیں ہوئی، تو اس کے نیچے اس نے بڑے بڑے حروف میں Poison لکھ دیا تھا۔ دراصل میڈیکل پڑھائی کے دنوں میں ہی اس کے دل میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ پھر زہر کو زہر کیوں نہیں۔ وہ زہر کو زہر کے تریاق کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یعنی انسانی زندگی بچانے کے لئے...... تجربہ گاہ میں داخل ہوتے ہی وہ ڈاکٹر کم سائنسداں زیادہ بن جاتا۔ زہریلے پتوں اور جانوروں پر وہ پوٹاشیم سائینائیڈ کے عجیب عجیب ٹسٹ کرتا اور مطمئن ہو جاتا، کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اچھی نیت اور انسانی بھلائی کے لئے کر رہا ہے۔ وہ پوٹاشیم سائینائیڈ اور اس کے ذائقے سے وابستہ دلچسپ کہانیوں پر جی کھول کر ہنستا تھا۔ جیسے اس نے راکشس کے پنجرے میں قید طوطے کا راز جان لیا ہو۔ اس کا ذائقہ کھٹا تھا، یا میٹھا، ڈاکٹر ایسی بچکانی بحثوں سے بہت آگے نکل گیا تھا۔

تجربہ گاہ میں شیشے کے گھروندے اس کے سامنے کھلے ہوئے تھے۔ مگر۔ ڈاکٹر کا ذہن تو کہیں اور تھا۔ نیم کے ہرے ہرے پتے، پوٹاشیم سائینائیڈ کی ایک بوند۔ کھڑکی کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوا نوجوان۔ چوہے کی چوں چوں کی آواز — ٹھنڈا جسم...... مردہ گرگٹ اور سانپ...... ڈاکٹر کو پہلی میٹنگ یاد آ گئی۔ میٹنگ، اس گھر کے لئے ضروری ہو گئی تھی۔

'مجھے جاب سے نکال دیا گیا ہے — 'یہ نوجوان تھا۔

ڈاکٹر کے دوست کہے جانے والے شخص نے لانگ اوورکوٹ سے ہاتھ باہر نکالا۔

'زمین تنگ ہو گئی ہے۔'

دبلی پتلی عورت صوفے پر، ایک ٹک چھت کو گھورتی ہوئی بولی۔ 'ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ کہیں نہیں......؟'

اور یہ دوسری یا تیسری میٹنگ تھی، جب دوست نے سردی سے ٹھٹھرتی ایک شام کمرے میں داخل ہوتے ہی اعلان کیا تھا۔

'وہ بھی گھر تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔'

'لیکن...... لیکن کیوں۔؟'

مفلر میں چہرے کو چھپاتے ہوئے اس نے آہستہ سے کہا— 'دوسرے کئی دوستوں نے بھی یہی کیا ہے۔ وہ بہت آہستہ سے بولا۔ دنیا بدلتی ہے تو دیکھنے کا نظریہ بدل جاتا ہے اور جب سچ یہی ہے۔ بس یہی۔ اس نے زور دیا...... جینے کا آخری ہتھیار......'

سردی اور ٹھٹھرن سے پیدا شدہ خاموشی پر، اس نے لگ بھگ چلاتے ہوئے اپنا مکالمہ پورا کیا— 'آخر آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں؟'

پانچویں یا چھٹی میٹنگ میں دُبلی پتلی عورت نے بھی صاف صاف لفظوں میں اعلان کر دیا۔

'اب وہ کٹی پارٹیوں میں نہیں جائے گی۔'

'کیوں؟'

عورت نے آنکھیں جھکا لیں۔ ''مجھے آنے سے منع کر دیا گیا ہے۔''

'وہی تو۔ وہی تو......' دوست زور زور سے ہنس رہا تھا۔ آج اس نے اوور کوٹ نہیں پہن رکھا تھا۔ جب اُسے احساس ہوا کہ اس کے قہقہے میں کوئی بھی شریک نہیں ہے اور سب کے سب اسے کئی برسوں کے بیمار مریض کی طرح گھور رہے ہیں، تو وہ یکا یک سنبھل کر اپنی بات مکمل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''یعنی آپ میری بات سمجھ تو رہے ہیں نا اور یقیناً میرے لئے یہی بہت ہے۔''

پوٹاشیم سائینا ئیڈ اور اس سے وابستہ کہانیاں۔ ڈاکٹر کے دماغ میں میزائلیں چھوٹ رہی تھی۔ اسے میڈیکل کالج کا زمانہ یاد تھا۔ 'لیب' میں دوستوں کے ساتھ اس موضوع پر ہونے والی گفتگو یاد تھیں۔

'مرنے سے پہلے، سالے ایک بار ایکسپیریمنٹ ضرور کر لینا۔ انسانیت کے نام پر۔' دوستوں کے قہقہے چھوٹ گئے تھے۔

اور یہ ساتویں میٹنگ تھی۔ باہر کہرا گر رہا تھا۔ زمین سے آسمان تک دھند کی چادر پھیل گئی تھی۔ کمرے میں خاموشی تھی۔

لڑکی رو رہی تھی۔

عورت کا سر جھکا تھا۔ نوجوان کھڑکی کی طرف منہ دیئے اپنے ناخن چبا رہا تھا۔

دوست دھیرے دھیرے کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ 'مجھے۔ میری بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔'

ڈاکٹر نے سگار جلا لیا۔

'وہ مکان بدلنے کا پروانہ لے کر گھر گھر جا رہے ہیں۔ اب اس محلے کی باری ہے۔ آپ لوگ کیا سوچ رہے ہیں۔ ہمارے پاس دو ہی راستہ ہے...... یا تو......'

دوست کے دانت بج رہے تھے......

ٹھنڈک سے سگار بجھ گئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ڈاکٹر نے اپنے جسم میں تیز گرمی اُترتی ہوئی محسوس کی۔

اور یہ آخری میٹنگ تھی۔ کیونکہ اس کے بعد کسی میٹنگ کے ہونے کا امکان نہیں تھا۔ وہ لوگ مکان بدلنے، کا فرمان لے کر دوسرے دن حاضر ہونے والے تھے۔ وہ بے حد شائستہ لوگ تھے۔ نرم مزاج۔ کم سخن۔ بے حد ملائم۔ روئی جیسے۔ وہ جرم نہیں کرتے تھے۔ زیادہ سوال نہیں پوچھتے تھے۔ بس، وہ خاموشی سے اپنا کام کر جاتے تھے۔

افیم اور جنگلی ہرے ہرے پتے۔ چوہے اور گرگٹ کے جسم کے کٹے ہوئے حصے۔ باہر کمرے میں شور بڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے پوٹاشیم سائینائیڈ کی شیشی تھام لی۔ اسے لڑکی کے زور زور سے چیخنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ 'آپ جانتے ہیں انہوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے—؟ ڈاکٹر نے ہاتھوں میں سرنج تھام لی۔ دوست زور زور سے کچھ کہہ رہا تھا۔ عورت رو رہی تھی۔ نوجوان تیز آواز میں کہہ رہا تھا— کیا جانتا ہوں— اب مجھے کہیں بھی......لڑکی اور نوجوان کی آوازیں ایک دوسرے میں Mix ہو رہی تھیں۔ ڈاکٹر آہستہ آہستہ سرنج میں زہر بھر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلملا گئے تھے۔ اس نے چمڑے کے دستانے اُتارے۔ جیب سے رومال نکالا۔ چہرہ صاف کیا۔ رومال جیب سے نکال کر سرنج کی طرف دیکھا۔ اسے کوٹ کی جیب کے حوالے کیا۔

اب وہ کمرے میں جانے کے لئے تیار تھا۔

ڈاکٹر جس وقت اپنے کمرے میں واپس آیا، لڑکی کا مکالمہ چل رہا تھا۔ '' آپ لوگ— آپ لوگ جانتے ہیں نا۔ میرے ساتھ کیا ہوا۔ ان کے الفاظ میں کہوں تو...... مجھے شدھ کیا گیا۔ اس لئے کہ میں اپوتر تھی۔ مجھے شدھ کرنا ضروری تھا مگر اس کے باوجود۔ اس کے باوجود میرے لئے وہاں کوئی جگہ نہیں تھی۔''

'وہ آنے والے ہیں— ' نوجوان کھڑکی کے پار دیکھ رہا تھا۔
'سنیئے غور سے سنئے۔ مکان بدلنے کے لئے ہم کوئی جرح نہیں کریں گے— 'یہ دوست تھا۔ دبلی پتلی عورت کی خشک آنکھوں میں آنسوؤں کے تیز تیز قطرے اُمڈ آئے تھے۔ اب وہ رو رہی تھی۔
'تمہیں کچھ کہنا ہے ڈاکٹر......؟' دوست نے آخری بار ڈاکٹر کی آنکھوں میں جھانکا۔
'ہاں۔'
کسی حتمی فیصلے تک پہنچتے ہوئے ڈاکٹر اپنی جگہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم شانت تھا—

●

پہلی بار اس نے غور سے ایک ایک کر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں کا جائزہ لیا۔ سامنے والی دبلی پتلی عورت اس کی بیگم تھی۔ ایک الٹرا ماڈ عورت۔ کٹی پارٹیوں کی شوقین۔ یعنی عائشہ زین العابدین۔ نوجوان، اس کا بیٹا تھا۔ کمپیوٹر انجینئر۔ اپنے کام کا ماہر صرف اور صرف کام پر یقین رکھنے والا۔ بے حد خوبصورت دیکھنے والی لڑکی اس کی پیاری پیاری بٹیا تھی۔ لڑکی کا نام شائستہ تھا اور لڑکے کا آفاق۔ چلتے چلتے دوست کا نام بھی بتا دیتے ہیں۔ دوست کا نام منیر خاں تھا۔
قارئین! یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ واقعہ، گودھرا حادثے کے دو تین برس بعد پیش آیا تھا۔ یعنی تب کی بات ہے، جب بھارت، ہندو راشٹر یہ ہونے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ تشدد کے بادل چھٹ گئے تھے۔ وہ بے حد معصوم اور پیاری پیاری باتیں کرنے والے لوگ تھے۔ وہ جرح نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگا دیکھنا چاہتے تھے۔ اہنسا کے راستے پر چلتے ہوئے ان کا بس ایک ہی منتر تھا۔ اپنا دھرم چھوڑ کر میرے دھرم میں آجاؤ اور اس کے بعد قارئین وہ اتنا مان سمان دیتے تھے...... اتنا مان سمان دیتے تھے کہ......

●

ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ایک دم سے شانت تھا۔ کوٹ کی جیب سے سرنج نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ نہیں رہے تھے۔ وہ پوری طرح اپنی کارروائی سے مطمئن تھا۔ اس نے دوست کی طرف دیکھا۔ پھر باری باری سے اپنے بچوں اور بیوی کی طرف۔

'تو وہ آرہے ہیں اور کوئی راستہ بھی نہیں ہے — ' ڈاکٹر ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا— مگر راستہ ہر بار پیدا ہو جاتا ہے۔ اندھیری سے اندھیری سرنگ سے بھی ایک راستہ موہوم سی روشنی کی طرف جاتا ہے— لیکن راستہ سچ مچ نہیں ہے اور جب دو بھیانک راستوں میں سے ایک راستے کا انتخاب کرنا ہو تو......؟'

ڈاکٹر نے بچوں کو غور سے دیکھا...... 'ہم ڈاکٹر بھی کبھی کبھار ہار جاتے ہیں۔ کوئی کوئی مرض ایسا ہوتا ہے کہ مریض اپنی موت کی دعائیں مانگتا ہے مگر موت نہیں آتی۔ وہ گھٹتا رہتا ہے۔ مگر......ڈاکٹر نے سرنج پر اپنے ہاتھوں کی گرفت سخت کی— 'کبھی کبھی ایسی کسی صورتحال کے لئے ہمارے میڈیکل سائنس میں ایک ٹرم عام طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ایک لمحے کے لئے ٹھہرا— پھر اس نے دھیرے سے کہا— مرسی کلنگ یا مرسی دیتھ —اس کی دھیمی آواز باہر سے آتی تیز ٹھنڈ میں دب کر رہ گئی تھی۔

اور آخر میں۔ لڑکے یعنی آفاق زین العابدین کا بیان:

کہانی ختم ہوگئی۔ لیکن پیارے قارئین، ابھی ابھی ہمیں ایک بیان ملا ہے۔ یہ بیان کسی کورٹ کچہری میں دیا گیا بیان نہیں ہے بلکہ یہ بیان ہمیں اسی گھر کی ایک کتاب کے ذریعے ملا ہے۔ یہ ایک چھوٹے سے کاغذ کا ٹکڑا ہے۔ جس میں مختصراً بس اتنا تحریر ہے۔

''اس بدقسمت رات۔ اللہ ایسا دن کسی کو بھی نہ دکھائے۔ میں نے آگے بڑھ کر سرنج توڑ ڈالی۔ ابا لیبارٹری کے، اسی بدبودیتے، مردہ کیڑے مکوڑے اور زہریلے پتوں کے درمیان رہ گئے۔ ہم بچپن سے ورثے میں ملا نام یا گھر بدلنے پر راضی نہیں تھے۔ ابا کی طرح کمزور بھی نہیں۔ ہم کہاں جا رہے ہیں، ہمیں خود نہیں پتہ۔ ہاں، ہمیں تلاش کرنا ہو تو یہ ضرور دیکھ لینا کہ وہاں بارودی سرنگ کے پھٹنے کا دھماکہ سنائی دے رہا ہے، یا نہیں— ہم اتنا جان گئے ہیں، کہ اگر ہمیں جینا ہے تو ہمیں جینے سے کوئی روک نہیں سکتا۔

تحریر کے نیچے ہندی میں کیا گیا ایک دستخط تھا— جس پر صاف صاف آفاق زین العابدین کا نام پڑھا جا سکتا تھا۔

●❖●

انعمتہ اور بیکری

(اپنی بیٹی انعمتہ کے نام، جسے اللہ تعالیٰ نے دیئے، صرف دو سال اور تین مہینے)

سب کچھ ٹھیک تھا اماں/ تیرے کھائے اچار کھٹاس/ تیری چکھی ہوئی مٹی اکثر پہنچتے تھے میرے پاس/ میں بہت خوش تھی اماں/ مجھے لینی تھی، جلدی ہی اپنے حصے کی سانس/ مجھے لگنی تھی اپنے حصے کی بھوک/ مجھے دیکھنی تھی اپنے حصے کی دھوپ/ ابو کی ہتھیلی کا سایہ تیرے پیٹ پر دیکھا تھا میں نے/ مجھے اپنے حصے کے ابو دیکھنے تھے...... پھر جانے کیا ہوا/ میں تیری کوکھ کے ملائم گنگنے اندھیرے سے نکل کر/ کھلی دھوپ پھر تیز آگ میں پہنچ گئی......

___ انشو مالویہ کی ایک نظم سے

چاروں طرف گہرا سناٹا ہے اور اس سناٹے میں اپنی آواز تک سنائی نہیں دیتی۔ جسم بے حس ہے ــــ اور روح کے اندر جیسے کسی نے چپکے سے خنجر اُتار دیا ہو۔ مگر ــــ کوئی چیخ نہیں ــــ سناٹا اور گہرے سناٹے میں دو آنکھیں میرے سامنے معلق ہوگئی ہیں ــــ میں کچھ بھی نہیں بھولا...... مجھے ایک ایک کر کے ساری باتیں یاد آرہی ہیں ــــ

''وہ آرہی ہے......''

پہلی بار اِس آواز کی 'گونج' کے ساتھ ہی میں نے اپنا غصہ ظاہر کر دیا تھا۔

''نہیں، اُسے روک دو۔ یہ کوئی آنے کا موسم نہیں ہے۔ تم نے باہر نہیں دیکھا!''

''باہر......؟''

''باہر جنگل جل رہے ہیں۔ صُبحیں جل رہی ہیں۔ راتیں جل رہی ہیں۔ دھوپ میں

حدّت ہے اور......‘‘

’’تبسم نے پہلی بار میری آنکھوں میں جھانکا — ’ڈراؤ مت، صحبیں پہلے بھی جلی تھیں۔ راتیں بھی۔ پھر سب ٹھیک ہو گیا۔‘‘

’اِس بار ٹھیک نہیں ہوگا — تم نے سنا نہیں۔ رات میں کیسی کیسی ڈراؤنی آوازیں گونجتی ہیں — جیسے سناٹے اور گھپ اندھیرے کا فائدہ اٹھا کر ہزاروں آسیب سڑکوں پر اکٹھے ہو گئے ہوں......‘

’ڈراؤ مت — ہاسنو، نہ تبسم نے مسکرانے کی کوشش کی — وہ آ رہی ہے — اور یہ وقت بھوت، آسیب کی باتیں کرنے کے لیے نہیں ہے۔ تم اس کے نازک نازک قدموں کی چاپ سن رہے ہو...... دیکھو وہ چل رہی ہے...... وہ آ رہی ہے......‘

باہر دھماکہ ہوا تھا — تیز دھماکہ —

☆☆

اس رات خاموشی بھی تھی — اور اندھیرا بھی چل رہے تھے —

اس رات سناٹا چھایا تھا — اور — تیز آندھی بھی آئی ہوئی تھی۔

اس رات برابر دھماکے ہو رہے تھے۔ برابر — پچھلے کئی دنوں تے۔ نہیں کئی برسوں سے — شاید اسی لیے میں الجھنوں میں ڈوبا تھا —

’نہیں انعمۃ، ابھی اتنی جلدی نہیں — مت آؤ —‘

’میں آ رہی ہوں پاپا...... ڈرومت......‘

جیسے اندھڑ ٹھہر گیا — طوفان گزر گیا — سناٹے میں جل ترنگ بجنے کی مدھم مدھم صدا گونجی — وہ شیشے کے ایک چھوٹے سے انکیوبیٹر میں تھی......

’لو، میں آ گئی — مجھ سے باتیں کرو —‘

’نہیں کرتا —‘

’کرنا تو پڑے گا۔ انتظار جو کرتے تھے......‘

شیشے کے پالنے میں وہ پورے وجود کے ساتھ ہنس دی — لیکن سنو — ابھی سے گرہ میں باندھ لو — میں زیادہ رکوں گی نہیں — یہ دھماکے مجھے پریشان کرتے ہیں —‘

وہ جیسے شیشے کے ’پلنے‘ سے اڑ کر میرے سامنے ہوا میں تیر رہی تھی — ’آنکھوں سے

آنکھوں کے رشتے میں ایک جھیل ہوتی ہے۔ محبت سے محبت کے سفر میں ایک سمندر آتا ہے۔ میں جھیل میں تیری— سمندر میں غوطہ لگایا— مگر یہ کیا— میں...... میں تو ڈر گئی تھی پاپا...... جھیل کا پانی گرم تھا اور سمندر آگ کا دریا بن گیا تھا— میرے ساتھ کوئی اور بھی تھا...... نہیں' شاید میں نے کوئی چیخ سنی تھی۔ میں اس آواز کو پہچانتی تھی......'

انعمۃ زور سے چیخی—

تبسم ناراضگی سے بولی— 'دیکھتے کیا ہو، اسے گود میں لو...... وہ رو رہی ہے......'

'نہیں— آہ، بھیانک— بہت بھیانک—'

میں آہستہ آہستہ بدبدا رہا تھا— میری نظریں اس کے چہرے سے چپکی تھیں— وہ بن رہی تھی— جیسے کہ، پری میچور بچے ہوتے ہیں— مگر نہیں— انعمۃ بن چکی تھی— ہاں، وہ جھیل میں جلی تھی— دھوپ میں جھلسی تھی— شاید اس لیے......

اس لئے وہ بولنا بھول گئی تھی......

چلنا بھول گئی تھی......

بڑھنا بھول گئی تھی......

جبکہ عمر کے گھوڑوں نے آہستہ آہستہ اُڑنا سیکھ لیا تھا......

☆☆

ڈاکٹرز کہتے ہیں...... ''تبسم کے چہرے پر خوف ہی خوف تھا۔

وہ بستر پر لیٹی تھی۔ میں انعمۃ میں گم تھا— ''یہ آنکھیں میری ہیں...... یہ ہونٹ...... یہ چھوٹے چھوٹے پاؤں...... یہ ہاتھ......''

ڈاکٹرز کہتے ہیں...... تبسم بولتے بولتے رُک گئی...... ''وہ ٹھہر گئی ہے۔ اُس کی سانسیں ٹھہر گئی ہیں۔ اُس کے ہاتھ...... اُس کے پاؤں...... وقت ٹھہر گیا ہے...... عمر ٹھہر گئی ہے......''

میں نے انعمۃ کو دونوں ہاتھوں میں بھر لیا ہے— ''نہیں یہ ایسی ہی ہے۔ بس، مجھے یہ ایسے ہی قبول ہے...... بس ایسے ہی......''

دو بڑی بڑی آنکھیں میری آنکھوں میں جھانک رہی ہیں۔ ''پاپا، میں نہ بڑھوں تو؟ میں نہ اُڑوں تو......؟''

''نہیں...... سب ٹھیک ہے......'' میں تبسم کی طرف مڑتا ہوں— آہ، سب ٹھیک......

جوتے کا فیتہ باندھنے اور ٹائی کی ناٹ باندھنے تک...... لوگ مر رہے ہیں۔ آہ، سب ٹھیک ــــ گلاس میں اسکاچ اُنڈیلنے اور آئینہ میں چہرہ دیکھنے تک...... لوگ مر رہے ہیں...... آہ، سب ٹھیک......"

"دیکھو...... وہ تمہاری طرف دیکھ رہی ہے...... ہنس رہی ہے......"

"ہاں، وہ ہنس سکتی ہے، اس لئے کہ اُس نے سب کچھ دیکھا ہے۔ جانا ہے۔ وہ ہنس سکتی ہے...... وہ ہم سب پر...... یعنی جو کچھ ہو رہا ہے...... نہیں ــــ شاید میں غلط کہہ رہا ہوں...... وہ جو کچھ دیکھ رہی ہے...... وہ ایسی بہت ساری باتوں پر ہنس سکتی ہے......"

"دیکھو...... وہ تم سے باتیں کر رہی ہے......!"

پتلے پتلے نازک ہونٹ کھلے تھے...... آنکھوں میں جمی برف پگھلی تھی ــــ برف پگھلنے سے ایک نظر نہ آنے والی کھڑکی سے خوشبو کا قافلہ نکلا تھا۔ قافلے میں فرشتے ہی فرشتے تھے، جو انعمتہ کو گھیرے کھڑے ہو گئے تھے......

"آہ...... خوشبو...... تم محسوس کر رہے ہو؟" تبسم چونک گئی ہے۔

"ہاں......"

"دیکھو تو سہی...... انعمتہ پھر ہنس رہی ہے......"

"انعمتہ، ہنس سکتی ہے...... کیونکہ فرشتے آگئے ہیں۔"

"فرشتے!" تبسم زور سے چونکی۔ انعمتہ کو دیر تک گھورتی رہی۔ پھر بولی...... 'آہ، کھانا...... میری بٹیا کھانا کب سے شروع کرے گی، دودھ پر آخر کب تک رہے گی ــــ؟'

'بٹیا دودھ پر ہی رہے گی ــــ' میں نے نظریں جھکا لیں ــــ کیونکہ میں بٹیا کا سچ جان چکا تھا۔

☆☆

سچی بات یہ ہے اور جیسا کہ میں بتا چکا ہوں وہ پیدا ہوئی تو باہر انسانوں کا جلنا شروع ہو چکا تھا ــــ پہلے بیکری میں بریڈ بنتے تھے بسکٹ، گلچے اور 'پاپے' بنتے تھے ــــ کچھ بیکری والوں نے اسپیشل کیک بنانے بھی شروع کر دیئے تھے۔

مجھے اس سے ناراضگی تھی ــــ مجھے سب کچھ یاد ہے ــــ میں نے اس سے پوچھا تھا ــــ

ــــ یہ کون سا موقع ہے پیدا ہونے کا؟

کیوں؟

— باہر دیکھو۔لوگ جل رہے ہیں..... بیکری جل رہی ہے۔

'اس میں میری پیدائش کا کیا قصور ہے'

— بیکری میں زندہ انسانوں کو ڈال دیا گیا ہے۔

'تو—؟'

— نہیں، مجھے لگتا ہے، تمہیں آنے کے لیے اس موسم کا انتخاب نہیں کرنا چاہیے تھا۔

'پاپا— 'اب اس کی آنکھوں میں ناراضگی تھی— 'میرے آنے سے خوش نہیں ہو؟'

— 'بہت ہوں'

پھر یہ اٹ پٹے سوال— اچھا تم بتاؤ— مجھے کب پیدا ہونا چاہیے تھا—

— جب آگ نہیں لگ رہی ہو— بیکری میں زندہ انسان نہیں بھونے جا رہے ہوں—'

'جھوٹ— وہ ہنس رہی تھی— اب ایسا جھوٹ بھی مت بولو— اب تمہاری دنیا میں کون سا دن ایسا ہے جب آگ نہیں لگتی ہو— انسان نہیں مرتے ہوں—

'مگر اس طرح بیکری میں—'

'ہزاروں مثالیں ہیں— اس سے برے دن بھی آئے تھے۔ اس سے برے دن بھی آئیں گے— سنو—' وہ کھلکھلا رہی تھی— آنے سے پہلے اللہ میاں نے بہت سی تصویریں دکھائی تھیں— پوچھا تھا— کہاں جانا ہے— بس— میں نے یہاں ہاتھ رکھ دیا— تمہاری تصویر پر— صاف بول دیا— یہی پاپا ہیں— فرشتوں نے سمجھایا تھا— مت جاؤ انعمۃ— مت جاؤ— یہیں کھیلو.....'

'پھر—'

'مجھے نہیں دیکھنا تھا— ممی کو..... ساشا کو.....'

'اور جلتی بیکری کو.....' میں نے جواب پورا کیا—

'ہاں— اس میں میرا کیا قصور— مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہاری دنیا میں ہر روز یہی ہوتا ہے.....'

'ہر روز بیکری نہیں جلتی—'

'اب بہانہ مت بناؤ پاپا— تم میرے آنے سے خوش نہیں ہو—'

''خوش تو بہت ہوں بٹیا مگر......''

''بیکری''...... بٹیا ہنس رہی تھی— چلو برتھ ڈے نہیں مناؤں گی۔ ٹھیک۔ تمہیں میرے لئے بیکری سے کیک نہیں منگوانا پڑے گا...... ٹھیک......

''ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ کیونکہ کیک اور بریڈ کے نام پر......''

''چھی...... چھی...... پاپا...... کھانے کے بارے میں ایسا نہیں بولتے— مگر جانتے ہو، آنے سے پہلے میں نے یہ منظر دیکھ لیا تھا۔ میں نہیں جانتی، انصاف کی عمارتوں میں کیا ہوتا ہے۔ مگر میں روئی تھی پاپا۔ ایک لمحہ کو دل، یہاں...... تمہاری اس دنیا میں آنے کے لئے بدل بھی گیا تھا...... سوچتی تھی...... یہاں ایسا ہی ہوتا ہے...... میں تو گھبرا گئی تھی پاپا...... ایک میری دوست بھی تھی...... بس وہ آنے والی تھی...... آنے والی تھی...... آنے والی......''

چلتے چلتے جیسے ٹیپ پھنس گیا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ زور سے چلائی۔ آنکھوں سے رِم جھم آنسو کی برسات ہو رہی تھی۔ وہ کوثر آنٹی کی بٹیا تھی— نرودا پٹیا میں— وہ مجھ سے ڈھیر ساری باتیں کرتی تھی۔ کبھی کبھی فرشتے ہمیں گھنٹوں باتیں کرتے دیکھ کر ڈانٹ بھی دیتے تھے...... چپ رہو۔ دنیا کے طور طریقے ابھی سے مت سیکھو۔ آنسو اُس کے رخسار پر بہنے لگے تھے......

''وہ کوثر انٹی کی بٹیا تھی...... میرے ساتھ ہی آنے والی تھی، مگر وہ— غصے میں تھی۔ تم نے رُلا دیا......''

''چل اب نہیں رُلاؤں گا......''

وہ پھر جیسے یادوں کے غبار میں کھو گئی تھی۔ ''کوثر انٹی کی بٹیا...... کتنی پیاری سی تھی۔ مجھ سے بھی زیادہ پیاری۔ مجھ سے باتیں کرتی تھیں۔ اماں کے کھائے اچار کی باتیں۔ کوکھ میں چھن کر آنے والی، سورج کی کرنوں کی باتیں۔ اپنے حصے کی سانس اور اپنے حصے کی دھوپ کی باتیں— اپنے ابو کی ہتھیلی کا 'سایہ' اُس نے امی کے پیٹ پر دیکھا تھا۔ اُس کو اپنے حصے کا پورا پورا ابو دیکھنا تھا...... وہ مچھلی کی طرح تیرتی تھی۔ لیکن ایک دن......''

انعمتہ کے چہرے پر لرزہ تھا۔ ''سب کچھ میرے سامنے ہوا پاپا...... میرے دیکھتے ہی

دیکھتے وہ اچانک گنگنے ملائم اندھیرے سے نکل کر تیز دھوپ میں پہنچ گئی......''

وہ 'آ جنمی' رہ گئی۔ میرے سامنے ہی— سب کچھ...... میرے سامنے ہی ہوا...... پاپا...... وہ کانچ تھی...... آگ کی آنچ میں پگھل پگھل گئی۔''

انعمۃ رو رہی تھی—

''نہیں، روؤ مت۔''

اس نے آنسو پوچھے...... چلو نہیں روتی...... مگر تم لوگ برے ہو......'

'میں......'

'نہیں، تم نہیں...... میں تو...... ان لوگوں کے بارے میں کہہ رہی تھی جو...... تم ان میں شامل نہیں ہو— ' میں نے راحت کی سانس لی— گوشت کے ننھے سے ٹکڑے کو ہاتھوں میں اٹھایا— سنو انعمۃ— جو ہوا سو ہوا— اب سب کچھ بھول جاؤ— اب ایسا نہیں ہوگا......

'ہوا تو......؟'

'نہیں ہوگا......' میں نے اس پر ہنستے ہوئے مثالوں کی گنتی شروع کی...... جہاں دن ہوتا ہے وہاں...... جہاں دھوپ ہوتی ہے وہاں...... جہاں دکھ ہیں...... وہاں......'

وہ ہنس رہی تھی— پرانی مثالیں ہیں— اب اتنا بھی پرانے مت بنو پاپا— ہاں سنو— غور سے سنو— سچی بات یہ ہے کہ جلتے انسانوں کو دیکھ کر میرا من بدل گیا تھا— پھر کوثر آنٹی کی بٹیا والے حادثے کو لے کر تو میں بالکل ہی پتھر ہو گئی تھی— پھر بھی میں آئی— اس لیے کہ میں اپنے حصے کی دھوپ، اپنے حصے کی ممی اور اپنے حصے کے پاپا کو دیکھنا چاہتی تھی— مگر اتنا یاد رکھو— پھر کچھ گڑبڑ ہوا تو...... میں رہوں گی نہیں...... واپس چلی جاؤں گی۔

پھر جیسے اک دن کی دھوپ پرانی پڑ جاتی تھی—

پھر جیسے ایک دن کا چاند پرانا ہو جاتا تھا...... جیسے ایک رات، ایک ساون...... جیسے ایک موسم...... جیسے...... جیسے ایک لمحہ فوراً ہی دوسرے لمحے میں گم ہو جاتا تھا— جیسے آنے والا پل 'جانے' لگتا تھا— ویسے ہی ندی بہتی رہی۔ گاتی رہی...... نئی لہریں، پرانی لہروں سے ٹکراتی، انہیں پیچھے چھوڑتی آگے بڑھتی رہیں۔

انعمۃ، عمر کے پالنے میں، چھوٹی اور چھوٹی ہوتی رہی— بس کبھی کبھی دل کرتا تو زور سے مسکرا دیتی—

تبسم کے چہرے پر زندگی اور امید کی ایک کرن لہراتی...... 'دیکھو...... وہ پھر سے ہنس رہی ہے......'

'نہیں— ' مجھے احساس تھا— اور شاید اسی لیے میں اپنی نظریں نیچی کر لیتا— 'نہیں وہ جا رہی ہے۔ اور اس نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا ہے— اُسے بریڈ اور کیک پسند نہیں ہیں— بریڈ اور کیک والوں کی اس دنیا میں اسے نہیں رہنا ہے—'

تبسم کی آنکھیں نم ہیں—

میں اپنا چہرہ دوسری طرف گھماتا ہوں— 'سنو، اب اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے— تمہیں یقین کرو— بالکل صاف صاف۔ میری آنکھوں میں جھانک کر— ایک صبح ہماری آنکھیں کھلیں گی اور وہ— فرشتے اور خوشبو کے قافلے کے ساتھ چل پڑے گی...... اسے نہیں رہنا ہے...... وہ نہیں رہے گی...... دیکھو...... وہ کہہ رہی ہے......'

میں انعمتہ پر جھک گیا ہوں۔ وہ مسکرائی ہے۔ میں نے ایسی عجیب وغریب مسکراہٹ آج تک حسین سے چہرے پر بھی، بجی ہوئی نہیں دیکھی۔ وہ اِس دنیا کی مسکراہٹ نہیں تھی۔ اُس کی مسکراہٹ کا ہر لفظ سنا جا سکتا تھا۔

''سنو پپا...... میں آئی...... میں نے دیکھا، مگر میں فاتح نہیں ہو سکی۔ میں فتح حاصل کرنے آئی بھی نہیں تھی۔ بس، اپنے حصّے کے پاپا...... اپنے حصّے کی تمام چیزیں...... میں نے بس دو سالوں میں ہی سمیٹ لی۔ اب میرا یہاں کیا کام پاپا...... آج رات تیز بارش ہو گی اور کل صبح میں واپس 'اللہ گاؤں' چلی جاؤں گی— مگر...... رونا مت۔ یاد کی کوئی بارش میرے نام کر لینا...... بارش کی کسی ایک بوند پر میرا نام لکھ لینا اور......''

☆☆

ٹپ ٹپ...... ٹپ...... ٹپ......

دوسرے دن زور زور سے بارش ہوئی— پھر 'بارش' پرانی پڑ گئی— میں نے ایک قطرے میں اس کی یاد سمیٹ لی اور گنگنی، دھوپ کا انتظار کرنے لگا— اس دن دھوپ نکل آئی تھی—

تبسم آہستہ سے بولی— 'جیمس ابھی بھی جل رہی ہیں...... اور راتیں بھی...... اور......'

'ہاں، سناٹے اور گھپ اندھیرے کے آسیب اب صاف صاف نظر آنے لگے

ہیں—'

'چائے پیوگے؟' وہ اٹھتی ہوئی بولی— 'سنا ہے، بیکری کے ملزم بری ہو گئے ہیں اور وہ آزادانہ گھوم رہے ہیں—'

بارش کا قطرہ میری مٹھیوں میں زور سے' کانپ کر رہ گیا— 'سنو، ساشا کے برتھ ڈے میں اس بار کیک نہیں آئے گا—'

میں آگے بڑھ گیا تھا— تبسم میرا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

میں جیسے کسی درد کے سمندر میں بہہ رہا ہوں۔

ایک کوکھ میں چھٹک گئی

دوسری، باہر آ کر چیخ گئی۔

تیسرا میں ہوں، جو ہزاروں طرح کے خوف اور دہشت کے ساتھ اُس گجراتی ماحول کے سناٹا شورز میں بھٹک رہا ہوں— لیکن میرا ایک سچ اور بھی ہے۔ اُس دن سے روٹی کھائی نہیں جاتی۔ بیکری کسی ڈراؤنی خواب کی طرح لگتی ہے......!

●❖●

فدائین کی ماں

بیٹا لڑائی جھگڑا کر کے گیا تھا......

اسی لئے ماں بیٹے کے لئے فکرمند تھی، ورنہ اور کوئی بات نہیں تھی۔ وقت بھی کیسے پلین کی طرح اُڑ جاتا ہے۔ ماں کو کبھی کبھی بچے پر پیار بھی آتا تھا۔ مگر وہ بہت زیادہ بچے کے بارے میں نہیں سوچتی تھی اور سچ پوچھئے تو اب سوچنے کے لئے رکھا بھی کیا تھا۔ بیٹا جاتے جاتے پانچ ہزار کے نوٹوں کی ایک چھوٹی سی گڈی اس کے ہاتھ پر رکھ گیا تھا۔

''رکھ لے۔''

''کیوں؟''

''بس رکھ لے___''

''لیکن کیوں رکھ لوں؟''

''ماں ہے، نا___!'' بچے کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

ماں نے غور کیا۔ دو ایک برس میں بچے کی شوخی 'کافور' کی طرح اُڑ گئی تھی۔ بچے کے اندر، بچے کا باپ اتر آیا تھا۔

''تمہارے لئے بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔ یہ پیسہ رکھ لے۔''

''لیکن کیوں......کیا کروں گی؟''

''کچھ بھی۔ اپنے لئے کپڑے لے آنا۔'' بیٹا کہتے کہتے ٹھہرا۔ گھر کی دیوار اور چھت کو غور سے دیکھا۔

''اب کی برسات میں دیوار گر سکتی ہے۔ چھت بھی چو رہی ہے۔ پانچ ہزار کافی ہوں گے۔''

''لیکن میں نہیں رکھوں گی۔''

''کیوں؟''

''بڑی رقم ہے۔'' ماں بچے کو پرکھ رہی تھی۔ ''کہاں سے لایا؟''

''کام ملا ہے۔ بتایا تھا نا'' ''لیکن اتنی بڑی رقم......؟''

''چوری نہیں کی ہے۔''

''جانتی ہوں۔''

''جانتی ہے تو رکھتی کیوں نہیں۔''

ماں سلائی مشین پر بیٹھ کر پیر چلانے لگی۔ ہنسی مذاق کرنے کی خواہش ہوئی۔ ''سن! جانگر سلامت ہے۔ اتنا پیسہ اپنی بیوی کو دینا۔ مجھ کو مت دے۔''

بیٹا روانی میں بول گیا...... ''بیوی نہیں آئے گی میری۔ رکھنا ہے تو رکھ لے۔ نہیں تو خیرات کردینا'' اس کے بعد بیٹا ٹھہرا نہیں، دروازے سے تیزی سے نکل گیا۔

ماں کی آنکھوں نے بہت دور تک بچے کا پیچھا کیا۔ چہرہ سیاہی مائل، باپ کی طرح نکلتا ہوا قد، تقریباً چھ فٹ، اجلی قمیص، کرتا، سر پر ٹوپی۔ ماں نے انگلیوں پر حساب لگایا...... ہاں رے، پورے اکیس کا ہوگیا۔ رمضان میں تو بائیسواں چڑھ جائے گا۔ ماں کو غصہ تھا۔ کتنی بار سمجھایا۔ شادی کرکے کیا کروں گا۔ کہاں رکھوں گا؟ ابا تم کو رکھ پائے کیا؟ یہ تمہاری عمر تھی، مشین چلانے کی......''

''سب قسمت کی بات۔'' خوشی سے کون مشین چلاتا ہے لیکن پیٹ کی دوزخ نے کب کس کو بخشا ہے۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ عمرو میاں جب تک زندہ رہے، کوئی کمی نہیں رہنے دی۔ مزدور آدمی تھے — گھر بلڈنگ بنوار ہے ہیں۔ خوف کا نام ونشان نہیں۔ لمبے تگڑے۔ تب پرانی چھتہ حویلی ٹوٹ رہی تھی۔ سنا تھا، ہوٹل بن رہا ہے۔ خستہ عمارت۔ عمرو میاں صبح سات بجے ہی نکل جاتے۔ کنٹریکٹر اسی ٹیم بلواتا تھا۔ رمضان کا ستائیسواں روزہ تھا۔ بھوکے پیاسے عمرو میاں۔ وقت ہوگا، کوئی چار کے آس پاس کا۔ وہ عمرو میاں کے لئے افطار تیار کرنے میں لگی تھی۔ تبھی ان کے ساتھی بھاگے ہوئے آئے۔

''بھابھی! غضب ہوگیا— '' چھن...... جیسے گرم گرم تیل میں پھلکیاں تلی جارہی ہوں۔

''ہائے اللہ۔'' کیسی بے پردگی۔ عمرو میاں کے دوست سامنے کھڑے تھے۔

''چھتہ حویلی کی دیوار گر گئی، عمرو میاں پر— تکفین کے لئے ہم لوگ گھر لارہے ہیں۔''

ماں نے آنسو پونچھے۔ الطاف بار بار باپ کے جنازے کو چھوتا تھا۔ چہرے سے کپڑا ہٹاتا تھا— 'ابا جا گو کھانا کھالو— لوگ رو رہے تھے۔ ماں بے ہوش پڑی تھی۔ شام، مغرب بعد لالٹین جل گئی۔ پہلی بار اس نے بیٹے کو کافی قریب سے زوروں سے لپٹایا تھا۔ 'بے سدھ ہوگئی' بیٹے کا جسم کڑا تھا۔ عمر تھی دس سال۔ ماں نے آنسو پونچھے۔ چلو بیٹا تو ہے۔ عمر کی فاختہ کے اڑنے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دس سال گزر گئے۔ الطاف اور گھر کا خرچ پورا کرنے کے لئے گھر میں، پیر سے چلنے والی سلائی مشین بھی آگئی اور پھر ادھر ادھر سے محلے والوں کے کپڑے بھی آنے لگے۔ پرب تہوار کے کپڑے۔ ماں عمرو میاں کی بیوہ تھیں اور الطاف...... ایک نمبر کا کھلنڈرا۔ ماں کو الطاف سے کوئی امید نہیں تھی۔

مگر ایک دم، اچانک۔ پچھلے دو برسوں سے۔ ماں کو احساس ہوا تھا۔ الطاف میں ایک سنجیدہ چہرے والا آدمی آگیا تھا۔

پانچ ہزار کی گڈی اس نے پرانے صندوق میں رکھے کپڑوں کے درمیان چھپادی۔ یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے۔

دو دن، دو رات ماں، بیٹے کا انتظار کرتی رہی۔ بیٹا نہیں آیا۔ بیٹا بڑا ہونے کے نام پر ایسا پہلے بھی کیا کرتا تھا۔ ماں کے لئے انتظار معنی نہیں رکھتا تھا۔

قریب ہی جھبرو میاں درزی والے کا گھر ہے۔ جھبرو، عمرو میاں کے دوست تھے لیکن، کیسی دوستی، جھبرو میاں کی تو تین منزلہ عمارت ہے۔ دو لڑکے، تین لڑکیاں۔ بڑا درزی ہے۔ خوب چلتی ہے۔ کہاں عمرو میاں۔ جب تب بچے آجاتے ہیں۔ چلو نا اماں۔

''کیا ہے، رے......'' ''ٹی وی دیکھنے۔'' ماں کو ٹی وی دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ ٹی وی جھبرو میاں کے ڈرائنگ روم میں تھا۔ سب ٹی وی کے قریب بیٹھ جاتے۔ دونوں لڑکے، تینوں لڑکیاں بھی۔ ہنگامے ہوتے۔ تالیاں پیٹی جاتیں۔ کمینٹس چلتے رہتے اور...... ماں نہال ہو جاتی۔

اس دن...... دوپہر، کوئی دو بجا ہوگا۔ چھوٹی بیٹی عطیہ بھاگ کر آئی...... ''چلو نا، اماں۔''

''کیا ہے۔؟''

ٹی وی دیکھنے۔

''کوئی پروگرام آرہا ہے کیا؟''

عطیہ نے پوچھا...... ''الطاف بھیا کہاں ہیں؟''

''تین دن سے گھر نہیں آیا۔''

''چلو اماں۔''

''چلو دروازہ بند کرتی ہوں۔''

ماں نے دروازہ اڈگایا— عطیہ کے ساتھ تیز تیز چلتی ہوئی جھبرو میاں کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔ سلام کلام کے بعد، صوفے پر جھبرو میاں کی بیوی کے پاس ہی بیٹھ گئی مگر یہ کیا...... ٹی وی پر پولس کے سپاہی۔ دنادن گولیاں چل رہی ہیں...... ''یہ کیا ہورہا ہے؟''

''مندر پر آتنک وادیوں نے حملہ کیا ہے، یہ جھبرو میاں کا چھوٹا والا بیٹا تھا...... ''اماں! یہ سب بھی دیکھا کرو۔''

''آتنک وادی نہیں رے۔'' بڑے والے نے شان سے کہا...... ''گجرات قتل عام کا جواب ہے۔ فدائین حملہ......''

''فدا...... فدائین......'' اماں کانپ گئیں......

ٹی وی اسکرین پر پولس کے سپاہی بڑے بڑے بم گولے لے جاتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''باپ رے باپ۔ یہ کیا کریں گے......'' کچھ نہیں اماں۔ یہ سب فدائین کو گھیرنے کی تیار ہے......

''فدا...... فدائین......'' اماں کانپ گئیں...... ''یہ فدائین کون ہیں؟ جھبرو میاں نے قہقہہ لگایا...... ''ارے!'' جو مذہب پر فدا ہے وہ فدائین۔ جو اللہ میاں پر، اسلام پر فدا ہے۔ دیکھو تو، کافروں کے سینے پر کیسے سانپ لوٹ گیا۔''

ان کی اہلیہ زور سے ہنسی......

''فدا...... فدائین۔'' ماں ڈر رہی تھی۔

بچوں نے ہنگامہ کیا...... ''بولو مت اماں۔ ٹی وی دیکھو۔ دیکھو، کیا خبریں آ رہی ہیں۔''

ٹی وی سے خبریں چیخ رہی تھیں...... ''صبح، سے 7 بجے مندر میں ہونے والی 'آرتی' کے سمے اچانک کچھ آتنک وادی گھس گئے۔ اندھا دھند گولیاں چلنے لگیں۔ آتنک وادیوں نے 50 لوگوں کو گولیوں سے بھون ڈالا۔ لگ بھگ 100 لوگ اب بھی گھائل ہیں۔ مارے گئے لوگوں میں مہیلائیں اور بچے بھی ہیں۔ آتنک وادی اب بھی مندر میں گھسے ہوئے ہیں۔ ''سرکچھابلوں'' نے آتنک وادیوں کو باہر نکالنے کے لئے چاروں اور سے مندر پریسر کو گھیر لیا ہے۔ دلّی سے پہنچے کمانڈوز نے سارے 'مندر پریسر' کو اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔''

''کیا کرلیں گے......'' بڑا چیخا...... ''گجرات میں مار کے دیکھ لیا نا......'' ''ارے چپ......'' جھبرو میاں نے ڈانٹا۔

جھبرو میاں کی بیوی بولیں......لیکن گجرات میں ان لوگوں نے اچھا نہیں کیا۔ مسلمانوں کی جان نہیں ہوتی کیا؟''

''تو کیا، ہندوؤں کی نہیں ہوتی۔'' جھبرو میاں صفائی دیتے ہوئے پلٹے......''ارے یہ الطاف کہاں ہے؟''

''پتہ نہیں!'' ''پتہ نہیں؟'' ''تین دن سے غائب ہے۔''

☆☆

ٹی وی اسکرین پر دنادن گولیاں چل رہی تھیں۔ اچانک مندر 'پریسر' سے بھاگتے آتنک وادی پر کیمرہ چارج ہوا۔ نیوز ریڈر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ''آتنک وادی مین گیٹ سے گھسے تھے۔ دونوں آتنک وادیوں کی عمر 20 سے 25 برس کے درمیان ہے۔''

جھبرو میاں فیملی کی سانسیں آدھی نیچے، آدھی اوپر۔ یہ کسی فلم سے بھی زیادہ رونگٹے کھڑے کرنے والا منظر تھا۔ گولیوں کے بیچ ایک آتنک وادی گرا تھا۔ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ خبر میں بتایا جا رہا تھا......ایک آتنک وادی ڈھیر ہو چکا ہے۔ آپ اُس کی لاش دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے آتنک وادی کو سرکچھابل کے لوگ تلاش کر رہے ہیں۔ مندر پریسر میں پھنسے لوگوں کو سرکچھادستے نے اپنے قابو میں کیا ہوا ہے۔ یہ آتنک وادیوں کے لئے ''وِدڈرال موڈ'' ہے۔ یعنی اب وہ باہر آنے یا مارے جانے کے انتظار میں ہیں۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے......'' ماں کی آواز

لڑکھڑا رہی تھی۔ ''وہ کون گر گیا ہے......؟''

''فدائین۔ دیکھو میں سمجھاتا ہوں۔'' بڑا ماں کے پاس آ گیا...... فدائین بننا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ یہ جانتے ہیں۔ مرنا ہے، تو مرنا ہے، لیکن مرنا مذہب کے لئے جہاد کے لئے — آپ بس، اسلام کو بدنام کئے چلے جا رہے ہو۔ گجرات میں کیا ہوا اماں۔ سیاست تھی، نا، بس، جھوٹی سیاست کے لئے قتل کرایا گیا ہزاروں مسلمانوں کا...... میں تو کہتا ہوں......' اس درمیان چھوٹا والا اُٹھ کر باہر گیا۔ دوسرے ہی لمحہ دوڑ کر اندر آ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائی اُڑ رہی تھی۔

''پتہ نہیں کیا بات ہے۔ محلے میں پولس کی گاڑیاں راؤنڈ کر رہی ہیں۔ فوجی گاڑیاں ہیں۔''

جھبرو میاں بولے...... ''آخر مندر پر حملہ ہوا ہے۔ میں نے سنتے ہی دکان پر تالا لگوا دیا۔ بھائی زمانہ اچھا نہیں۔''

بیچ میں چائے کی پیالیاں بھی چلیں۔ تبصرے ہوتے رہے۔ لیکن ماں کی آنکھیں اسکرین کی 'لاش' پر مرکوز تھیں۔ ایسے بھی کوئی مرتا ہے کیا۔ پتہ نہیں کس کا بیٹا ہے؟

این ایس جی کمانڈوز نے دونوں آتنک وادیوں کو مار گرایا تھا۔ اسکرین پر 'آپریشن وجے' کی جھلکیاں دکھائی جا رہی تھیں۔ اینکر بتا رہا تھا...... ابھی تک کسی گروپ نے مندر پریسر پر فدائین حملے کی ذمے داری نہیں قبول کی ہے۔ آتنک وادیوں کے پاس سے اردو میں لکھا گیا ایک پرزہ برآمد ہوا ہے......''

''میں جا رہا ہوں۔ کھانا بنانا ہے۔'' ''تم نے کھانا کھایا اماں —؟''

یہ بڑا تھا۔

جھبرو میاں بولے...... 'بیگم عمرو بھائی کی بیوہ کے لئے کھانا لگا دو۔'

'نا جی۔ جی اچھا نہیں ہے۔'

''یہ سب دیکھ کے جی کس کا اچھا ہوگا اماں، لیکن اب تم کھا کر جاؤ گی'' ۔ یہ عطیہ تھی......

ٹی وی چلتا چھوڑ دیا گیا تھا۔ اماں کھانے میں لگ گئیں۔ گھنٹے دو گھنٹے اور گزر گئے، شام ہو گئی، لیکن کرنا کیا تھا۔ یہاں اماں کا دل بھی لگتا تھا۔ جھبرو میاں کا سارا گھران پر جان دیتا تھا۔ تب تک، چھوٹا والا گھبرایا ہوا دوبارہ اندر داخل ہوا۔

'کچھ گڑ بڑ ہے ابا...... باہر کافی بھیڑ لگی ہے۔'

'اچھا کئی گاڑیاں ہیں۔ پورے محلے کو گھیر لیا گیا ہے۔'

'لیکن کیوں کمبخت؟'

'کچھ لوگ اماں کا......'

اماں'......جھبرو میاں اُچھلے۔

'سمجھ میں نہیں آتا لیکن جو پتہ پوچھ رہے تھے، وہ اماں کا ہے۔'

'کیوں......؟'

محلے میں واویلا مچا تھا۔ کئی گاڑیاں تھیں، محلّہ دیکھتے ہی دیکھتے پولیس چھاؤنی میں تبدیل ہو گیا۔ کسی نے بتایا۔ پورے محلے کی تلاشی ہوگی۔ اماں جھبرو میاں کے ساتھ باہر آئیں۔ انسپکٹر، ماں کے مکان کے پاس تحقیقات کر رہا تھا۔ اماں تیزی سے لپکیں......

'کیا ہے—؟'

'الطاف کون ہے۔'

'جھبرو میاں کا سر گھوم گیا۔ ان کے بچے بھی آگے بڑھے۔ 'کیا بات ہے انسپکٹر صاحب؟'

'مندر پریسر پر حملہ ہوا ہے۔ دیکھا؟'

'ہاں ٹی وی پر سب کچھ دیکھا۔'

'الطاف کس کا بیٹا ہے؟'

جھبرو میاں نے اشارہ کیا۔ اماں کا چہرہ سُن......

'کمانڈوز نے دونوں آتنک وادیوں کو مار گرایا۔ ایک اس کا بیٹا ہے، الطاف۔ پوچھ تاچھ ہوگی۔ تلاشی ہوگی۔ آپ لوگ یہی کرتے ہیں۔ فدائین بناتے ہیں۔' انسپکٹر گالیاں دے رہا تھا۔' آپ کو تھانے چلنا ہوگا۔'

اماں کا سر گھوم گیا۔ ٹی وی اسکرین کی تصویر آنکھوں کے آگے دوڑ گئی— لیکن اسی لمحہ ماں نے اپنے آپ کو سخت کر لیا۔

جھبرو میاں اور بچے پیچھے ہٹ گئے تھے۔

'چلوں گی......' اماں کی آواز شانت تھی۔

انسپکٹر نے تلاشی کا اشارہ کیا۔ اماں سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں۔ کمانڈوز واپس آ گئے۔

اماں نے ضبط نفس رکھتے ہوئے پوچھا......

'الطاف سے مل سکتی ہوں؟'

'نہیں!'

'پوسٹ مارٹم......؟'

'اجازت نہیں ہے۔ لاش یہاں لائی بھی نہیں جائے گی وہیں رہے گی۔ ابھی 'ڈی بریفنگ' چلے گی۔ جانے کیا کیا ہوگا۔'

'لیکن مجھے بیٹے سے ملنا ہے۔'

'کیوں' انسپکٹر غصے سے بولا...... 'اماں فدائین کو زندہ کرو گی کیا؟'

'نہیں۔ لیکن میں ملنا چاہتی ہوں۔'

'لیکن کیوں؟'

دیر سے ضبط کئے گئے آنسو اماں کی آنکھوں سے چھلک گئے......

''تھوکنا چاہتی ہوں میں، الطاف پر۔ تھوکنا چاہتی ہوں۔ سب کے سامنے۔ آپ کے، ٹی وی کے، ملک کے، سب کو گواہ بنا کر۔ ارے جو میرا نہیں ہوا۔ ملک کا نہیں ہوا۔ وہ اللہ اور رسول کا کیا ہوگا۔''

اماں نے بیچ...... سے دوسری طرف منہ کر کے تھوک دیا تھا۔ جیسے دیر سے چل رہی کشمکش سے اسے نجات مل گئی ہو۔ اب وہ پُر سکون تھی۔

'چلئے۔ جہاں لے چلنا ہو۔ میں تیار ہوں۔'

مودی نہیں ہوں میں

یہ انہیں دنوں کا واقعہ ہے، جب 'گودھرا' کی آگ نے یکا یک 'بابری مسجد' کے دنوں کی یاد تازہ کردی تھی۔

اذان ہو چکی تھی۔ مرغ نے 'دربے' سے منہ نکال کر دوایک دفعہ 'بانگ' کا سر بلند کیا۔ پھر چپی اوڑھ لی۔

مرتضٰی وضو سے فارغ ہوئے تو بٹیا سامنے تھی۔

آنکھوں نے اشارے میں فرمان جاری کردیا___ 'کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔'

بٹیا اُداس سی ان کی طرف دیکھتی رہی۔ کچھ بولی نہیں۔

'بازو' میں پنڈت جی کا گھر تھا۔ پنڈت جی گھڑی نہیں باندھتے تھے۔ وقت آنکھوں کی پلکوں میں رکھا ہوتا تھا۔ آنکھیں بند کیں، اور پتہ لگا لیا۔ پانچ بج کر دس منٹ۔۔ نہ ایک منٹ کم، نہ ایک منٹ زیادہ۔ یہ سب تو وقت کے لمبے کارخانے کا تجربہ ہے۔ نگاہ اٹھائی، تو آسمان پر اندھیری بدلیاں جمع ہو کر کسی انجان 'دیوتا' میں بدل گئی تھیں۔

جھکے، نمستے کا انداز اختیار کیا۔ غسل سے فارغ ہو گئے تھے۔ مگر کچھ چھوٹ رہا تھا۔ گذشتہ چند سالوں سے چل رہے اصولوں میں تبدیلی آ گئی تھی۔

رام نام جپتے رہے، مگر جیسے آج پوجا کا 'ذائقہ' ہی چلا گیا تھا۔ ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ بادلوں کا کاررواں جیسے کسی لاش کو لئے جا رہا تھا۔ وہ ایک دم سے سہم گئے۔

اچانک جیسے مندر کی گھنٹیاں ٹن ٹنا اُٹھیں۔

وہی، پانی کی لہروں جیسی آواز ____

'میں گن رہی تھی۔ پورے 273 بار......'

'کیا گن رہی تھی ____ ؟'

معصوم ہونٹ مسکرائے ____ 'وہی رام جی کا نام......'

'اچھا!'

'یہ ہر دفعہ اتنی ہی گنتی کیوں ہوتی ہے۔'

'کیونکہ تمہاری گنتی کمزور ہے۔'

'میری گنتی کمزور کیوں ہوگی۔ مجھے تو بیس تک کے پہاڑے بھی یاد ہیں۔'

'میں کیا جانوں۔ روز ہی درختوں کے اردگرد رام نام کا ورد کرتے کرتے اچانک پاؤں اپنے وقت پر رُک جاتے ہیں۔'

'نہیں، تم دل ہی دل گنتی گنتے ہو گے۔'

'ارے نہیں رے۔'

'نہیں، کیسے نہیں۔'

پھر بٹیا کے ساتھ پنڈت جی کی جنگ شروع ہو جاتی۔ کبھی کبھی اس 'جنگ' میں بھگوان اور اللہ دونوں شامل ہو جاتے۔

بٹیا مسکرا کر پوچھتی ____ 'تم ہندو کیوں ہو؟'

پنڈت جی غصہ ہو کر پوچھتے ____ 'مرتضیٰ مسلمان کیوں ہے؟'

بٹیا مسکرا کر پوچھتی ____ 'تم لوگ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہونا......؟'

'پنڈت جی تاؤ کھا جاتے ____ 'ہاں، جیسے مرتضیٰ ہندوؤں سے کرتا ہے۔'

بٹیا مسکراتی تو پنڈت جی بھی مسکرا اُٹھتے ____ 'سب بھگوان کا کرشمہ ہے بٹیا۔ کسی کو وہاں پیدا کیا، کسی کو یہاں۔'

بٹیا پھر شرارت سے ہنسی ____ 'مجھے تو اچھے گھر پیدا کیا، مسلمانوں کے گھر۔ تمہیں تو ڈھنگ کا کپڑا بھی پہننا نہیں آتا۔'

پنڈت جی غصے میں پیچھے دوڑتے ____ 'تیرے باپ کو آتا ہے؟ مرتضیٰ کو آتا ہے؟ ٹھہر! ابھی بتاتا ہوں......'

وہ یکبارگی تیزی سے لپکے۔ لیکن کہاں، کون تھا؟ صبح نور کا تڑکا تھا۔ آسمان پر چھٹتی بدلیاں تھیں۔ باہر آئے تو مرتضیٰ کھڑے تھے۔ ہمیشہ کی طرح مذاق کے انداز میں نہیں، پُرسکون لہروں کی طرح۔

'چلو!'

کوئی کچھ نہیں بولا۔ صبح ابھی پوری طرح جھلملائی نہیں تھی۔ سڑک سنسان تھی۔ وہ کچھ دور تک ساتھ چلے۔ پنڈت جی نے کچھ بولنے کی حالت میں کئی بار مرتضیٰ کا چہرہ دیکھا۔ پھر رُک گئے۔ کیا بولیں؟

یہی حال مرتضیٰ کا تھا۔

آگے سڑک دائیں طرف مڑ گئی تھی۔ پھر اگلا موڑ 'رمنہ میدان' تھا۔ یہاں ٹھہرتے، بنچ پر بیٹھتے۔ دو قدم آگے تالاب تھا۔ وہاں کچھ وقت گزارتے، گفت وشنید ہوتی۔ پھر واپس چلے آتے۔

رمنہ میدان آ گیا تھا۔

پنڈت جی نے خاموشی کا خاتمہ کیا۔

'بٹیا نہیں آئی!'

'ہاں'۔

'کیوں'۔

'میں نے منع کر دیا تھا'

'کیوں منع کر دیا تھا......؟'

'بس، منع کر دیا تھا'

کوئی دلیل نہیں۔ پنڈت جی نے لمحے بھر کو، جذباتی ہو کر، مرتضیٰ کو دیکھا۔ پھر رُک گئے۔ یہاں ایک غیر جذباتی سپاٹ چہرہ تھا۔ ایک دم سپاٹ۔ کچھ بھی لکھا ہوا نہیں۔ کیا کہتے۔ یہی حال مرتضیٰ کا تھا۔ بٹیا کو منع کیوں کیا؟ کیا ضرورت تھی۔ بغیر ماں کی بچی، ذرا دیر کو بہل جاتی تھی۔

میدان میں لوگوں کا آنا جانا شروع ہو گیا تھا۔ بینچ خالی پڑی تھی لیکن دونوں میں سے کوئی بیٹھا نہیں۔ وہ تھوڑی دور تک چلے۔ تالاب کے قریب رُک گئے۔ کنارے بیٹھ گئے۔

'پہلے یہاں کا پانی کتنا صاف تھا!'

'ہاں۔'
'کم بختوں نے.....' پنڈت جی کہتے کہتے ٹھہر گئے۔
'گالی کیوں دیتے ہو۔ گنگا، جمنا، سرسوتی اور وہ کاویری.....'
مولوی نے پانی میں ایک کنکری پھینکی۔

'کا.....وے.....ری.....' پنڈت جی نے دہرایا___ 'پانی میں آلودگی کافی بڑھ گئی ہے!'

'ہاں'
'پہلے اتنی نہیں تھی۔'
'ہاں۔'
'اب کافی بڑھ گئی ہے۔' پنڈت جی اس بار خود کو روک نہیں سکے___ 'بٹیا کیوں نہیں آئی؟'

مرتضیٰ نے ایک لمحہ کو اپنی آنکھیں پنڈت جی کی آنکھوں میں 'پیوست' کر دیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں، 'کیوں نہیں بھیجی، اس کا فسانہ پڑھ لو پنڈت۔'

پنڈت جی آنکھوں کے اس حملے سے ایک دم گھبرا گئے۔ بات ہی کتنی سی تھی۔ گودھرا کی آگ یہاں بھی آ گئی تھی۔ تھوڑے سے لوگ تھے۔ مٹھی بھر۔ شہر بند کرایا۔ تب مرتضیٰ نماز پڑھ کر مسجد سے نکلے تھے۔ 'عصر' کی نماز پڑھ کر۔ ایک بدمعاش نے مرتضیٰ کی داڑھی پکڑ لی۔ کسی نے دو ایک ہاتھ بھی جڑ دیا۔

وہ مندر میں تھے۔ بس اتنی ہی خبر تھی۔ اتنا ہی ردِ عمل۔ 'ہر ایک عمل کا اس کے برابر اور برعکس ایک ردِ عمل ہوتا ہے۔' بس۔ اتنا ہی ردِ عمل لیکن ردِ عمل کی زد میں آئے تھے، مرتضیٰ۔ مرتضیٰ کی جگہ کوئی بھی آ سکتا تھا۔ وہ تو محلے والوں نے بیچ بچاؤ کیا۔ پولس آئی۔ محلے میں 'چوکی' بیٹھ گئی۔

لیکن___ پنڈت جی کے دماغ میں آندھیاں چلتی رہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ وہ کیا منہ دکھائیں گے بٹیا کو۔ کافی دیر تک مندر میں پڑے رہے۔ پوچھنے والا ہی کون ہے۔ آگے، نہ پیچھے۔ ہمت نہ ہوئی بٹیا کو منہ دکھانے کی۔ رات کے نو بجے ذرا سی ہمت جٹائی۔ مرتضیٰ کے 'چوکھٹ' کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ دروازہ کھلا۔ لاش جیسا سرد چہرہ۔ قریب ہی چٹائی پر بٹیا بیٹھی تھی۔

پژمردہ چہرہ۔

پنڈت جی آگے بڑھے۔ وہیں چٹائی پر بیٹھ گئے۔ مرتضیٰ دوبارہ لیٹ گئے۔

پنڈت جی کافی دیر بٹیا سے بات کرنے کی ہمت جٹاتے رہے۔ ننھی ننھی آنکھوں میں آنسو بھی تو نہیں تھے۔ کمبخت اِسی بہانے باتیں کرنے کو دو الفاظ مل جاتے۔

بدن بے حس ہو رہا تھا...... بیٹھا نہیں جا رہا تھا۔

'کچھ بولو گی نہیں۔'

بٹیا چپ تھی۔

'میری کیا غلطی ہے؟'

بٹیا اس بار بھی چپ تھی۔

'چل۔ میں ہی مجرم۔ میں ہندو ہوں۔ برا ہوں۔ اگلی بار مسلمانوں میں جنم لوں گا......'

جذبات بادلوں کی طرح پھر گھر گھر آئے تھے۔ رکے نہیں پنڈت جی۔ واپس آ گئے۔

تالاب میں ایک کے بعد ایک کنکریاں پھینکنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کافی دیر بعد مرتضیٰ بولے ___ کافی سمجھایا۔ کل ساری رات صدمہ جیسی حالت رہی۔ رات میں تیز بخار بھی تھا۔

'پھر......' پنڈت جی چیخے ___ 'بلایا کیوں نہیں؟'

'نہیں بلایا۔ بٹیا ڈری تھی۔'

'کس سے ڈری تھی؟'

مرتضیٰ چپ تھے۔

پنڈت جی نے ایک موٹا سا پتھر پانی کی طرف اُچھال دیا تھا۔

'چلو۔ بٹیا سے ملنا ہے۔'

آناً فاناً گھر تک کے فاصلے مٹ گئے۔ پنڈت جی بے حد غصے میں تھے۔ بٹیا کی پیشانی چھو کر دیکھا۔ ایک ہاتھ مارا۔

'بول میری کیا غلطی ہے؟'

بٹیا چپ۔ ایک ٹک پنڈت جی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

'بخار ہے۔ مجھے بلایا کیوں نہیں؟' لیپ لگا دیتا۔ مولوی کی پھونک اثر کھو چکی ہے۔ شلوک پڑھ کر تجھے پھونکتا۔ پھر دیکھتی۔'

بٹیا کی آنکھوں میں اب بھی کوئی چمک نہیں ہے۔

'بولے گی نہیں...... نہیں بولے گی___ !نہیں بولے گی تو یہ شہر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میرا جرم تو بتا دے بٹیا......'

اس بار پنڈت جی رونے رونے کو ہو گئے۔ ایک دم سے چیخ پڑے___ 'سن ہندو ہوں۔ مودی نہیں ہوں میں'۔

بٹیا اور مرتضٰی، حیران سے، ان کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔

دوسرے ہی لمحہ بٹیا پنڈت جی کے گلے سے لگ کر زور زور سے رو پڑی تھی!

●❖●

مشرف عالم ذوقی

نام : مشرف عالم

قلمی نام : مشرف عالم ذوقی

پیدائش : ۲۴؍مارچ ۱۹۶۲ء

وطن : آرہ (بہار)

والد کا نام : مشکور عالم بصیری

والدہ کا نام : سکینہ خاتون

شریکِ حیات : تبسم فاطمہ

اولاد : عکاشہ عالم

تصانیف

ناول:

۱۔	عقاب کی آنکھیں (پہلا ناول) ۱۹۷۹ء		(زیرِ طبع)
۲۔	نیلام گھر	تخلیق کار پبلشرز	(اردو)
	نیلام گھر	نمن پرکاشن	(ہندی)
۳۔	شہر چپ ہے	تخلیق کار پبلشرز	(اردو)
	شہر چپ ہے	بھاؤنا پرکاشن	(ہندی)

۴۔	ذبح	تخلیق کار پبلشرز	(اردو)
	ذبح	بھاؤنا پرکاشن	(ہندی)
۵۔	مسلمان	(زیرِ طبع)	(اردو)
	مسلمان	اندر پرستھ پرکاشن	(ہندی)
۶۔	بیان	تخلیق کار پبلشرز	(اردو)
	بیان	شاشا پبلی کیشن	(ہندی)
	بیان	نیشنل پبلشنگ ہاؤس	(ہندی)
۷۔	پوکے مان کی دنیا	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	(اردو)
	پوکے مان کی دنیا	شلپائن	(ہندی)
۸۔	پروفیسر ایس کی عجیب داستان	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	(اردو)
	پروفیسر ایس کی عجیب داستان	سامیتک پرکاشن	(ہندی)
	(ایک چاندنی رات ہوا کرتی تھی) ہندی		
۹۔	سب سازندے	(زیرِ طبع)	
۱۰۔	اردو	(زیرِ طبع)	
۱۱۔	سرحدی جناح	(زیرِ طبع)	

افسانوں کا مجموعہ (اردو)

۱۔	بھوکا ایتھوپیا	تخلیق کار پبلشرز
۲۔	منڈی	//
۳۔	غلام بخش	//
۴۔	صدی کو الوداع کہتے ہوئے	شاشا پبلی کیشنز
۵۔	لینڈ اسکیپ کے گھوڑے	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس

ویب سائٹ پر

۶۔ ذوقی کے منتخب افسانے۔ تین حصے

(www.oneurdu.com پر ڈاؤن لوڈ کیا جا سکتا ہے)

(ہندی)

۱۔	غلام بخش	جن وانی پرکاشن
۲۔	فرشتے بھی مرتے ہیں	جن وانی پرکاشن
۳۔	فزکس، کیمسٹری، الجبرا	وانی پرکاشن
۴۔	بازار کی ایک رات	(ان۔ پی۔ اچ)
۵۔	مت روسا لگ رام	(ان۔ پی۔ اچ)
۶۔	فرج میں عورت	گیان پیٹھ
۷۔	امام بخاری کا نیپکن	پینگوئن بکس
۸۔	لیبارٹری	کانفلوئمنس انٹرنیشنل
۹۔	ذوقی کی شریشٹھ کہانیاں	(ان پی اچ)
۱۰۔	ذوقی کی متنوع کہانیاں	نمن پرکاشن
۱۱۔	شاہی گلدان	ارو پرکاشن
۱۲۔	ذوقی کی شریشٹھ کہانیاں	آلیکھ
۱۳۔	بے حد نفرت کے دنوں میں	زیر طبع
۱۴۔	سارا دن سانجھ (بزرگوں کی کہانیاں)	زیر طبع
۱۶۔	شاہکار کہانیاں	

تالیف

سرخ بستی (دو حصے)	جن وانی
وبھاجن کی کہانیاں	وانی پرکاشن
منٹو پر آٹھ کتابیں	وانی پرکاشن
عصمت کی منتخب کہانیاں	وانی
بیدی کی منتخب کہانیاں	وانی
جوگندر پال کی منتخب کہانیاں	وانی
احمد ندیم قاسمی کی منتخب کہانیاں	وانی
مسلم باغی عورتوں کی کتھا	راجکمل
احمد فراز کی منتخب شاعری	وانی
ہنس: مسلمان نمبر	(اصغر وجاہت کے ساتھ معاونت)
اُداس نسلیں	جن وانی

تنقید

جدید افسانہ ۱۹۷۰ کے بعد	(ان۔بی۔ٹی)	اردو
اردو ساہتیہ: سمواد کے سات رنگ	جن وانی	
اپنا آنگن	بھاؤنا پرکاشن	
اردو جگت	بھاؤنا پرکاشن	
میں، اردو اور مسلمان	(زیرِ طبع)	ہندی

بچوں کا ادب

کنگن | ان بی ٹی |
--- | --- | ---

ڈرامے

گڈبائے ۔ راجیتی	شاشا پبلی کیشن	
اک سڑک ایودھیا تک	جن وانی پبلی کیشنز	
چار ڈرامے	(زیر طبع)	اردو

سیریئل

- ۱۰۰ سے زیادہ ڈکومنٹری
- مسلمان، رات چور اور چاند جیسے ناولوں پر سیریئل
- ۱۹۸۸ سے مسلسل دوردرشن اور منسٹری کے لیے مسلسل
وگرام بنانے کا سلسلہ جاری۔
- اردو شاعری، اردو صحافت پر پروگرام
- شخصیات پر مختلف پروگرام — قرۃ العین حیدر پر ڈوکونٹری

مشرف عالم ذوقی

کی

نئی کتابیں

- لے سانس بھی آہستہ (ناول)
- آتشِ رفتہ کا سراغ (ناول)
- سرحدی جناح (ناول)
- مسلمان (ناول)
- آبِ روانِ کبیر (تنقیدی مضامین)
- ٹیلی اسکرپٹ (ماس کام کے طلبا کے لیے)
- لیبارٹری: سلگتے ہوئے گجرات کی کہانیاں

ناشر

ARSHIA PUBLICATIONS

A-170, Ground Floor-3, Surya Apartment,

Dilshad Colony, Delhi - 110095 (INDIA)

Mob: (0) 9899706640, 9971775969

Email: arshiapublicationspvt@gmail.com

Ek Anjane Khauf Ki Rehearsal

Musharraf Alam Zauqui

arshia publications arshiapublicationspvt@gmail.com

ISBN 978-93-81029-38-1

9 789381 029381